ترقی پسند ادب کا ترجمان

حیدرآباد دکن

گجر

۳، ۴

ترتیب دینے والے:-

نجم الثاقب شحنہ

سری نواس لاہوٹی

حسینی شاہد

زرِ سالانہ:-	دس روپے	ششماہی:	چھ روپے
رجسٹری فیس کے ساتھ:-	بارہ روپے	رجسٹری فیس کے ساتھ:	سات روپے

فی پرچہ

ایک روپیہ بارہ آنے

تاج پریس یوسف بازار۔ حیدرآباد دکن

دفتر "گجر" بی۔ ۳۴۴۔ نامپلی مارکٹ حیدرآباد دکن

اِس بار

گجر

زیرلب

ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کا مستقبل

پچھلے چند دنوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے عنوان سے بحث و مباحثہ کا آغاز ہوا ہے اور اس سلسلے میں بعض گوشوں سے انجمن کی تحلیل کا نعرہ بلند کیا گیا ہے۔ ان مباحث میں جو بات بری طرح کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ تحریک اور تنظیم کے مباحث کو الجھا دیا گیا ہے حالانکہ ان میں فرق ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تحریک کو تنظیم سے اور تنظیم کو تحریک سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن جب ہم کمزوریوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے بیٹھیں اور کسی صحت مند نتیجہ پر پہونچنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ تحریک اور تنظیم کے باہمی گہرے تعلق کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا الگ تجزیہ کریں ورنہ ہم بہت سی باتوں کو گڈمڈ کر دیں گے اور کسی صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں گے۔ اب تک ہمارے جتنے مباحث ہوئے ہیں ان میں یہ کمزوری بہت زیادہ نمایاں ہے۔

دوسری بات جو ہم کو صحیح نتیجہ پر پہونچنے سے دور رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے پوری تحریک کو پیش نظر رکھنے کی بجائے چند افراد کو ذہن میں رکھ کر ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو پوری تحریک سے وابستہ کر دیا ہے اور ایک مخصوص ذہنی عصبیت کی وجہ سے خود ان افراد کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند preconceived notions کی بنا پر کچھ فارمولے بنائے گئے ہیں اور ان کی بنا پر ساری بحث کھڑی کی گئی ہے یہاں تک تاریخی واقعات اور سماجی تبدیلیوں اور ان سے پیدا ہونے والی صورت حال اور ان کے تخلیقی رد عمل کی غلط توضیحیں اور تعبیریں کرنی پڑیں اور نتیجتاً ایسا الجھاؤ پیدا ہوا جس سے نکلنے کی کوشش میں ایک منفی نعرہ دینا پڑا۔

جہاں تک تنگ نظری کا تعلق ہے اس کو چند افراد تک محدود کرنا غلط ہوگا۔ اس کا شکار انجمن کا ہر چھوٹا بڑا رکن رہا ہے کوئی کم اور کوئی زیادہ۔ اس لئے چند افراد کا محاسبہ کرنے اور انہیں نااہل قرار دینے کی بجائے ان سماجی اسباب کا پتہ چلانا ضروری ہے جن کی وجہ سے کج روی اور گمراہی پیدا ہوئی اور اس ناپختہ سوجھ کا تجزیہ کرنا ہوگا جس نے تنگ نظری کو جنم دیا۔

ایک اور اہم کمزوری ہمارے مباحث کی یہ رہی ہے کہ ہم نے مباحث کی بنیاد اپنے پہلے منشور پر نہ رکھی اور نہ دلی کانفرنس کے منشور کی روشنی میں موجودہ حالات کا جائزہ لیا جس نے انتہائی وسیع بنیادوں پر

ادیبوں کے متحدہ محاذ کے امکانات کا راستہ کھول دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنگ نظری اور انتہا پسندی پہ
کڑی تنقید کرتے ہوئے بھی ہم نے جمہوری ادیبوں کی تنظیم پہ زور دیا حالانکہ ہمارے نئے منشور نے اس تصور
کو رد کر دیا ہے اور اس کی بجائے محب وطن اور انسان دوست ادیبوں کو تنظیم کی بنیاد بنایا ہے اس لئے کہ
موجودہ حالات میں جمہوری ادیبوں کی اصطلاح بھی تنگ نظری کی علامت ہے اور وسیع متحدہ محاذ کے راستے
میں رکاوٹ بنتی ہے۔

اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہماری تحریک ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے جو صرف کسی
ایک زبان یا علاقے تک محدود نہیں بلکہ ملک کی تمام زبانوں کے بہترین ادیب اس سے وابستہ ہیں۔ اردو
میں تو اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ تنظیم پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارا ادب سب سے زیادہ چھپتا اور بڑے مان سے
پڑھا جاتا ہے۔ نئی نسل برابر ہماری تحریک میں شریک ہو رہی ہے بلکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کیلئے
ہمارے ہی پلیٹ فارم کو اپنا پلیٹ فارم سمجھ کر استعمال کرتی ہے۔ ان حالات میں تحریک کو ختم کرنے کے
معنی ایک طرف انتشار اور بحران کو دعوت دینے کے ہیں تو دوسری طرف ان طاقتوں کو مضبوط بنانے کے
ہیں جو رجعت پسندی، فرقہ پرستی اور سامراج دوستی کو ہوا دے رہی ہیں۔ کہیں ہماری طاقتور تحریک کے آگے
ان کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ جن زبانوں میں ہماری تحریک اردو کی طرح طاقتور نہیں ہے وہاں
آج بھی ان کی جڑیں مضبوط ہیں۔

اس سلسلے میں حیدرآباد کا تجربہ کافی اہم اور غور طلب ہے۔ جس زمانہ میں ہم اپنی سہل انگاری اور
کاہلی کی وجہ سے انجمن کے ہفتہ وار جلسے پابندی سے نہیں کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہ سلسلہ طویل ہو جاتا ہے
تو فرقہ پرست اور رجعت پسند تنظیموں کی ادبی انجمنیں بڑے زور شور سے چلنے لگتی ہیں اور ہمارے حلقے
کے بعض نئے لکھنے والے ادھر کا رخ کرنے لگتے ہیں۔ اگر ہم انجمن کو تحلیل کر دیں تو ظاہر ہے کہ وہ تمام
عناصر جو نظریاتی طور پہ کمزور ہیں لیکن جن کو ہمارے ادب سے دلچسپی ہے۔ رجعت پسندوں
اور فرقہ پرستوں کی آغوش میں پہونچ جائیں گے اور جو نظریاتی طور پہ پختہ ہیں ان میں بھی انتشار پیدا ہو سکتا ہے
ہمارے خیال میں تنظیم کی تحلیل اور تحریک کو ختم کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں [illegible]۔ یہ ٹھیک ہے کہ
آج کے سماجی اور سیاسی حالات وہ نہیں ہیں جو ۱۹۳۵ء میں تھے۔ سماجی رشتوں اور [illegible] تقاضوں میں
بڑی تبدیلی آئی ہے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہم پر کچھ اور نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ضرورت اس
کی ہے کہ ان نئی تبدیلیوں کا جائزہ لیا جائے، نئی صورت حال کو سمجھا جائے اور نئے سماجی شعور اور نئے سما
جی رشتوں کی بنیاد پہ اپنی سوجھ بوجھ ٹھیک کی جائے تاکہ ہمارا تخلیقی رد عمل نئے (حالات)
کے مطابق ہو۔

دلی کے نشو یسٹ انتہائی وسیع بنیادوں پر تنظیم کی راہ سمجھائی ہے۔ اس کی بنیاد پر تمام حب الوطن اور انسان دوست ادیبوں کو ایک محاذ پر جمع کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ ہم کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین سے اپیل کریں گے کہ وہ اس سلسلے میں قدم اٹھائے اور تمام حب الوطن اور انسان دوست ادیبوں کا ایک کنونشن طلب کرے جس میں ایک متحدہ تنظیم کے علاوہ ادب کے موجودہ مسائل پر بھی بات چیت ہو سکتی ہے اور فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔ اس کنونشن کے تجربے کی روشنی میں تنظیم کا ڈھانچہ اور نام بھی بدلا جا سکتا ہے اور جائے گا ہند میں کے لسانی بنیادوں پر تنظیم ہو سکتی ہے اور ایک رابطہ کمیٹی کے ذریعہ تمام زبانوں کی تنظیموں میں قریبی تعلق قائم رکھا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہم یہ عرض کریں گے کہ موجودہ تنظیم کی تحلیل کا نعرہ انتہائی گمراہ کن ہے۔ اس سے ادبی مسئلہ تو حل نہیں ہوگا البتہ انتشار کو ہوا دے گا اور بدترین رجعت پسندوں کو سر اٹھانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔ (ادارہ)

SARDAR JAFRI

SARWAR DANDA

BASHAR NAWAZ
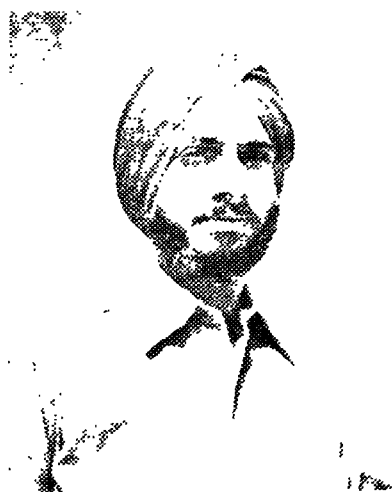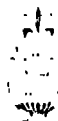
ZAHEERUDDIN MADNI

ANWAR MOAZZAM

AKBAR HYDERABADI

ڈاکٹر اعجاز حسین
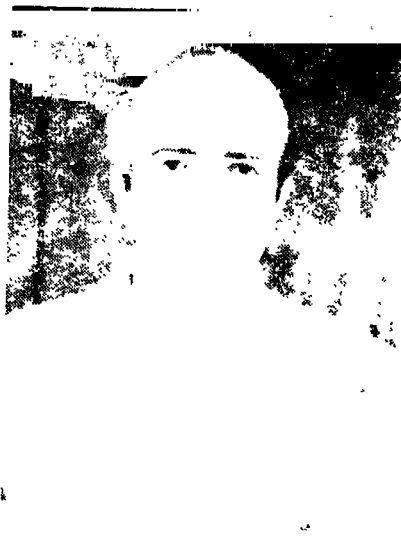
اردو کی خدمات
آزادی کے بعد

(زیرِ تصنیف کتاب کا خاکہ)

ادبی مورخ اور زبان کے افتادِ مزاج پر نظر رکھنے والے گواہ ہیں کہ اردو زبان کا وجود ضرورتوں کے ہاتھ ہوا اور اس کو وجود میں لانے والے ہندو مسلمان دونوں تھے۔ دونوں کے جذبات و خیالات سے اس کی تشکیل ہوئی گویا ابتدا ہی سے یہ ناممکن تھا کہ اس میں فرقہ وارانہ جذبات ہوتے یا وہ کسی ایک فرقہ کی بُرائی گوارا کرتی۔ ضرورت کے سانچے میں ڈھل کر اس کے خمیر میں یہ بات آگئی کہ مردم شناسی سے کام لے۔ ضرورتوں کو رفتارِ زمانہ سے ہم آہنگ کرتی رہے۔ تغیرات کی عکاسی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو آشکار کرتی رہے۔ چنانچہ شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو کہ جس میں ہماری زبان نے اپنے عہد کی ترجمانی نہ کی ہو۔ ابتدائے آفرینش پر نظر ڈالئے تو ادبی لحاظ سے دکن میں اس زبان کو فروغ ہوا اس وقت تمام ہندوستان میں تصوف کا زور تھا۔ مذہبی عناصر سے فضا گونج رہی تھی۔ اردو کا سارا کارنامہ اس وقت کا دیکھ ڈالئے۔ نثر ہو یا نظم سب کی تہ میں زیادہ تر تصوف یا دوسری شکل میں مذہب نظر آئے گا۔

اردو ادب کا فروغ شمالی ہند میں اورنگ زیب کے زمانے سے یا بعض صورتوں میں اس کی وفات کے بعد سے ہوا۔ اس وقت جو ملک کی حالت تھی اس کا بھی خاکہ ہم کو اردو میں صاف نظر آتا ہے۔ اسی طرح میرؔ و سوداؔ کے زمانے میں انتشار اور ہلچل ہے۔ کبھی صاف صاف جیسے شہر آشوب میں اور کبھی غزلوں میں اشارے کنائے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ غالبؔ۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ ظفرؔ وغیرہ کا کلام دیکھئے تو سب کے پسِ پشت یاس و پژمردگی بے چینی و بے قراری کی لہریں رواں دواں ہیں۔ آتشؔ و ناسخؔ کے لکھنؤ میں آئیے تو تعیش و تعشق اور بظاہر سکون کی تصویریں کلام میں نظر آئیں گی۔ غرض کہ یہ سلسلہ زینہ بہ زینہ غدر تک چلا آیا۔ دورِ جدید میں جب آزادؔ و حالیؔ کو فکر ہوتی ہے کہ زندگی کو ادب سے قریب تر کر دیا جائے تو یہ ورثہ یا زبان کی ذہنیت بڑے کام کی چیز ہو جاتی ہے۔ اور جیسے جیسے سیاسی شعور ہندوستانیوں کا بلند ہوتا ہے۔ اردو ادب کا یہ رجحان واضح و پُراثر ہو کر سامنے آجاتا ہے چنانچہ جب کانگریس زور پکڑتی ہے اور سلف گورنمنٹ یا ہوم رُول کا نعرہ بلند ہوا تو اس وقت سیاسی تحریک کی ترجمانی

میں اردو ہندوستانی زبانوں میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہی۔ اور جیسے جیسے ملک کے خیالات و عمل میں قوت آتی گئی اردو بھی سیاسی حالات اور بدیسی مظالم کو تیزی و کامیابی کے ساتھ عوام میں پیش کرتی رہی یہاں تک کہ سیاسی جدوجہد انقلاب زندہ باد کے نعروں میں اس منزل پر آجاتی ہے جس کو آزادیٔ ہند کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہماری آزادی کی ابتدا بھی بڑی رنگین ہے۔ گو اس کی سُرخی کو ہمارے خون کی ضرورت تھی۔ سارے ملک میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ عورتوں کی عصمت سے، بچوں کی معصومیت سے، بوڑھوں کی ناتوانی سے فائدہ اٹھا کر غنڈوں نے کھیل کھیلے اور اپنی جوانی کے زعم میں سب کا خون بہا دیا۔ کس نے کس کو مارا کیوں یہ ہنگامہ ہوا اور کتنا پرزور ہوا مجھے اس کا ذکر کرنا نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو اس فتنۂ محشر سے واقف نہ ہو۔ اس سلسلہ میں جنون و موت کی گرم بازاری ایسی رہی کہ حکمران طبقہ بدحواس تھا۔ انتظام کرنے والوں کے ہاتھ پیر جیسے شل ہو گئے ہوں۔ ایسے عالم میں اردو زبان اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھی اور سکون قائم کرنے کے لئے شاعر و نثر نگار یک زبان و یک دل ہو کر میدان میں آگئے۔ گویا آزادی نے بھی اردو کا امتحان لیا۔ سوال یہ تھا کہ یہ تباہی یہ خون ریزی یہ جنونِ فتنہ ساماں کیسے ختم ہو؟

ہمارے شاعر و افسانہ نویس جن کے اعصاب پر عورت سوار بتائی جاتی تھی اس انہماک و حواس کے ساتھ اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے بڑھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوئی تمام باتیں بھول کر اس فتنہ کو فرو کرنے لگے۔ اشعار، افسانوں اور دوسری تحریروں سے عوام کو بتاتے رہے کہ آپس کی لوٹ مار، قتل و غارت گری نہ کسی مذہب کی تعلیم ہے اور نہ کسی فرقہ کے لئے مفید، یہ صرف بہیمیت ہے جس کی آگ میں انسانیت جل رہی ہے۔ آدمی کو پہلے انسان ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ہندو یا مسلمان، اس قسم کے خیالات بڑی شد و مد اور ادبیت کے ساتھ نثر و نظم میں آنے لگے۔ اردو کی اس خدمت کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

اس قیامت خیز ہنگامے نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو پیام جنگ دیا تھا۔ اپنے سیلاب میں علوم و فنون کو بہلے جانا چاہتا تھا۔ کسی اور نے اس کے روکنے کی فکر کی یا نہیں کی مگر ہمارے ادیبوں نے آگے بڑھ کر اس کا تھام لیا۔ قلم سے تلوار کی باڑھ کو کند کر دیا۔ اپنی تحریروں سے فرقہ پرستی کے خلاف بمباری شروع کر دی۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک، ندیم قاسمی، عصمت، صدیقہ بیگم وغیرہ افسانوں میں اور شعر میں جوش، وامق، سردار جعفری، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی کے کارنامے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے چند مخصوص ادیبوں کے افسانوں اور نظموں کا ذکر کر دینا ضروری ہے تاکہ ان کی اہمیت نظروں کے سامنے دوبارہ آجائے۔ کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ "ہم وحشی ہیں" زبانِ حال سے بتا رہا ہے کہ ہماری تصویر کتنی بھیانک ہوگی۔ یہ مجموعہ فسادات کی حمایت کرنیوالوں کی بربریت پر ضرب کاری ہے۔ علاوہ خونچکاں داستانوں کے ان افسانوں میں فسادات کی

پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور افسانہ کے رنگ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بنائے مخاصمت نہ مذہبی ہے نہ اقتصادی بلکہ سرمایہ داروں کی بازی گری نے ہم کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ ہم اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اس مجموعہ میں "پیشاور ایکسپریس" اور "ایک طوائف کا خط" ایسے افسانے ہیں جنہوں نے فسادات کی آگ پر پانی کا کام کیا۔ پڑھنے اور سننے والوں کی حمیت بیدار ہونے لگی۔ اسی طرح خواجہ احمد عباس کا افسانہ "اجنتا" "میں کون ہوں" "ایک بچے کا خط گاندھی جی کے نام" "سردار جی" وغیرہ اس سلسلہ کی بیش بہا کڑیاں ہیں۔ "اجنتا" میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے فسادات سے گھبرا کر اجنتا کے غاروں میں پناہ لینے ایک شخص جاتا ہے۔ وہاں تصویروں کے حسن و جمال کو دیکھ کر ہندوستان کے ترقی یافتہ اور آباد شہر کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اجنتا کی مقدس دیویوں کے تصور سے اس کے ذہن، دل و دماغ سب بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کو بمبئی کی بربریت اور شرمناک باتیں یاد آجاتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہی دیویاں آج بمبئی کی غارت گری و خونریزی میں مدد کر رہی ہیں۔ خون کے دھبے سڑکوں پر دھو دیتی ہیں تاکہ مجرم کا پتہ نہ چلے۔ وہی بچے جو اجنتا کے نقوش میں معصوم نظر آتے ہیں آج دوسرے بچوں کو قتل ہوتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ تالیاں بجاتے ہیں۔ خدا جانے ان کو کیا ہو گیا ہے۔ عورت کے دل کی نرمی اور بچوں کی معصومیت ہندو اور مسلمان کے دلوں کی کثافت و سختی میں کیوں تبدیل ہو گئی ہے۔ آدمی کو انسان کیوں نہیں سوچا جاتا۔ اس کو مذہب کا پتلا مان کر کیوں قتل کر دیا جاتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کا دوسرا افسانہ "میں کون ہوں" مذہب پرستوں کی غلط کاری و بے راہ روی کی رگوں پر نشتر ہے۔ ان کا یہ افسانہ فرقہ وارانہ فساد کو اس طرح بے نقاب کر دیتا ہے کہ اس کی خوفناک و مکروہ صورت پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ عصمت چغتائی نے ایسے ڈرامے اور افسانے لکھے جو ان فسادات کا خاکہ پیش کرنے کے علاوہ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ باوجود نفسی نفسی کے اب بھی ایسے لوگ ہیں اور ایسے گھرانے ہیں جن کے نزدیک کوئی غیر نہیں۔ جن کا وجود مذہبی غضبیت کی تاریکی میں چراغ راہ کا کام دیتا ہے۔

اس قسم کے اور بھی افسانے لکھے گئے ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ مگر سب کا نقطۂ نظر ایک ہے یعنی آدمی کو آدمی سمجھا جائے۔ اور فسادی کو جس طرح ممکن ہو راہ راست پر لایا جائے۔ اتفاق سے ان افسانوں اور ڈراموں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو زبان و بیان، فن و معیار کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے جی لگا کر خلوص و انہماک کے ساتھ قلم اٹھائے ہیں۔ جو باتیں وہ کہنا چاہتے ہیں وہ ان کے دلوں کی پکار ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ادب و زندگی کا مقصد بھی سمجھ چکے ہیں۔ ان کے ادب کا ایک منشا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو زندہ زبان ہے کیونکہ ہر زندہ زبان کا فرض اولین ہوتا ہے کہ انسانیت کی تبلیغ کرے۔ زندگی کی خوبیوں اور خرابیوں پر تنقیدی نظر ڈالے اور بہکے ہوئے سماج کو راہ راست پر لانے کی فکر کرے۔ بے لاگ ہو کر اپنا فرض ادا

گجر

کرے اردو نے اس فرض کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے نمونے آپ کے سامنے ہیں۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں ورنہ آپ کو محسوس ہوتا کہ ہندوستان کی زبان سے نکلا ہوا شعر اردو کی عام پکار ہے کہ ؎

چھیڑے ساز دوراں پہ گانا نہ آیا ❊ وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے

○

اس کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ فسادات کے سلسلے میں نثر نگاروں نے زیادہ کام کیا یا شعراء نے۔ سرسری مطالعہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید کسی نے کسی سے کام کم نہیں کیا۔ جس طرح نثر لکھنے والوں نے اپنا موضوع وقتی طور پر فساد کا انسداد بنا لیا تھا اسی طرح شعراء نے بھی اپنی شاعری کا ماحصل اس کے خلاف جہاد کرنا سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ منجملہ دیگر حضرات کے جوش، وامق، ساحر، سردار جعفری، راہی، مظفر وغیرہ نے خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز اسی کو بنا لیا اور وہ سب کچھ کیا یا کہا جو اردو کے سپوتوں کو کرنا چاہیئے تھا۔ ان لوگوں نے متعدد کامیاب نظمیں اس سلسلہ میں کہیں۔ ایسی ہر نظم پر پوری ادبیت کے ساتھ فنکاروں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں متعدد جوش کے ساتھ تباہی و بربادی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ لوگوں کی حماقتوں کا پوسٹ مارٹم کندہ حال بنایا گیا ہے۔ ہر نظم میں اظہار تاسف و اعتراف شکست ہے۔ کوئی بھی نظم ایسی نہیں جو محض کہنے کے لئے کہی گئی ہو یا جس میں سنگدلی و خوں ریزی کی روداد میں شاعر کو لذت حاصل کرنے کا احساس ہوا ہو۔ ہر ایک کی تہ میں ندامت و جہالت کی کارفرمائی پر گریز و غم نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ان میں کافی ایسے شعراء ہیں جو پہلے ہی سے اس آزادی کے خلاف تھے۔ وہ تقسیم ہند پر راضی نہ تھے۔ انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے اندیشہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے رویہ کو شاید نہ تبدیل کریں۔ اس آزادی کے بھیانک آغاز کو دیکھ کر اس لئے چپ رہیں کہ ان کا کہنا کیوں نہ سنا گیا۔ ان کی بات کیوں نہ مانی گئی۔ وہ غم و غصہ کی لہر میں فسادات کی زہر آلود فضا میں زبان نہ کھولتے تو تعجب نہ ہوتا۔ مگر انھوں نے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت دیا مادر وطن کا دامن خون میں تر دیکھ کر ان کے بھی دل و دماغ قابو میں نہ رہے۔ زبانیں کھل گئیں محسوسات نے فریاد و فغاں کی صورت اختیار کر لی اصولی مخالفت بدل کر نصیحت و فضیحت میں صرف ہونے لگی۔ دل کی بھڑاس اشعار بن کر اردو میں ابل پڑی۔

ہماری زبان نے پھر ایک زبردست قومی فرض ادا کیا۔ ایک زندہ و حساس آلہ کار ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے آڑے وقت پر آگے بڑھ کر سیلاب کو روک دیا یہ ہم مانتے ہیں کہ جو کچھ اس نے کیا اس کا فرض تھا۔ اور اس کے شاعروں کو یہی کرنا چاہیے تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتے ہیں کہ ایسی زبان کو تو فرض شناسی و فرض گزاری کے صلہ میں کچھ بلکہ حکومت کو بھی صلہ دینا تھا۔ اس کو آگے بڑھنے کا اور سہارا دینا تھا۔ اس کی اشاعت کو روکنا نہ تھا۔ مگر یہ سب خام خیالی کی نذر ہو گیا۔ انجام بالکل برعکس ہوا۔ اس کے پر کتر دیئے گئے۔ اس کے دائرہ اثر کو تنگ و تاریک کر دیا گیا۔ خیر چھوڑیئے

جگر

ہی دادگستری و سخن پروری کو۔ آئیے چند نظموں کے اقتباسات دیکھ لیجیے تاکہ میری رائے سے اختلاف و اتفاق کا وقوع ہو جائے جگن ناتھ آزاد آزادی کی ابتدا کو جن نظروں سے دیکھتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

نہ پوچھ جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری ✤ ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا ✤ بتا اے پیرِ میخانہ یہ مے خانوں پہ کیا گذری

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا ✤ خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری
نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو ✤ سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گذری
جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پائے تھے ✤ بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گذری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ ✤ ہوا اتنا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گذری

مثلاً ورا احمد منظور اپنی نظم رستے ناسور اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

خزاں کے پہلو میں توڑتے دم حسین بہار و نکو میں نے دیکھا ✤ بگڑتے بن بن کے دستِ فطرت کے شاہکاروں کو میں نے دیکھا

او ردو شعر کے بعد کہتے ہیں:۔

ٹپکتے دیکھا اجل کے جبڑوں سے زہر آلود جھاگ میں نے ✤ بطونِ گیتی سے اٹھتے دیکھے دھوئیں کے پُر پیچ ناگ میں نے

آگے چل کر اسی نظم میں کہتے ہیں:۔

قبائے ہوش و خرد کو میری نگاہ نے تار تار دیکھا ✤ ہر ایک پہلو کے تنکدے میں کشیدگی کا غبار دیکھا
جوان بیٹے کے سرد لاشے پہ ماں کا جلال دیکھا ✤ نزولِ شبنم کی جگہ آنکھوں میں بجلیوں کا جمال دیکھا
بلکتے بچوں کو میں نے دیکھا سسکتی ماؤں کی گودیوں میں ✤ ہوا کی چیخیں سنی ہیں میں نے خنک فضاؤں کی گردیوں میں
یتیم بچے بال و پر بھی دیکھے لٹے لٹے کارواں بھی دیکھے ✤ زمیں کی چھاتی کا بوجھ بن کر جھکے جھکے آسماں بھی دیکھے

فسادات کے سلسلے میں اردو شعراء نے بے شمار نظمیں پیش کیں جو اچھی خاصی کتاب کی ضخامت اختیار کر لیتی ہیں۔ چنانچہ ان کے اقتباسات بھی یہاں پیش کرنا آسان و مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ صرف جوش ملیح آبادی کی اک نظم "ہندوستان و پاکستان کا نعرہ" اور سن لیجیے:۔

اے ناقدِ تباہیِ دنیائے روزگار ✤ ہاں اس طرف بھی ایک نظر بہرِ کردگار
ہم ظلم کے ہیں شاہ شقاوت کے تاجدار ✤ انسان ہے تو ڈال ہمارے گلوں میں ہار

اہلبیت کا مرد ہے تو احترام کر

ہم ہیں امیرِ نادر و تیمور، سلام کر

اے شخص ہم کو غور سے کیا دیکھتا ہے تو — ہاں ہم ہیں تند و تیز و خوں ریز و مرگ خو

یہ دیکھ کہنیوں سے ٹپکتا ہوا لہو — بیٹوں کے سر اڑاتے ہیں باپوں کے روبرو

ژولیدہ کاکلوں کی گھٹاؤں کے سامنے

بچوں کو بھون ڈالا ہے ماؤں کے سامنے

کس کس مزے سے ہم نے اچھالی ہیں بچیاں — سانچے میں سجا کے ڈھالی ہیں عورتیں

شہوت کی بھٹیوں میں اُبالی ہیں دختریں — گھر سے برہنہ کر کے نکالی ہیں عورتیں

یہ صف بھی کی گئی ہیں مہوشیں بے دری کے بعد

پھاڑا ہے ہم نے رحم کا بھی عصمت دری کے بعد

جن جن کے ہم نے کھائے ہیں کتنے ہی نوجواں — اطفال کے گلوں میں بھی ڈالی ہیں رسیاں

پیرانِ خستہ جاں کے بھی توڑے ہیں استخواں — نکلی ہوئی عورتوں کی بھی کاٹی ہیں چھاتیاں

دو کر دیا ہے چیر کے ہم نے یقین کر

بچوں کو ان کی ماؤں کی گودی سے چھین کر

. . . .

بوجہل کی شراب سے چھلکا کے جام کو — بٹا لگا دیا ہے محمد کے نام کو

زندہ کیا ہے راون دوزخ مقام کو — ہاں ہم نے روسیاہ بنا لیا ہے رام کو

قرآں کو ہم پہ فخر ہے ویدوں کو ناز ہے

بیشک ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

ہاں ہاں حرامزادے ہیں بے اختیار ہیں — ہاں ہاں حرام خور ہیں انسان خوار ہیں

ہاں بانیِ خزاں ہیں عدوئے بہار ہیں — خونی ہیں بدگہر ہیں رذالت شعار ہیں

جس کا ضمیر، خیر ہو تُف ایسے کام پر

ہم تھوکتے نہیں ہیں شرافت کے نام پر

جوش نے جس بیباکی کے ساتھ تنفر سے متاثر ہو کر اظہارِ خیال کیا ہے، فسادات اور فساد کرنیوالے اپنے اعمال سے ان ہی الفاظ کے مستحق تھے نظم میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شاعر نے ناصح و مشفق بن کر خطاب نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی زبان بن کر فسادیوں کو بھی یگانہ سمجھ کر ہندوستانی خیال کر کے ضمیر متکلم کی صورت میں

دل کا بخار نکالا ہے۔ غم و غصہ کی لہر میں نہ ہندو کو معاف کیا ہے نہ مسلمان کو قابلِ عفو سمجھا۔ سچ مچ یہ فعل اتنا ہی قبیح تھا کہ شریف سے شریف آدمی بھی موٹی موٹی گالی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس بھیانک اور روح فرسا دیوانگی سے ہمارا پورا ادب متاثر ہوا۔ یہی نہیں کہ صرف نظم کہنے والے ہی اس فرقہ وارانہ فساد کو لعنت سمجھتے رہے بلکہ غزل گو شعرا بھی اپنے طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اس خانہ جنگی کو قابلِ نفرین و ملامت خیال کر کے برا بھلا کہتے رہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف جگر مراد آبادی کی ایک غزل مثالاً پیش کرتے ہیں:

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل ؛ شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی ؛ انساں کے سلسلے سے بھی گریزاں ہے آج کل

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن ؛ اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

کیسا خلوص کس کی محبت کہاں کا درد ؛ خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آجکل

بے زخم کائنات جو ہندو ہے اِن دنوں ؛ بے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیٔ وطن ؛ در اصل اک پیکرِ بے جاں ہے آجکل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر ؛ جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آجکل

ہمارے ادیبوں کا اس درندگی پر پُر زور احتجاج ثابت کرتا ہے کہ زندگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے اس قدر وہ وابستہ ہو گئے ہیں اور ان کے شعور اتنے بیدار ہو گئے ہیں کہ تمدن و تہذیب کو خطرہ میں دیکھ کر وہ بےچین ہو جاتے ہیں۔ نہ فرقہ کا لحاظ کرتے ہیں نہ مذہب کا۔ نہ دیکھتے ہیں ہر ایک سے بالاتر ہو کر خطرہ کی روک تھام میں اپنی نگارشات کو صرف کرتے ہیں۔ اردو ادب کی یہ خدمت اس کامیابی کے ساتھ پیش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو ورثہ میں یہ خصوصیت ملی تھی۔ سماج اور ملک کی تباہی پر اس نے پہلے بھی آنسو بہائے ہیں۔ سودا کا "شہر آشوب" اور دہلی کی تاراجی پر عہدِ قدیم میں جو شعرا نے مرثیے کہے وہ ہماری بات کی پوری تائید کرتے ہیں۔

آزاد ہونے کے بعد ہی سے ہندوستان جن مصیبتوں میں مبتلا رہا ہے ان میں ایک خاص تکلیف دہ عنصر مفلسی یا بیکاری ہے جس کا کوئی معقول حل اب تک حکومت کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے باخبر کرنے کیلئے اردو زبان نے اپنا ادبی سرمایہ جس خوبی سے پیش کیا ہے اس کی مثالیں بھی کہیں اور مشکل سے ملیں گی۔ آزادی کے بعد سے آج تک ہر اچھے افسانے کا رُخ اسی طرف نظر آتا ہے۔ عوام کی خستگی و پراگندگی کو اس نے تمام موضوعات سے زیادہ مرکزِ توجہ بنا لیا ہے۔ دورِ جدید کے زمانہ ہی سے اردو ادب محلوں کو چھوڑ کر ملکیان سے بیزار ہو کر جھونپڑیوں میں رہنے والوں کی حمایت میں زبان کھول رہا تھا لیکن جیسے جیسے فاقہ کشی و برہنگی میں شدت آئی ویسے ہی اس کے

لہو ہو میں کچھ اور تیزی آ گئی۔ چنانچہ دورِ حاضر میں ہمیشہ سے زیادہ ان بلاؤں کی شدت کو ہم نے محسوس کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عوام سے قریب تر ہو گئی۔ اس کا اجتماعی احساس تیز تر ہو گیا۔ سرمایہ داروں، رشوت خواروں کی اس نے زیادہ سے زیادہ قلعی کھول دی۔ ان کے مظالم اور خود غرضی کو طشت از بام کر دیا۔ اس نے مساوات اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے جمہور کو واقف کرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ جہاں کہیں اس نے موقع پایا۔ اس فرض کو ادا کیا۔

میگزین میں، کتابوں میں نظم کیے ہیں۔ ان سے سمجھئے نتیجے سے غرض کہ ہر جگہ سے آج اُردو ادب کے لئے عوام کی خستگی اور سرمایہ داروں کی زیادتی پر روشنی ہے۔ ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ آج اُردو ادب ہم تن قومی تعمیر، انسانی تشکیل میں مصروف ہے۔ وہ اپنا یہ فریضہ صرف اس لئے نہیں ادا کر رہا ہے کہ عوام اس سے خوش ہو جائیں یا اشتراکی تحریک اس سے آسودہ ہو جائے۔ بلکہ سب سے بڑی وجہ اس جدوجہد کی یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کو آزاد و سرسبز دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ مفلسی و بیکاری کے ہوتے ہوئے آزادی کو مکمل آزادی نہیں سمجھتا۔ وہ حکمراں طبقہ کو آج بھی سا رہا ہے کہ محض نیتا یا رہنما کے لقب سے خوش ہونا خان بہادری یا رائے بہادری سے خوش ہونے کا مرادف ہے۔ اصل رہنمائی یہ ہے کہ کوئی فرد بھوکا نہ رہے۔ عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑھا ضروریاتِ زندگی کیلئے دریوزہ گری نہ کرے۔ کوئی کار آمد آدمی نظر انداز نہ کیا جائے۔ کوئی کام کرنے کا خواہشمند یہ نہ سمجھے کہ ہمارے ملک میں آج اس کے لئے کوئی کام نہیں۔ انہی تمام باتوں کے لئے کبھی کبھی اُردو ادب کو باغی بھی سمجھا جاتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جس طرح کوئی فنکار بڑا فنکار اس وقت تک نہیں ہوتا جو زمانے کو آگے بڑھانے میں باغی نہ سمجھا جائے اسی طرح کوئی ادب بڑا ادب کہلانے کا مستحق نہیں جب تک وہ انسانیت کے کچلنے والی تحریکوں سے بغاوت کر کے باغی نہ سمجھا جائے۔ اس لئے میں مطمئن ہوں کہ اپنی ان تمام کارگذاریوں سے اُردو عظیم ادب بننے کے لئے قدم بڑھا رہا ہے کوئی طبقہ اسے بھی کہے یا بھی اور بُرائی کے ساتھ یاد کرے۔ مگر اس نے اپنا راستہ متعین کر لیا ہے اور اس کے تیور میں انسانیت کی ابھار اس کے خیالات میں آزادی کی تکمیل ہر قدم پر نظر آتی ہے۔

اس وقت یہ موقع نہیں کہ میں افسانوں یا دوسری نثری تحریروں سے ایسے بھی اقتباسات پیش کروں جو نوجوانوں کی ذہنی، نفسیاتی الجھنوں کی تشریح و فریاد کی پوری ترجمانی کر سکیں۔ صرف چند نظموں کے ٹکڑوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ چار نمونے ملاحظہ ہوں:-

احسان دانش کی ایک نظم کا عنوان ہے "اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں"۔ اسی نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں۔ ؎

انسان کا شکاری انسان ہے دن رات اسی کا رونا ہے ٭ مزدور کی چربی چاند کی ہے دہقان کی ہڈی سونا

تہذیب کے میلے دامن سے اس داغ کو جلدی دھونا ہے ۔ ظاہر ہیں یہ چھوٹا مرض سبھی اندر کا مواد باہر نہیں

اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

کب تک یہ جواری جیتیں گے کب تک یہ جماعت لوٹے گا ۔ مزدور کے میلے ہاتھوں سے زنجیر تشدد ٹوٹے گی

دہقان گلے جب کاٹیں گے ہاتھوں پہ کرن سی پھوٹے گی ۔ مرنے سے حسین اب فرمانیں بچنے سی برا اب کام نہیں

اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

مخمور جالندھری اپنی نظم "پہرہ" میں ایک طنزیہ انداز سے کہتے ہیں :۔

راج دلاروں کو سونے دو

لوک راج کی بھوکی جنتا

اپنی حفاظت آپ کرے گی ۔ ۔ ۔ ۔ جاگتے رہنا

کھاتے ہیں جو زیادہ ان کو

میٹھی گہری نیند آتی ہے

لیکن بھوکے کب سوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ جاگتے رہنا

جنتا کے رکھشک محلوں میں

پہرہ دیتے چلے گئے ہیں

محلوں میں ہے سونا چاندی

اور ہمارے گھروں میں کیا ہے

ٹوٹی کھٹیا پھوٹے برتن

ٹوٹی کھٹیا پھوٹے برتن

ہاتھ ان سے دھو بیٹھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاگتے رہنا

طرح جوش بھی طنزیہ انداز میں خود رشوت خور بن کر کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؎

لوگ ہم سے روز کہتے ہیں یہ عادت چھوڑیئے ۔ یہ تجارت ہے خلاف آدمیت چھوڑیئے

اس سے بد تر لت نہیں ہے کوئی یہ لت چھوڑیئے ۔ روز اخباروں میں چھپتا ہے کہ رشوت چھوڑیئے

بھول کر بھی جو کوئی لیتا ہے رشوت چور ہے

آج قومی پاگلوں میں رات دن یہ شور ہے

رشوت خور اپنی برأت میں کہتا ہے ؎

گجر

بھوک کے قانون میں ایمانداری جرم ہے ۔ اور بے ایمانیوں پر شرمساری جرم ہے
ڈاکوؤں کے دور میں پرہیزگاری جرم ہے ۔ جب حکومت خام ہو تو پختہ کاری جرم ہے
لوگ اٹکاتے ہیں کیوں روڑے ہمارے کام میں
جس کو دیکھو خیر سے ننگا ہے اس حمام میں

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

توند والوں کی تو ہو آئینہ داری واہ وا ۔ اور ہم بھوکوں کے سر پر چاند ماری واہ وا
ان کی خاطر صبح ہوتے ہی نہاری واہ وا ۔ اور ہم چاٹا کریں ایمانداری واہ وا
سیٹھ جی تو خوب موٹر میں ہوا کھاتے پھریں
اور ہم سب جوتیاں گلیوں میں چٹخاتے پھریں

وقت سے پہلے ہی آتی ہے قیامت دیکھئے ۔ منہ کو ڈھانپے رو رہی ہے آدمیت دیکھئے
دور جا کر کس لئے تصویر عبرت دیکھئے ۔ اپنے قبلہ جوش صاحب ہی کی حالت دیکھئے
اتنی گمبھیری پہ بھی مر مر کے جیتے ہیں جناب
سوجتن کرتے ہیں تو اک گھونٹ پیتے ہیں جناب

جیسا اوپر کہا گیا اردو اپنے افتاد مزاج کے لحاظ سے ہر عہد میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتی رہی ہے وہی اب بھی کر رہی ہے آزادی کے لئے اس نے جو جہاد کیا وہ بھی آپ جانتے ہونگے ۔ آزادی کے بعد ملک کو جن باتوں کی ضرورت تھی اُس کی بھی اُس نے فکر کی اندرونی کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی تاکہ ملک سچ مچ خوش حال ہو جائے سردست اس کا رخ سرمایہ داری کے خلاف اور مفلسی کو دور کرنے کی موافقت میں ہے ۔ مزدور طبقے کی اقتصادی بحالی پر اس کی نظر ہے وہ سمجھتی ہے کہ جب تک مساوات نہ قائم ہوگی آزادی آزادی نہ معلوم ہوگی ۔ اور چونکہ سرمایہ داری کا زہر بین الاقوامی ہے ۔ بیرونی سرمایہ اپنا وقار قائم کرنے کے لئے ہر وقت جنگ چاہتا ہے ۔ اس لئے اردو کے نثر نگار اور خاص کر شعراء اپنی توجہ کا مرکز امن عالم کو بنائے ہوئے ہیں ۔ اس موضوع پر قابل قدر نظمیں کہہ رہے ہیں ۔ سردار جعفری کی ایک طولانی نظم "امن کا ستارہ" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے ۔ اس کے علاوہ متعدد اہل قلم نے افسانے اور نظمیں اس ضمن میں پیش کئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔ "حبیب تنویر" کی ایک نظم کا عنوان "جنگ نہ ہونے پائے" ہیں سے کچھ بند سن لیجئے :۔

یہ مسکاتے کھیت یہ ہنستے پھول ۔ سوچ میں ہر دم کھوئے ہوئے اسکول
ان پہ اڑے گی آگ اڑے گی دھول ۔ دیکھ ابھی سے پھول کے منہ سے گندھک کی بو آئے ۔

شجر

جنگ نہ ہونے پائے

شور ملوں کا ریلوں کی چھم چھم — محنت کرنے والوں کا سرگم
کیا ان پر برسیں گے ایٹم بم — کیا ان کی ہر تان موت کی چیخوں میں ڈھل جائے
جنگ نہ ہونے پائے

دوست اگر بتلاؤں دل کی بات — بہت بڑی ہے سامراج کی گھات
تھپکی دے کر پیٹ پہ مارے لات، — پیٹھ میں خنجر بھونکے، لہو پیئے۔ پی کر اترائے
جنگ نہ ہونے پائے

ساتھی میرے بھائی میرے آؤ — شانتی دوت لشکر میں مل جاؤ
بادل بن کر دنیا پہ چھاؤ — وہ بادل جو سدا پریم ہی کے موتی برسائے
جنگ نہ ہونے پائے

آخر میں وہ عرض کرنا ہے جو اوّل میں کہہ چکا ہوں یعنی اردو اپنے مزاج کے لحاظ سے بین الاقوامی ہے اس کے خمیر میں تو ہندوستان کی مٹی ہے مگر اس کی گھٹی میں دیس بدیس کی بھی باتیں شامل ہیں۔ چنانچہ عرب و ایران کے علاوہ جب اس کو سابقہ پڑا تو پرتگال، فرانس، ترکستان سب ہی سے اس نے جلبِ منفعت کیا۔ اِن ممالک کے الفاظ اور چیزوں کو استعمال کرنے میں اس نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن دورِ حاضر سے پہلے اُس کی یہ ذہنیت محدود تھی۔ آج اس کا دائرہ تخیل بہت وسیع ہو گیا ہے۔ یعنی ممالک کے فن کاروں اور رہنماؤں کی قدر شناسی دنیا کے دکھوں سے ہمدردی اس کا مسلک ہو گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اردو کہہ رہی ہے کہ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس کا ثبوت پیش کرنا مشکل نہیں مگر طوالت کا خوف دامن گیر ہے۔ اس لئے اقتباسات پیش کرنے سے فی الحال گریز کر رہا ہوں۔ صرف یہ کہنا ہے کہ اردو اس وقت آفاقی مسائل سے خاطر خواہ دلچسپی لے رہی ہے وہ بالکل صحیح سمجھتی ہے کہ سائنس نے پوری دنیا کو ایک ملک بنا دیا ہے اور ممالک اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ ایک زنجیر کی کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے وہ چاہے کتنی دور کتنے ہی الگ ہوں مگر اجتماعی لحاظ سے ایک ملک دوسرے ملک کے لئے ایسا ہی ہو گیا جیسے ایک شہر کے مختلف محلے اور ہر ایک ملک کا باشندہ پڑوسی ہو گیا۔ پڑوسی کا جو حق ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے جب کوریا پر جارحانہ حملے شروع ہوئے تو ہمارے ادیبوں نے انسانیت کو مجروح ہوتے دیکھ کر اپنے قلم کی باگ اس طرف بھی موڑ دی اور حسبِ استعداد وہاں کے مظلوم طبقہ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کی ایک مثال واثق کی نظم "نعرۂ امن" سے دیکھتے چلئے۔ ؎

گجر

کسی کے گھر میں کود کر محافظت فریب ہے
یہ شانِ جارحانہ صرف ڈاکوؤں کو زیب ہے
فراز اس کو کیا کہیں جو اصل میں نشیب ہے

اندھیرا ہی اندھیرا ہے یہ خاوری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

نہ جانے کتنی مائیں اپنے بیٹوں سے بچھڑ گئیں
نہ جانے کتنے شہر کتنی بستیاں اُجڑ گئیں
جمی ہوئی نہ جانے کتنی کھیتیاں اکھڑ گئیں

تو پھر یہ کیا ہوا اگر جنونِ ڈالری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگ آمری نہیں

یہ فتنہ کوریا ہی میں اگر نہ سو گیا کہیں
تو ایٹمی لڑائی سے لرز اُٹھے گی کل زمیں
وہ رن پڑے گا جس میں بھاگنے کا بھی گذر نہیں

یہ حملۂ یزیدیت ہے جنگِ سروری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

گجر

سجاد ظہیر

کچھ غزل کے بارے میں

ایک سال سے زیادہ ہوا، میرے عزیز دوست ظ۔ انصاری کا ایک مقالہ "غزل باقی رہے گی" کے عنوان سے "ادبِ لطیف" (لاہور) میں شائع ہوا۔ فاضل مضمون نگار نے اس مقالہ میں صنفِ سخن کی حیثیت غزل کے موافق و خلاف متعدد دلائل و مباحث کا بڑی خوبی سے جائزہ لے کر آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غزل بہت سے موضوعاتی اور ہیئتی تغیر کے ساتھ موجودہ زمانے میں باقی رہے گی۔ اور اسے باقی رہنا چاہیے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ممتاز حسین نے "غزل یا شاعری" کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ لکھا۔ اس میں انہوں نے بہت مضبوط دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ دور میں اپنے معنوی و ہیئتی عجز کے سبب غزل ہماری شاعری کے بھرپور ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتی اور بہتر یہ ہے کہ ہمارے شاعر غزل گوئی کے مقابلے میں نظم گوئی کی طرف زیادہ توجہ دیں۔

گذشتہ دنوں میں غزل گوئی کی بہتات سے ظ۔ انصاری بھی معلوم ہوتا ہے گھبرا گئے ہیں۔ اپنے پہلے مضمون میں بعض شکل میں غزل کی انہوں نے موافقت کی تھی اور اب بھی غالباً ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے وہ اچھی غزل کی داد دینے سے احتراز نہیں کریں گے لیکن اپنے آخری مضمون میں انہوں نے کہا ہے:۔

"(غزل کے) امکانات جو بھی ہوں لیکن اس کا سب سے بڑا امکان یہ ہے کہ وہ فراریوں کی پناہ گاہ اور تھکے ہوئے مسافروں کا مہمان خانہ بن جاتی ہے۔ مہمان خانے کی بھی آدمی کو ضرورت ہوتی ہے لیکن اور بیچارا ایسا وقت بھی آ پڑتا ہے جب اس مہمان خانے پر دھاوا بولنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنی صنفِ نظم کے دشمن نہیں ہیں تو ہمیں شاعروں کے بازو کھینچ کر غزل کے مہمان خانے سے انہیں نکالنا ہوگا۔" (شاہراہ سالنامہ ۵۲ء۔ نیا سال نئے سوال صفحہ [illegible])

اس طرح ظ۔ انصاری بھی عملی طور پر اسی رائے کے ہو گئے ہیں جس کا اظہار ممتاز نے اتنی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارے شعری ارتقاء کا رُخ وہی ہے جس کی طرف ان دانشمند نقادوں نے اشارہ کیا ہے

حالی نے نظم کے جس دور کو شعوری طور سے شروع کیا تھا وہ بدستور جاری ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ غزل کبھی نہیں جاتی یا اچھی غزلیں کہنا نہیں چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ غزل کو ہماری شاعری کے پہلے ادوار کی طرح اب مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

مثلاً گذشتہ دو برس میں فیض نے چند بہت اچھی غزلیں لکھی ہیں۔ اور کسی نقاد کا ان سے یا کسی دوسرے شاعر سے یہ کہنا کہ تم غزل مت کہا کرو، حماقت ہوگی۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جب ہم فیض کی شاعری کو مجموعی حیثیت سے جانچیں گے تو معنویت یعنی خیال کی گہرائی اور سچائی اور شعری تخئیل کی پرواز اور بوقلمونی کے لحاظ سے ان کی نظموں کا وزن غزلوں سے زیادہ ہوگا۔ اس لحاظ سے "دستِ صبا" (پہلا ایڈیشن) کو ہی اگر لیں تو اس کی تین چار نظمیں (در عشق، ایرانی طلباء، شامِ زنداں، شیشوں کا مسیحا) تمام غزلوں پر بھاری ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی کے بعض پہلوؤں کا وہ تخئیلی اور جھلملاتا ہوا مرقع جو کہ ان نظموں کے ذریعے سے شاعر نے پیش کیا ہے، اپنے اندر ایک عمارتی تفصیل اور تکمیل کی خوبی رکھتا ہے۔

اچھی غزل کے منفرد اشعار دل میں بڑی جلدی پائدار ہو جاتے ہیں۔ وہ بجلی کی طرح چمک کر دل و دماغ میں حرارت پیدا کر دیتے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں سے خیال کا رخ ایک درخشاں نکتے پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کی خوبی اور افادیت مسلم ہے۔ لیکن ایک اچھی نظم دل و دماغ کی زمین پر اپنی تخئیلی رفتار میں پیش نظر حقیقت کو مختلف متنوع پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے۔ وہ بہت ساری تشبیہوں، استعاروں، صوتی علامتوں اور فکری جدولوں کے سلسلے سے ایک پوری تخئیلی عمارت بناتی ہے، جو اعمال و واقعات کے بیان، اپنے رنگا رنگ حسن اور حقیقی خیال آرائی کے سبب سے زندگی اور اس کے لطیف ترین تقاضوں کی زیادہ مکمل ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سعدی اور خسرو کے زمانے سے لے کر غالب تک فارسی اور اردو شاعری کی مرکزی اور بیشتر بہترین شعری تخلیق غزل کی صنف میں ہوئی اور گو اس زمانے میں بھی نظمیں لکھی گئیں لیکن مجموعی اور صفاتی حیثیت سے ان کی اہمیت فارسی اور اردو شعری ادب میں شاید غزلوں کے مقابلے میں کم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریباً چھ سو سال کے اس عرصے میں ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے بلند پایہ مسلسل نظمیں (مثنوی، قصیدہ، مرثیے، قطعے وغیرہ) لکھیں، خود شیخ سعدی عظیم نثر نگار ہونے کے علاوہ بوستاں کے مصنف کی حیثیت سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ اسی عرصے میں فارسی میں خسرو، رومی اور جامی کی مثنویاں اور عرفی، فیضی کے قصائد اور دوسری نظمیں لکھی گئیں۔ اردو میں شعرائے دکن کی مثنویاں، میر حسن کی سحرالبیان، نظیر اکبرآبادی کی نظمیں اور انیس کے مرثیے ظاہر کرتے ہیں کہ بہترین شعری صلاحیتوں کا اظہار نظم کے ذریعہ سے

بھی ہو رہا تھا۔ پھر شعر نے تخیل کے جوہرِ لطیف کی حیثیت سے جو تابانی اور معنویت (حسن) اور دلکشی صنفِ
غزل میں پیدا کی اور اسے جو مقبولیت اور ادبی مرکزیت حاصل ہوئی وہ اس طویل دور میں کسی دوسری صنفِ
سخن کو نہیں ہوئی۔

اس بات کے واضح اظہار کی ضرورت آجکل بہت زیادہ ہے چونکہ مبتذل، تہی مایہ اور شاعری کے عظیم
اخلاقی، جمالیاتی اور فنی منصب سے محروم بہت سے متشاعروں نے بیشتر غزل کو ہی اپنا تختۂ مشق بنایا تھا اسلئے
حالی اور اس کے پیروؤں نے بجا طور پر اس قسم کی شاعری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور اسے ایک "ناپاک دفتر"
کا خطاب دیا اور ہم بھی اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ عہدِ حاضر میں ایسی عظیم یا اچھی شاعری جس سے آج کل مکمل ذہنی اور
روحانی تسکین ہو غزل کے سانچے میں محدود نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بعض لوگ جب ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ
گذشتہ چھ سو سال میں فارسی اور اردو غزل کے جو بہترین نمونے ہیں وہ لازمی طور پر عظیم شاعری نہیں ہو سکتے، اور یہ
کہ غزل ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے بیشتر جاگیری دور کے انحطاط اور افراتفری اور انتشار کی عکاسی کرتی ہے
تو ہمارے خیال میں، ہم سخت غلطی کرتے ہیں۔

ہم بجا طور پر جاگیری دور کے غیر علمی نظریوں اور طرزِ فکر کو مسترد کرتے ہیں۔ سماجی حقیقت کو صحیح اور معروضی
طور پر سمجھنے کی راہ میں جو رکاوٹیں اور پناہ گاہیں ہیں ان کا دور کرنا ضروری ہے قبائلی یا جاگیری عہد کے بہت
سے عقائد اور آرٹ کے مظاہر، جو تاریخی ارتقا، اور جدید علوم کی روشنی میں معمولی طور پر ختم ہو گئے ہوتے، بعض غرضمند
حلقے انہیں مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مصنوعی تاریکی میں عقل، سائنس، اخلاق اور
انسانیت کی شمعیں روشن کرنا ہمارا فرضِ اولین ہے۔ نئی زندگی کی تعمیر کا ذوق اپنے اظہار کے لئے یقینی فن اور
آرٹ کے نئے سانچے بھی ڈھالے گی لیکن انحطاطی اور فرسودہ نظریوں کو مسترد کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ
کہ تاریخ کے ان گذشتہ ادوار میں مادی اقدار کی پیداوار کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور فنی اقدار کی تخلیق بھی ہوتی تھی
اور تاریخ کے معنی محض بادشاہوں اور امراء کی سلطنت، و امارت کی داستان کے نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کے عمل
کے ہیں جو اپنی جسمانی اور ذہنی محنت اور جانفشانی سے زندگی کی مادی، علمی اور فنی اقدار کی تخلیق کرتے تھے۔ بسا
اوقات ان اقدار کی تخلیق میں آزادی خواہوں، محروموں اور مظلوموں کی اس آویزش کی روح بھی ہمیں نظر آتی ہے
جو وہ جابر اہلِ اقتدار کے خلاف کرتے تھے۔ اور بسا اوقات تاریخ کے صفحوں پر خود اہلِ اقتدار کے ایسے افراد نظر
آتے ہیں جن کی سرپرستی میں فلاح اور تہذیب کی قوتوں کو ترقی ہوئی بغیر اس نکتہ کو ذہن میں رکھے ہوئے ازمنۂ وسطیٰ
میں علوم و فنون، لطیفہ، فنِ تعمیر، (موسیقی، رقص، سنگتراشی، فلسفہ، شعر و ادب) اور روشن خیال انسانی
تصورات کا گوناگوں شکلوں میں ابھرنا ہی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ہمارے ماضی کے شاندار تمدن کا یہی
ترکہ ہے جس نے ہمیں تہذیب و انسانیت سے مزین کیا ہے اور جس کے بغیر ہم مستقبل کے اور بھی شاندار تمدن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

(مسلسل)

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

فنِ افسانہ نویسی

قصہ ہو یا کہانی، حکایت ہو یا داستان، افسانہ ہو یا ناول، ان سب کے لکھنے یا کہنے کے کچھ خاص گر ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہانی یا قصہ کہنے میں کیا دھرا ہے بس کہنا شروع کیا اور داستان ختم ہو گئی لیکن ایسا نہیں ہے۔ قصہ اور کہانی تو جگ بیتی بھی ہو سکتی ہے، اگر آپ بیتی بھی آدمی کہتا ہے تو اس میں بھی ایک سلیقہ ایک ڈھنگ ہونا چاہیے، ورنہ اس کا اثر جیسا ہونا چاہیے نہیں ہوگا یعنی اس میں کچھ لطف نہ آئیگا۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہی ہے کہ قصہ یا افسانہ اس طرح کہا جائے کہ سننے یا پڑھنے والے کا دھیان اسی طرف شوق کے ساتھ لگا رہے۔ اگر قصہ یا کہانی پر سامعین یا ناظرین کا دھیان نہ جما تو جب توجہ اور دلچسپی برقرار نہ رہی تو سمجھئے کہ قصہ یا افسانہ بالکل ناکام رہا۔ یہ دلچسپی کیونکر برقرار رکھی جائے؟ سب سے پہلا گر تو یہی ہے کہ اس میں کچھ جدت ہو کچھ نیاپن ہو۔ یہ نیاپن خواہ پلاٹ کا ہو، خواہ کردار کا خواہ مکالمے یا منظر کا۔ جدت کا ہونا بہر حال ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی قسم کی تازگی، ندرت یا انوکھا پن نہ ہوا تو سننے والا اکتا جائیگا۔ اور اس کی دلچسپی یہ سمجھ کر ذرا کم یا ختم ہو جائیگی کہ ارے یہ تو بہت معمولی قصہ ہے۔ اگر آپ کو کوئی بالکل نیا پلاٹ یا کردار وغیرہ نہ سوجھے (کیونکہ بالکل نئی باتیں اور واقعات تو اب دنیا میں شاذ ہی رہ گئے ہونگے) تو یہ کیجئے۔ ادھر ادھر کے پرانے پرانے واقعات کے ٹکڑے اس طرح ملائے کہ وہ مرکب بظاہر نیا معلوم ہو یعنی کم از کم پڑھنے یا سننے والے کو احساس ہو کہ یہ نیا ہے۔ خصوصاً اس نئے پن کے احساس کا افسانے کے خاتمہ پر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہر افسانہ کا خاتمہ ہی دراصل توڑ کا کام انجام ہوتا ہے۔

آپ آجکل کے افسانے پڑھئے تو ان میں ایک دوسری چیز اور نظر آئیگی۔ وہ یہ کہ ندرت ہی ضروری چیز نہیں ہے بلکہ اس میں کسی خیال یا کسی فکر یا مقصد کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے بلکہ اکثر تو یہ خیال یا نصیحت یا فضیحت تمام افسانے پر چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ دراصل ایک اچھے افسانے میں کسی نہ کسی مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے تاکہ افسانہ کا مقصد محض دلچسپی نہ ہو بلکہ اس میں کوئی کام کی بات بھی نکل سکے تو بڑا اچھا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کو کچھ سوچنے اور فکر کرنے پر بھی مجبور کرے۔ مگر ہاں یہ خیال ضرور رکھئے کہ کہیں آپکا افسانہ وعظ و نصیحت کا ایک لکچر بن کر نہ رہ جائے۔ جیسا کہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں عموماً کیا ہے یا کسی مقصد کا کھلا پروپیگنڈہ ہو کر نہ رہ جائے جیسا کہ آجکل بعض ترقی پسند

افسانہ نویسوں کا معمول ہے) بلکہ اصل بات تو دلچسپی کی ہے۔ دلچسپیوں ہی کی فکر میں رہا کر۔ کوئی وہ اگر آپ کھو لا سکیں، چاہے وہ کونین جیسی کڑوی کیوں نہ ہو، تب تو آپ کی اُستادی مسلّم ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی مرکزی خیال آپ کے ذہن میں موجود نہ ہو تو انتظار کیجئے اور انتظار کرتے رہیئے، کسی نہ کسی وقت وہ آئے گا ضرور، اور جس وقت آپ نے اپنا پلاٹ زیب قرطاس نہ کر لیا یا افسانہ نہ لکھ ڈالا تو بس سمجھیئے کہ ہاتھ سے گیا۔ پنسل اور کاغذ تو آپ کی جیب میں ہر وقت رہنا چاہیئے اگر واقعی آپ کو اچھا افسانہ نویس بننے کا شوق ہے۔

سب سے اعلیٰ قسم کی ندرت یا نیا پن تو وہی ہے جو اس بات کا احساس دلائے کہ جو کچھ افسانہ نویس کہہ رہا ہے وہ واقعہ ہماری سچ مچ کی زندگی سے لیا گیا ہے۔ (جیسا کہ پریم چند کے افسانے کرتے ہیں) یہ سچ یا صداقت کا احساس افسانہ کی جان ہے، بغیر اس کے افسانے میں دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی افسانہ نویس ہماری عام معمولی زندگی کو اسی عام اور معمولی انداز میں پیش کر سکے سمجھ لیجئے کہ وہ گڑھ جیت گیا۔ ایسے افسانہ نویس کو استاد کامل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ ہے بہت مشکل، یا بالکل سہل ممتنع کا معاملہ ہے جو دیکھنے میں آسان معلوم ہو اور برتنے میں لوہے لگ جائیں۔

ہمارے بہت سے نئے اور نوجوان افسانہ نویس نقل پر گزران کرنا چاہتے ہیں۔ کسی بڑے افسانہ نویس کی ریس کی کوشش بُری چیز نہیں ہے لیکن اچھی بھی نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنی نظر پیش نہیں کر پاتے۔ اور آپ یقین مانیئے کہ اپنی نظر ہی میں سب سے زیادہ جدت ہوتی ہے۔ ہر آدمی اپنی نظر ہی سب سے زیادہ بھرپور طریقے پر، واضح اور صاف صاف پیش کر سکتا ہے۔ نقل میں یہ بات کہاں ممکن ہے۔ یہاں اپنی نظر سے مراد انانیت نہیں بلکہ انداز بیان ہے جس میں اپنی شخصیت، اپنا مزاج اور طریق فکر بغیر کسی آورد کے در آتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ آپ کے افسانوں کو دلچسپی سے پڑھیں تو ان میں خلوص اور صلاحیت کا مظاہرہ ضرور کیجئے۔ ورنہ آپ محض واقعات کے الٹ پھیر، کرداروں کی قلا بازیوں یا مکالمے کی الٹونیوں یا منظر کے تنوع کے اہتمام میں رہے تو آپ کو کامیابی تو ضرور ہو جائیگی لیکن عارضی اور وقتی۔ یہ افسانے اچھے ضرور ہونگے لیکن ان میں بڑی کشش نہ ہوگی۔ ازل اور ابد کا رشتہ تو صرف خلوص اور سچائی سے قائم ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ فرانس کے مشہور ناول نویس فلابیر نے نوجوان افسانہ نگار موپساں (جو بعد میں خود بھی بہت بڑا افسانہ نویس بن گیا) کو نصیحت کی تھی کہ:۔ "دیکھو دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اپنے اندر ایک رازِ سربستہ رکھتی ہے۔ اس نامعلوم سربستہ راز کو معلوم کرو۔ مثال کے طور پر کسی معمولی درخت کا ذکر کرنا ہے یا کسی معمولی آتش زدگی کا حال بیان کرنا ہے تو اس درخت یا اس آگ کا حال اس طرح لکھو جیسے تم نے کسی درخت یا کسی قسم کی آگ کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ اگر اس طرح لکھو گے تو تمہارے بیان میں جدت پیدا ہو جائے گی"

افسانہ نگار حضرات عموماً کس قسم کی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ افسانوں میں خوبی اور ندرت کی پرکھ کیسے کی جاتی ہے؟ اس کے متعلق بھی دو چار باتیں سن لیجئے۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کا افسانہ اپنے کُلّی یا جزوی تاثر میں نامعقول یا غیر معقول نہ معلوم ہوں۔ یعنی اسے ہم پڑھ کر یا اس کے کسی حصے یا حصوں کو سن کر یہ نہ کہہ سکیں کہ بھئی یہ بات تو خلافِ عقل ہے یا دنیا میں ایسا کہاں ہوتا ہے یا زندگی میں یکسر غیر ممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں افسانہ ایسا ہونا چاہیئے کہ واقعی سچا معلوم ہو۔ ویسے افسانہ تو افسانہ ہوتا ہے۔ لیکن قاری کو محسوس ہو کہ یہ واقعہ ہے۔ حالانکہ ایک اچھی اور متاثر کرنے والی کہانی میں تو سچ سے کچھ تجاوز کرنا بہتر ہی ہوتا ہے۔ لیکن نامعقول بنیادوں پر نہیں، معقول طریقوں سے۔ یعنی اچھے افسانوں کے کردار غالباً معمول سے زیادہ مہربان، زیادہ نیک یا اپنے ماحول سے زیادہ الگ تھلگ نظر آسکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ایسے کردار پیش کریں گے جو انسانی فطرت کے خلاف عمل پیرا ہیں یا پلاٹ کی خاطر بدلتے واقعات کا شکار ہوتے رہتے ہیں، خود اپنے اندر کوئی جان یا سکت نہیں رکھتے تو ایسے کردار سچے نہ معلوم ہوں گے۔

ہمارے نوجوان افسانہ نگار دوسری غلطی عام طور پر یہ کر جاتے ہیں کہ اپنا پلاٹ یا افسانے کا ماحول بہت سپاٹ قسم کا قائم کرتے ہیں۔ یعنی ایسا جس میں کوئی ندرت نہیں ہوتی۔ اور آپ جانیئے کہ جس شخص میں ندرت نہ ہو وہ افسانہ نگاری میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔۔۔

لیکن افسانے کی سب سے بڑی خامی اس وقت رونما ہوتی ہے جب اس میں یکسانی پیدا ہو جائے، یعنی قصہ آگے بڑھتا ہی نہ معلوم ہو، معلوم ہو کہ بس ایک جگہ گھسٹ ہو کر یا قائم ہو کر رہ گیا ہے سننے یا پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جائے۔ لیکن اگر آپ پوچھیں کہ اس خامی کا علاج کیا ہے تو یہ بتانا ضرور مشکل ہے کیونکہ اول تو ناظرین کے مذاق میں خود بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ مذاق عہد بعہد بدلتا بھی تو رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو افسانہ آپ کو بارِ خاطر معلوم ہو رہا ہے وہ مجھے بارِ خاطر نہ معلوم ہو یا ممکن ہے کہ جو افسانہ آج سست، سپاٹ یا گھسٹ معلوم ہو رہا ہے ایک پشت بعد سراہا جانے لگے۔ غالب اور نظیر اکبرآبادی کے کلام کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ غالب اور نظیر کی قدردانی اپنے زمانے میں اتنی نہ ہو سکی جتنی کہ ذوق اور ناسخ کی ہوتی تھی۔ لیکن آج ہم غالب اور نظیر کے سامنے ذوق اور ناسخ کو بھلا دیتے ہیں۔ شروع بیسویں صدی میں رنگین اور تخیلی قسم کے افسانوں کا رواج تھا۔ پریم چند کے افسانوں کی وقعت معمولی، سپاٹ اور سیدھے سادے قصوں کہانیوں سے زیادہ نہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن۔۔۔ بہرحال ہم افسانوں میں اس سستی اور جمود کا علاج اگر کوئی تجویز کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ ان میں عمل اور رفتار پیدا کی جائے۔ عمل اور رفتار کی تجویز کو غلط نہ سمجھ لیجئے گا۔ یعنی اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر وہ کہانی جس میں متواتر نئے نئے مواقع اور عمل دکھائے جائیں، وہی افسانہ بن سکتا ہے یا وہی کہانی بس ناظرین کے دماغ پر چھا کر رہ جائے گی۔ عمل اور رفتار سے مراد صرف یہ ہے کہ کہانی میں کہانی کی دلچسپی ضرور باقی رہے۔

یہ اشتیاق ضرور باقی رکھا جائے کہ آگے کیا ہوا۔ کوئی نہ کوئی دلچسپ بات پیدا ہو کر قصے کو آگے ضرور بڑھاتی رہے۔

چوتھی غلطی جو عام طور پر افسانوں میں نظر آتی ہے، وہ یہ کہ افسانہ نگار بعض اوقات جن چیزوں کو پیش کرتا ہے خود بھی ان سے واقف نہیں ہوتا۔ مثلاً جس مقام یا ماحول کو آپ فسانے میں دکھا رہے ہیں اس سے بالکل یا بہت کم واقف ہوں۔ یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ غالباً سنہ ۴۲ء یا سنہ ۴۳ء میں ایک صاحب اپنا ایک افسانہ میرے پاس لائے تاکہ میں اُسے اپنے رسالے میں شائع کر دوں (اس زمانے میں مَیں رسالہ جامعہ کا ایڈیٹر تھا) انہیں اپنی افسانہ نگاری پر کچھ ناز بھی تھا۔ اور ان کے اکثر افسانے دیگر رسالوں میں شائع ہو چکے تھے لیکن جو افسانہ وہ میرے پاس لائے تھے اس میں لکھنؤ کے مشہور محلہ امین آباد کا ماحول پیش کیا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ امین آباد کے چوراہے سے کچھ ایسی سڑکیں انہوں نے نکال دی تھیں اور ان کی کچھ ایسی سمتیں مقرر کی تھیں جو محض فرضی اور خیالی تھیں۔ ان کی اس واقعاتی غلطی پر انہیں آگاہ کیا گیا۔ فرمانے لگے کہ افسانہ تو افسانہ ہی ہوتا ہے، اس میں یہ سب جائز ہے۔ اتفاق سے وہیں دفتر میں ایک اور رسالہ رکھا ہوا تھا۔ جس میں ایک خاتون کا بہت اچھا افسانہ ان دنوں شائع ہوا تھا۔ اتفاق سے یہ خاتون اسی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھیں جہاں موصوف پڑھ رہے تھے۔ بتایا گیا کہ دیکھئے افسانہ یوں لکھا کیجئے جیسے یہ خاتون لکھتی ہیں۔ چڑھ گئے اور اس افسانہ نگار خاتون کی افسانوی خامیاں بیان کرنے لگے۔ ——— دو تین سال بعد معلوم ہوا کہ صاحبِ موصوف نے اسی خاتون سے عقد کر لیا۔ یہاں یہ ضمنی واقعہ ذرا طویل ہو گیا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ اپنے افسانوں میں واقعاتی غلطی نہ کریں ورنہ ایسے افسانے مضحک ہو کر رہ جائیں گے، اور ناواقفیت اور کم واقفیت سے آپ کی حقیقت پسندی کا بھانڈا پھوٹ کر رہ جائے گا۔

نئے افسانہ نگاروں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض باتیں بذاتِ خود مقبول نہیں ہوتیں۔ افسانہ چاہے جتنا اعلیٰ پیمانے کا اور اعلیٰ تکنیک کا کیوں نہ ہو۔ بہت کم رسالے ایسے ہونگے جو پریشان کن یا گھنونے قسم کے افسانے شائع کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ فرض کیجئے جنوں کا موضوع ہے اگر یہ افسانے میں لایا جائے تو شاذ ہی مقبول ہو سکے۔ لکھنے والا چاہے بڑا استاد ہی کیوں نہ ہو، خشک یا مایوس کن نقطۂ نظر پسند نہیں کیا جاتا۔ یا ایسی ٹریجڈی جس میں انتشار کے بعد سکون نہ پیدا کیا گیا ہو، کسی اچھے رسالے میں جگہ نہ پا سکے گی۔ مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں مَیں نے ایسا ہی ایک حزنیہ افسانہ لکھا تھا جس میں ایک دیہاتی عورت کو اس طرح دکھایا گیا تھا کہ وہ گرمی اور لُو اور پیاس کی شدت کی وجہ سے تڑپ رہی تھی، گھسٹتے گھسٹتے کسی کنوئیں پر پہنچ گئی تھی لیکن پھر بھی پانی نہ پی سکی۔ اور جان بحق تسلیم ہو گئی۔ شائع ہو جانے پر جب اس افسانے کو میں نے پڑھا تو یہی جی چاہتا تھا کہ یہ تکلیف دہ افسانہ یا تو میں نہ لکھتا یا شائع نہ ہو سکتا۔ ناظرین عموماً تسکین دہ، پر امید اور خوش کن افسانے پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے اچھے رسالوں کے اڈیٹر کبھی اپنے ناظرین کو کرب و تکلیف دینا نہ چاہیں گے۔ حزنیہ افسانوں میں درد و کرب کی تکلیف دکھا سکنا قوتِ تحریر و بیان کو ضرور

ظاہر کرسکتا ہے لیکن افسانے کا خاتمہ بھی اگر اسی حالت میں ہو جائے تو ایسا حزنیہ افسانہ بے مقصد ہی ٹھہرتا ہے۔

شعر کی طرح افسانہ ایک نازک قسم کی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شعر کی طرح افسانہ کا تار و پود بھی بڑی محنت اور اپنی قلم موزونیت کے ساتھ بُن لیا جائے پھر بھی اس میں اس شے کی کمی رہ جائے جسے شاعری کی دنیا میں "چیزے دگر" کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر افسانہ کی سب سے بڑی خامی بلکہ ناقابلِ معافی و تلافی خامی وہ ہوتی ہے جب اس میں کوئی کسک کوئی تڑپ محسوس نہ ہو۔ اور اس طرح اثر یا تاثیر کی کوئی کیفیت نہ پیدا ہو سکے۔ اسی طرح وہ افسانے بھی جن میں عقلیت بہت زیادہ بگھاری گئی ہو اور اس وجہ سے ان کا سمجھنا آسان نہ رہا ہو یا جن میں ذہن کی کاوش کے خونِ جگر کا فقدان ہو پبلک اور اچھے رسالوں کے مشغول اڈیٹروں، دونوں کے نزدیک لائقِ توجہ نہیں ٹھہرتے ایسی کہانیاں جن میں جذبات کی خشکی ہو یا انسانی فطرت کی عکس کشی کا شائبہ بھی نظر نہ آئے مقبولِ عام ہونا تو درکنار قبولِ خواص بھی نہیں ہو سکتیں۔

ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرض کیجئے، آپ نے اپنی کہانی یا کہانیوں کی جائے وقوع کسی اجنبی یا دور دراز کے ملک میں دکھلایا ہے۔ جہاں کے حالات، عادات، رسوم و رواج، وہاں کے تمدن یا معیشت وغیرہ سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں تو ایسے افسانے بھی زیادہ مقبول نہیں ہو پاتے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی فطرت ہر جگہ ایک ہی ہے خواہ وہ دہلی ہو یا ٹمبکٹو لیکن اگر آپ ٹمبکٹو یا ہنولولو میں واقع کوئی کہانی لکھیں گے تو جگہ جگہ اس میں آپ کو تشریحی نوٹ بھی دینے کی ضرورت پڑے گی تاکہ پسِ منظر میں پیش کردہ وہاں کی عام زندگی کے طریقے آپ کے ناظرین پر بخوبی واضح ہو سکیں، اور یہ باعثِ طوالت ہی نہیں بلکہ ناظر کے لئے پریشان کن بھی ہے۔ عام طور پر انسان اپنے ارد گرد کے لوگوں کی کیفیات اور مسائل سے جو دلچسپی اور ہمدردی رکھتا ہے اور انہیں جتنی آسانی سے سمجھ سکتا ہے، دور دراز کے مقامات کے لوگوں سے نہیں ــــ ممکن ہے آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق نہ ہو لیکن جب آپ اس کو برت کر دیکھیں گے تو شاید آپ اس رائے سے اتفاق کر سکیں گے۔

آخر میں ایک دلچسپ غلط فہمی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو ہمارے اکثر نئے افسانہ نگاروں کو بیماری کی طرح لاحق ہو جاتی ہے اور وہ غلط فہمی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اگر کسی افسانہ کی بنیاد براہِ راست رکھی گئی، تب ہی وہ پسند کیا جا سکتا ہے یا مقبول ہو سکتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی کہانی شاذ ہی مقبول ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہماری اپنی زندگی منظم پلاٹوں کی صورت میں نہیں کٹتی۔ اس کے علاوہ ہماری واقعی زندگی میں سینکڑوں فضول قسم کی باتیں اور چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کو افسانے میں قطعی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً ہر آدمی صبح دیر یا سویرے سے اٹھتا ہے۔ حاجتِ ضروری سے فارغ ہوتا ہے۔ اگر داڑھی نہیں رکھتا ہے تو شیو کرتا ہے۔ اپنے ناشتے کا انتظام کرتا ہے یا اس کے متعلق باورچی اور نوکروں کو ہدایات دیتا ہے یا ہوٹل سے منگواتا ہے۔ سگریٹ یا پان سے شغل

کہتا ہے کبھی کبھی غیر متعلق لوگوں سے ملتا ہے یا ایسے لوگ اس سے ملنے آجاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں ہم افسانے میں بیان کرنے نہیں بیٹھ جاتے۔ بلکہ ایسی چیزوں کو نکال دیتے ہیں۔ یاد رکھیئے کہ اچھا افسانہ زندگی کا فوٹو نہیں ہوتا افسانہ زندگی کی عکاسی ضرور کرتا ہے لیکن ایک فوٹوگرافر کی طرح نہیں بلکہ ایک مصور کی طرح۔ ہماری اپنی واقعی زندگی تصور کے مقابلے میں زیادہ ناقابلِ یقین، زیادہ ناقابلِ فہم، زیادہ مبہم، پیچیدہ، غیر منطقی، بے تکی اور بے ترتیب ہوتی ہے۔ افسانے میں ان تمام بے جان مٹی کے بے شمار قسم کی چیزوں کا فوٹو کھینچنا افسانے کو افسانہ نہ بنا سکے گا۔ اسی طرح مکالموں میں بھی ہم کو صرف واقعی زندگی کے مکالموں کی فوٹوگرافی نہیں صرف تصویر کشی کرنا چاہیئے۔ مناسب انتخاب، کانٹ چھانٹ سے مکالموں کو آراستہ و پیراستہ کیجیئے ورنہ آپ کے افسانوں کے مکالمے بے تکے ہو کر رہ جائینگے۔

حقیقت یوں ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے افسانہ نویس کو استادِ فن ہونا چاہیئے بلکہ ایک فنکار کیونکہ ایک اچھی کہانی کی ساخت دراصل صناعی اور مرصع سازی کا کام ہے۔ مشہور امریکن افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو نے افسانہ کی تعریف ان الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

> "افسانہ کی تعریف قطعی طور پر تو نہیں، ہاں ایک مفید تجویز کے طور پر یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جو کسی صورتِ حال کا احساس نہیں بلکہ تاثر ڈالنے کے لئے شروع کی جاتی ہے اور اولاً ایک تمہید سے، پھر استادانہ فقروں سے اس مقصد یا تاثر یا انجام کو اشاروں اشاروں میں بتلا دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انجام ابھی ظاہر نہیں کیا جاتا۔ کہانی فضا اور سماں کو قائم رکھتے ہوئے بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ توڑ کا وقت آجاتا ہے۔ اور انجام بالکل غیر متوقع اور ڈرامائی طور پر ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی خاتمے سے ذرا پہلے چند فقرے یا جملے ایسے لکھ دیئے جاتے ہیں جن سے ناظرین کے اضطراب امید و بیم میں ذرا سا سکون پیدا ہو جائے، پھر قصہ یک لخت ختم کر دیا جاتا ہے۔"

اگر آپ متذکرہ بالا تعریف پر غور کریں گے تو واضح ہو جائیگا کہ افسانہ نویسی کوئی آسان کھیل نہیں ہے اس کی ساخت اور پرداخت دونوں کے لئے ایک شاعر کے تصور، ایک نقاد کے دماغ اور ایک انجنیئر کی صلاحیتِ فن درکار ہوتی ہے۔ اس میں ناول کی طرح "کثرتِ جلوہ" سے کام نہیں لیا جاتا۔ ایجاز و اختصار، جامعیت اور بلاغت کے علاوہ تاثر کا برابر ذہن میں رکھنا اشد ضروری ہے۔ کبھی کبھی تو ڈراموں کی طرح افسانوں میں بھی وحدتِ زمان و مکان کو باقاعدہ پیشِ نظر رکھا جاتا ہے لیکن اکثر افسانوں میں ایک بڑی خامی یہ نظر آتی ہے کہ یا تو تمہید طولانی ہو جائیگی اور پیچ کا بیان بہت مختصر۔ ابتدا، وسط اور خاتمے میں قصیدہ کی طرح ایک معقول تناسب ضرور پیشِ نظر چاہیئے۔

گجر

افسانہ کسی قسم کا ہو، اس کا انجام یا خاتمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر انجام یا خاتمہ کمزور قسم کا ہو یا ایسے الفاظ یا انداز میں پیش کیا گیا ہو جو کچھ اثر، کچھ کھٹک نہیں رکھتے تو سمجھ لیجئے کہ پورے افسانے پر حرف آگیا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض اچھے اور محنت اور کاوش سے لکھنے والے افسانہ نگاروں کے افسانے محض کمزور خاتمے کی وجہ سے اپنا تمام شروع کا زور اور در و بست کھو بیٹھتے ہیں۔ ٹو نے ایک موقع پر خوب لکھا ہے کہ اچھے اور زوردار افسانے کو دراصل الٹا لکھا جانا چاہیئے یعنی افسانہ نویس انجام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے گویا پیچھے قدم بڑھاتا چلا جائے سب زیادہ موثر انجام وہ ہوتا ہے جو غیر متوقع ہو۔

اسی طرح کسی افسانے میں جو توڑ کا مقام ہوتا ہے یا جسے اس کی انتہائی اٹھان (کلائمکس) کہنا چاہیئے اسے بھی پہلے سے سوچ لینا چاہیئے اور پورے افسانے کی بنیاد اسی پر قائم کرنا چاہیئے۔ (پریم چند یہی کیا کرتے تھے) او افسانے کو شروع کر کے اسی مقام پر لانا چاہیئے تاکہ وہ مقصد جو افسانہ نگار اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے واضح ہو سکے اور تا ہو جائے۔ یہ یاد رکھئے کہ آپ لفظیات آرائی اور انداز بیان کے چاہے جتنے جوہر کیوں نہ دکھائے ہوں، اگر یہ نقطۂ عرو موثر نہیں ہے تو افسانہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جائے گا۔

ایک بات اور پیشِ نظر رکھیئے۔ وہ یہ کہ اپنے افسانے کو، جہاں تک ہو سکے، پہلے تو خوب اچھی طرح سوچ لیجئے پھر جب لکھنے بیٹھئے تو ایک ہی نشست میں لکھ ڈالنے کی کوشش کیجئے کیونکہ اس طرح لکھنے سے اس میں آپ کے موڈ وحدت برقرار رہے گی اور افسانے میں ایک ہی موڈ کا قائم رہنا بڑی ضروری چیز ہوتا ہے۔

ٹکنیک یا فن افسانہ نگاری کی رُو سے ہر قسم کے افسانے کا آغاز بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ آغاز ایسا رکھا جائے جو پڑھنے والے یا سننے والے کے دھیان فوراً اپنی طرف مرکوز کرلے آغاز میں آپ پہلے کوئی دلچسپ فقرہ یا تعارفی دلچسپ فقرے، اپنے یا اوروں کے تجر یا مشاہدے کا خلاصہ دے سکتے ہیں یا فوراً کہانی شروع کر سکتے ہیں۔ غرض کہ کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیئے جس سے والا فوراً متوجہ ہو جائے اور پھر آگے بڑھتی ہوئی کہانی کے مطالعے میں محو ہو جائے۔

ہر اچھی کہانی میں کسی نہ کسی واقعے، حادثے یا تجربے کا بیان تو ہوتا ہی ہے لیکن اس کی بھی احتیاط رکھ ایک افسانے میں کئی ایک افسانے جمع نہ ہو جائیں۔ اس سے کہانی کے وحدتِ تاثر پر بھی اثر پڑے گا یعنی پڑھنے کا ذہن بھی یک سُو نہ ہو سکے گا اور اس کے دل و دماغ پر وہ "چوٹ" نہ پڑ سکیگی جو محض ایک واقعے سے آپ چاہتے تھے۔

اچھا پلاٹ کیا ہے؟ بقول ارسطو کے "ایک گرہ ڈالنا اور پھر اُسے کھولنا" یعنی ایک پیچیدگی پیدا اور پھر اس پیچیدگی کو دور کرنا۔ لیکن اس بست و کشاد کے کھیل کو اگر آپ بہت دقیق کر دیں گے اور بہت

لے جائیں گے کہ ذہن سرتاسر اُلجھا جائے تو پڑھنے والا شروع یا بیچ ہی میں بہت گھبرا جائیگا۔ بالفاظ دیگر اپنے پلاٹ کو بہت
پیچیدہ نہ بنائیے۔ دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے اشاروں اور کنایوں سے ضرور کام لیجئے کہ قاری کا ذہن اس بات کا جویا رہے
آئندہ کیا ہوگا۔ جاسوسی افسانوں میں تو اس پیچیدگی کے جال کو زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے لیکن دیگر قسم کے افسانوں
میں احتیاط رکھیئے کہ جال جی کا جنجال نہ بن جائیں۔ جب جال کی گرہیں کھول دی جائیں تو قاری یہ نہ کہے کہ یہ نتیجہ فضول یا
غیر منطقی، خلافِ عادت اور خلافِ فطرت تھا۔ قاری کے ذہن کو انتظار میں رکھنا ایک بڑا فن ہوا کرتا ہے۔ اس انتظار
کو ایک مناسب حد تک طول دیجئے تاکہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے اور جب اس کاوشِ انتظار کو ختم کیجئے
تو اس فطری اور قدرتی طریقے پر کہ بے جا یا سراسر مصنوعی معلوم نہ ہو۔

ہر افسانہ میں مکالمہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ زیادہ تر افسانے مکالمے کے ذریعہ ہی پروان چڑھتے ہیں۔
اس لئے مکالموں کے سلسلہ میں یہ ضرور خیال رکھیئے کہ وہ مصنوعی یا بے جا طور پر سرتاسر جذباتی نہ ہوں۔ آپ نے آغا
حشر اور ان کے عہد کے ڈرامہ نگاروں کے مکالمے دیکھے ہونگے، کس قدر جذباتی اور مصنوعی ہیں۔ ایسی سستی اور سطحی جذباتیت
یا تصنع کو اپنے افسانوں کے مکالموں میں جگہ نہ دیجئے بلکہ کوشش یہ کیجئے کہ تصنع کا کہیں شائبہ بھی نظر نہ آئے۔ ہر گفتگو
اپنے انداز اور طور طریقے سے فطری اور قدرتی معلوم ہو۔

آخر میں نئے نئے افسانہ نویسوں کو ایک خاص مشورہ بھی دینا ہے کہ اگر آپ اچھے افسانہ نویس بننا چاہتے
ہیں تو چند بڑے بڑے افسانہ نویسوں کے چند افسانوں کو ذرا اپنی زبان اور اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کیجئے۔
دیکھیئے، آپ کس قدر کامیاب یا ناکامیاب ہوتے ہیں۔ اس طرح مشق کرنے سے کچھ نہ کچھ تو آپ کے پلے ضرور پڑیگا۔
ممکن ہے بعض اچھے افسانہ نویسوں میں آپ کو کہیں کہیں تصنع بھی نظر آجائے اور در اصل اگر غور کیا جائے تو وہ
افسانے مصنوعی اور فرضی تو ہیں ہی۔ کوئی افسانہ ہوا افسانہ ہی تو ہوتا ہے حقیقت تو نہیں ہوتا۔ لیکن ہر اچھا افسانہ
حقیقت معلوم ضرور دیتا ہے۔ افسانویت تو درحقیقت ایک کوشش ہے حقیقت تک پہنچنے کی۔ ہم صداقت
کو ایک جھوٹ یا فریب کے ذریعہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک مجازی زینہ
تیار کرتے ہیں۔ اس معنی میں افسانہ بذاتِ خود ایک مصنوعی ہیئت ہے، اور ہر فنِ لطیف اس طرح کسی نہ کسی
حیثیت سے فرضی ہی قرار پائے گا۔ ہر انسانی فن ایک نقل ہوتا ہے، اصل نہیں۔ اس لئے اگر کسی بڑے افسانہ
نویس کا شاہکار آپ کو کہیں کہیں مصنوعی یا فرضی ہونے کا احساس دلائے تو اس سے بیزار نہ ہو جیئے کیونکہ
افسانہ بذاتِ خود ہی بڑی مصنوعی صنعتِ ادب ہے۔ کمالِ فن یہ ہے کہ نقل اصل معلوم دینے لگے۔ ہر فن کار
یہی نقل کو اصل کا دھوکا یا اصل کا نمائندہ بنانے ہی کی کوشش کرتا ہے۔ آپ بھی اسی کی کوشش کیجئے اور
دیکھیئے کہ کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں ٭

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

اردو کی عشقیہ مثنویاں

اقسام مثنوی میں عشقیہ یا بزمیہ مثنوی کا درجہ سب سے اونچا ہے اگرچہ مثنوی بحیثیت صنف اپنی خصوصیات اور جامعیت کی وجہ سے مشکل ترین خیال کی جاتی ہے اور ایک اچھے فنکار ہی کا زورِ قلم اس کا حق ادا کرسکتا ہے۔ لیکن بزمیہ مثنوی مادی دنیا کی کرشمہ سازیوں اور دل کی دنیا کے نقشہائے رنگ رنگ کا ایک پیچیدہ مجموعہ ہوتی ہیں۔ اور اس میں حسن و عشق کی داستان کے نشیب و فراز اور الجھاؤ ایسے ہمت شکن مقامات پیش کرتے ہیں جہاں ایک فن کار کے جوہروں کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا محض ایک پرگو شاعر و فنکار اسے بہ صناعی تمام پیش نہیں کرسکتا بلکہ ایک چابکدست فنکار ہی اپنی خلاقی کا ثبوت دے کر اس سے انصاف کرسکتا ہے۔

بزمیہ مثنوی حسن و عشق کی داستان ہوتی ہے۔ لہٰذا فنی نقطۂ نظر سے اس میں قصہ یا واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور ایک فنکار کے کمال کا زیادہ تر دار و مدار اسی کے نباہنے پر ہوا کرتا ہے۔ قصہ کہانی کی ہر دلعزیزی محتاج بیان نہیں اسے ارتقائے انسان کی اوّلیں منزل سے اہمیت حاصل ہے اور رہتی دنیا تک اس کی اہمیت و ضرورت کم نہ ہوگی اگرچہ قصہ، کہانی کو پردازِ تخیل کی کرشمہ سازیاں کہہ کر اس کی قدر و قیمت گھٹا دی جاتی ہے لیکن اقوام و ممالک کی تاریخ کے مرتبین اس کی اعانت و استعانت کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔ فلسفہ و نفسیات کے ماہرین اس سے اپنے دعوے کی سند لیتے ہیں۔ ذہنی ترقیوں اور تمدنی مسائل کی جانچ پڑتال کے لئے اسی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ غرض قصہ کہانی تاریخ عالم کے اوراقِ پریشاں ہیں۔ اس کی ہمہ گیری سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ سیاست، مذہب اخلاق، فلسفہ اور حکمت وغیرہ سکھانے کا بہترین ذریعہ اسی کو سمجھا گیا ہے۔ ادب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قصہ کہانی کا فنی پہلو بھی ترقی کرتا گیا۔ اور یہ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ ایسی مختلف شکلوں میں رونما ہوا۔ بزمیہ مثنوی بھی اسی قبیل سے ہے۔ اس کو بھی اس کی تکنیک نے دوسری اصناف سے علیحدہ کردیا ہے۔ ڈرامہ اور مثنوی میں وہی فرق ہوتا ہے جو ناول اور ڈرامے میں یا کھیلے جانے والے ڈرامے اور نثری ڈرامے میں پایا جاتا ہے۔ کھیلے جانے والے ڈرامے میں جہاں ہماری قوت سامعہ مصروف کار ہوتی ہے وہاں قوتِ باصرہ بھی کھیل کی گتھیوں کو ہمارے دل کی تہہ تک پہنچانے میں معاون ہوتی ہے۔ لہٰذا ڈرامہ نویس کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے

کہ اس کا شاہکار جتنا فردوسِ گوش ہوتا ہے اتنا ہی جنتِ نظر بھی ہو، لیکن نثری ڈرامے میں تمام حرکات و سکنات اور مناظر کو اس خوبی سے صوت میں منتقل کر دیا جاتا ہے کہ قوتِ باصرہ کی کمی بھی پوری ہو جائے۔ اور قوتِ سامعہ پر بوجھ بھی نہ پڑنے پائے۔ اسی طرح ایک مثنوی نگار کو ناول نگار کی طرح ایسی ہر کمی کو پورا کرنے کی غرض سے قلمی تصویریں بنانی پڑتی ہیں۔ اور مزید برآں اسے نظم کے تمام اصولوں کی پابندی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی کا درجہ ناول سے بھی اونچا نظر آتا ہے۔

چونکہ ڈراما، ناول، افسانہ، مثنوی وغیرہ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں، اس لئے ان کے اجزائے ترکیبی بھی مشترک ہیں۔ قصّہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، زبان، زمان و مکان، ڈرامائی کارناموں کے ضروری عناصر ہیں۔ ان عناصر کے حسن و قبح سے ہر شخص تھوڑا بہت واقف ہے۔ لہٰذا ان کی تفصیلات کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایک صاحبِ کمال ان ہی عناصر کو ترتیب دینے کے لئے اپنی فنی تخلیق کو چند حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک قصہ، تمہید، واقعات، تعویق، عروج، انکشاف وغیرہ کی پیچیدہ راہوں سے گزرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی ہر ڈرامائی کارنامے کی ایک عام کسوٹی ہے جس پر مثنوی بھی کسی جا سکتی ہے۔

صنفِ مثنوی اردو ادب میں ادبی تشکیل کے زمانے سے موجود ہے۔ ابتدائی دور کی مختصر صوفیانہ مثنویاں س کی شاہد ہیں۔ اردو ادب کا عہدِ طفلی ابھی خانقاہوں ہی میں گزر رہا تھا کہ اس کی خوش قسمتی سے سلاطینِ بیجاپور اور گولکنڈہ میں سے چند اس زبان کے چاہنے والے پیدا ہو گئے جن کی نظرِ عنایت سے زبان کو سرکار دربار میں باریابی حاصل ہو گئی۔ اس ری تعلق کی وجہ سے جہاں غزل یا قصیدہ اپنے ارتقائی مدارج طے کرنے لگے وہاں مذہبی مثنویوں کے ساتھ ساتھ ینویوں کا بھی آغاز ہوا۔ امامِ غزل ولیؔ سے لے کر دورِ جدید تک ادھر کے ہر دور میں اگرچہ اساتذۂ فن نے زیادہ تر ب غزل کو اپنے فنی کمالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن بایں ہمہ صنفِ مثنوی کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ہر دور میں بیسیوں یاں اس صنف کی نمائندگی کرتی ہیں جن میں بزمیہ مثنویاں سرِ فہرست نظر آتی ہیں اور ان میں بعض کو تو کلاسکی ہونے کا فخر حاصل ہے۔

تاجدارانِ دکن کا عہدِ حکومت اردو ادب کے لئے بہت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔ اور خصوصاً بزمیہ یوں کا تو یہ زرّین دور تھا۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے دکن میں ایسے ایسے باکمال اہلِ فن پیدا ہوئے کہ جن کی ہر جنبش نے صنفِ مثنوی کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ اگرچہ شمالی ہند میں بزمیہ مثنوی نے ارتقاء کی دو چار منزلیں ایسی طے کیں ر منزل پر ایک غیر فانی شاہکار پایا جاتا ہے تاہم دکن کی مثنویاں اگر ان سے بلند مرتبہ نہیں تو کسی طرح کم درجہ بھی ساہیں۔

بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۳۷ھ کے عہد میں ایک شاعر مقیمی گزرا ہے اس کی دو مثنویاں "چندر بدن و ماہیار" اور "سو مہار" یادگار ہیں "چندر بدن و ماہیار" اس کا شاہکار ہے اس کا سنِ تصنیف سنہ ۱۰۳۵ھ اور سنہ ۱۰۴۰ھ کے درمیان ہے۔ یہ مثنوی اپنے قصّے کی وجہ سے بہت مقبول تھی قصّہ طبعزاد ہے اور ڈرامائی اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے بھی مکمل ہے۔ اس کی زبان اور انداز بیان سے مصنف کی غیر معمولی قابلیّت ظاہر ہوتی ہے۔ مقیمی کے کارنامے سے متاثر ہو کر اس کے ایک ہم عصر شاعر امینؔ نے بھی ایک مثنوی "بہرام و بانوئے حُسن" لکھنا شروع کی مگر یہ نامکمل رہ گئی۔ اس کو ایک اور شاعر دولتؔ نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ قصّہ ایران کے شاہ بہرام گور کے قصوں سے لیا گیا ہے۔ محمد عادل شاہ (سنہ ۱۰۳۷ھ تا سنہ ۱۰۶۷ھ) کا ایک درباری شاعر ملک خوشنود بھی ایک بلند پایہ مثنوی نگار تھا۔ اس کی دو مثنویاں "ہشت بہشت" اور "یوسف زلیخا" پائی جاتی ہیں۔ دونوں مثنویاں امیر خسرو کی مثنویوں کے ترجمے ہیں۔ علی عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۰۶۷ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ) کو اردو سے بڑا شغف تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ شاہیؔ تخلص کرتا تھا۔ اس کا دربار باکمال شاعروں سے بھرا ہوا تھا۔ شاعر بے بدل نصرتیؔ اسی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ نصرتیؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ رزمیہ مثنوی "علی نامہ" کے علاوہ ایک بزمیہ مثنوی "گلشنِ عشق" (سنہ ۱۰۲۸ھ) اس کی شاعرانہ لیاقتوں کی روشن دلیل ہے۔ "گلشنِ عشق" میں کنور منوہر اور مدمالتی کی عشقیہ داستان ہے۔ یہ ڈرامائی کارنامہ ہر پہلو سے کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ نصرتیؔ نے اپنی فنی قابلیت سے دکن میں بزمیہ مثنوی کا معیار بلند کر دیا۔ بیجاپور کے عہد حکومت کا آخری شاعر ہاشمی ہے۔ اس نے سنہ ۱۰۹۹ھ میں "یوسف زلیخا" تصنیف کی۔ یہ مثنوی صرف قصّے کے لحاظ سے نہیں بلکہ زبان اور اس کے ہندی ماحول کے لحاظ سے بھی کافی شہرت رکھتی ہے۔

گولکنڈے پر قطب شاہی خاندان سنہ ۹۱۶ھ تا سنہ ۱۰۹۶ھ حکمران رہا۔ اس خاندان کا پانچواں فرمانروا (سنہ ۹۸۹ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ) اپنے ہم عصر علی عادل شاہ ثانی والئی بیجاپور کی طرح بڑا صاحبِ ذوق اور اردو نواز تھا۔ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کے بعد محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر گزرے ہیں۔ ان سلاطین کے عہدِ حکومت میں چند ایسے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں جن کا نام تاریخ ادب میں کبھی فراموش نہیں کئے جائیں گے۔ محمد قلی کا درباری شاعر وجہیؔ تھا۔ وجہیؔ ایک شاعر کی حیثیت سے ہی عزت کا مستحق نہیں ہے بلکہ نثر میں بھی اسکی انشا پردازی مسلّم ہے۔ مثنوی "قطب مشتری" (سنہ ۱۰۱۸ھ) وجہیؔ کی غیر معمولی قابلیّت اور شاعرانہ لیاقت کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ محمد قلی کے عشق کی داستان ہے۔ اس میں داخلی کے علاوہ خارجی شاعری کے بھی بے نظیر مرقعے موجود ہیں۔ قصہ طبعزاد ہے اگر اس کو دکن کا پہلا طبعزاد قصّہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ مقیمیؔ کا طبعزاد قصّہ "چندر بدن اور ماہیار" بھی اس کے بعد آتا ہے۔ اس کا بلند معیار شاہکار بعد میں آنے والوں کے لئے سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ وجہیؔ کا ایک

گجر

ہم عصر شاعر احمد گزرا ہے۔ اس نے لیلیٰ مجنوں کا قصہ منظوم کر کے بزمیہ مثنویوں میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ سلطان عبداللہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے غواصی اور ابن نشاطی، مُلا وجہی اور نصرتی کے ہم پلہ شاعر ہیں۔ غواصی کی مثنویاں "سیف الملوک بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) ادب میں بہت اونچا درجہ رکھتی ہیں۔ اوّل الذکر کا ماخذ الف لیلیٰ کی ایک کہانی ہے۔ یہ قصہ فارسی کے ذریعہ اردو میں آیا ہے۔ "طوطی نامہ" . . . . سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی فارسی سے اردو میں منتقل ہو کر آیا ہے۔ ان شاہکاروں کو کلاسیکی ادب کا درجہ حاصل ہے۔ غواصی کے معاصر ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" بھی ایک بلند مرتبہ بزمیہ مثنوی ہے۔ "پھول بن" فارسی مثنوی "بساطین" کا مجموعہ ہے۔ ہر لحاظ سے "پھول بن" غواصی، وجہی اور نصرتی کے کارناموں کے دوش بدوش ہے۔ یہ مثنوی بھی قطب شاہی دور کے طرزِ معاشرت کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک شاعر طبعی بھی گولکنڈہ کے اساتذۂ فن میں سے تھا۔ ایک بزمیہ مثنوی "بہرام و گل اندام" (سنہ ۱۰۸۱ھ) اس کی یادگار ہے۔ اس کا قصہ ایران کے بہرام گور کے قصوں سے ماخوذ ہے اس دور کے شاعر جنیدی مصنف "ماہ پیکر" (سنہ ۱۰۶۱ھ) اور غلام علی مصنف "پدماوت" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ "پدماوت" کا قصہ بڑی شہرت کا مالک ہے۔

دکن میں عہدِ مغلیہ میں اگرچہ مذہبی مثنویوں کی طرف شعرا زیادہ متوجہ نظر آتے ہیں تاہم چند بزمیہ مثنویاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان مثنویوں میں غلام قادر صمصامی کی "سرو و شمشاد" [۹] (قبل سنہ ۱۱۷۵ھ) تجلی کی "لیلیٰ مجنوں" [۱۰] (سنہ ۱۱۹۰ھ)، ناصی کی "نوبہارِ عشق" [۱۱] (سنہ ۱۲۱۱ھ) اور شفیق کی "تصویرِ جانان" [۱۲] قابلِ ذکر ہیں۔ صمصامی نے "سرو و شمشاد" کا معاشقہ منظوم کیا ہے۔ "نوبہارِ عشق"، "خسرو شیریں" کا ترجمہ ہے اور "تصویرِ جاناں" میں طبعزاد قصہ ہے۔

گجرات میں اردو ادب کے تشکیلی دور سے مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ تیرہ سو ہجری کے بعد تک ملتا ہے۔ گجرات کا تمام مثنوی ادب مذہب و اخلاق تک محدود ہے۔ اگرچہ دکن میں صوفیاء کے دور کے بعد تاجدارانِ دکن کے عہد میں بیسیوں معیاری بزمیہ مثنویاں لکھی گئیں جن کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی مگر گجرات نے اس سے بالکل اثر نہیں لیا۔ اس کا ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شعراء کو سرپرستی حاصل نہیں ہی۔ دوسرے ابتدائی دور یعنی صوفیائے کرام کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے مذہب و تصوف کے پرچار کا

---

۹ اردو مثنوی کا ارتقاء: صفحہ ۱۰۱ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ۱۰ تذکرۂ اردو مخطوطات: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صفحہ ۳۴۵

۱۱ تذکرۂ اردو مخطوطات: صفحہ ۹۳ ۱۲ اردو مثنوی کا ارتقاء: صفحہ ۱۰۱

کام سنبھالا۔ اور انہوں نے ادب کے ذریعہ سے صرف مذہب کی تبلیغ اور اخلاق آموزی کو افضل خیال کیا۔ اگرچہ بارھویں صدی کے نصف اوّل میں دو ایسے شاعر ملتے ہیں جنہوں نے "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" کے قصے منظوم کئے ہیں لیکن ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تصوّف کے زیرِ اثر لکھی گئی ہیں۔ جہاں تک بزمیہ مثنویوں کا تعلق ہے۔ گجرات میں اب آٹھ دس مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ ان میں گجرات (گودھرا) کا محمد امین کافی شہرت کا مالک ہے۔ اس نے سنہ ۱۰۹۸ھ میں "یوسف زلیخا" تصنیف کی ہے۔ شاعر نے چونکہ قصہ ہندی ماحول میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہ اس زمانے کی طرزِ معاشرت کی عکاسی کرتی ہے۔ مثنوی کم و بیش چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ احمد آباد گجرات کے ایک بہت پرگو صوفی منش شاعر رحمت اللہ رحمت کی ایک مثنوی "لیلیٰ مجنوں" ملتی ہے۔ اس کا سنِ تصنیف (سنہ ۱۱۵۰ھ) ہے۔ گجرات کا ایک شاعر صدیق ہے۔ اس نے ۱۱۵۲ھ میں ایک مثنوی "بہرام و زہرہ" لکھی۔ ایک فرضی قصہ شاہِ بنگالہ کے شہزادے اور اس کے وزیر کی لڑکی کے معاشقے سے تعلق رکھتا ہے۔ مثنوی قدیم طرز پر لکھی گئی ہے۔ قصہ سیدھا سادہ ہے۔ مکتب سے عشق کا آغاز ہوتا ہے۔ عشق کا چرچا ہونے کی وجہ سے وزیر نے اپنی بیٹی کا مکتب میں جانا بند کر دیا۔ ایک بڑھیا انّا درمیان میں سلام پیغام لاتی لیجاتی ہے۔ آخر کار وصال نصیب ہوتا ہے۔ پٹن گجرات کا ایک شاعر عبداللہ واعظ ہے۔ اس کی چھ طول طویل مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک "لیلیٰ مجنوں" ہے۔ اس کا سنِ تصنیف ۱۱۹۶ھ ہے۔ شاعر ایک پیشہ ور واعظ تھا۔ اس کی دوسری مثنویاں مذہب و اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ مکین اللہ سورت کا ایک غیر معروف شاعر ہے۔ اس نے سورت کے آخری نواب میر افضل الدولہ کے عہد میں ایک بزمیہ مثنوی: "دولہ سجن" تصنیف کی ہے۔ اس کا سن تصنیف سنہ ۱۲۵۰ھ ہے۔ اگرچہ کہ قصہ طبعزاد معلوم ہوتا ہے لیکن کوئی خصوصیت نہیں رکھتا۔ سورت کے مشہور و معروف شاعر غلام محمد منظور کی دو مثنویاں "جگر سوز" (سنہ ۱۲۶۵ھ) اور "منظورِ جہانی" (سنہ ۱۲۶۹ھ) ملتی ہیں۔ "جگر سوز"، "گلزارِ نسیم" کے تتبع میں لکھی گئی ہے بحر بھی اسی کی اختیار کی گئی ہے۔ لفظی صنعت گری کی بھی کوشش کی گئی ہے لیکن "گلزارِ نسیم" کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔ قصہ طبعزاد ہے۔ لیکن فنی پہلو سے ناقص ہے۔ "منظورِ جہانی" میں بھی قصہ طبعزاد ہے۔ فوق الفطرت عنصر بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ یہ مثنوی بھی کوئی اونچا درجہ نہیں رکھتی۔ مثنویوں کے سلسلے میں سمجھو، محب اور اخلاص کے نام بھی ملتے ہیں لیکن ان کے کارنامے نایاب ہیں۔

ولی گجراتی کے بعد اگرچہ اس کے شاگرد اور ہم عصر گجرات و دکن میں گلشنِ نظم کو سیراب کرتے رہے لیکن حقیقت میں اردو کا مرکز دکن سے منتقل ہو کر شمالی ہند چلا گیا تھا۔ یوں تو شمالی ہند میں ریختہ کی دھوم تھی لیکن دوسرے اصنافِ سخن کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ جہاں تک بزمیہ مثنویوں کا تعلق ہے میر صاحب کی خدمات ناقابلِ

فراموش ہیں۔ میر صاحب غزل کے بادشاہ تھے۔ غمِ عشق اور غمِ دوراں نے انہیں یکسر سوز و گداز بنا دیا تھا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے مثنوی کو بھی آلۂ کار بنایا۔ ان کی مثنویوں میں سے بزمیہ مثنویاں "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" خصوصیت رکھتی ہیں۔ میر صاحب نے ان کارناموں میں جہاں عشق کی نیرنگیاں بیان کی ہیں وہاں زبان و بیان کے بھی کرشمے دکھائے ہیں۔ اسی خصوصیت نے ان کی مثنویوں کا درجہ بلند کر دیا ہے۔ ورنہ مثنویوں کے قصے بالعموم سیدھے سادے ہیں البتہ مثنویوں میں ڈرامائی عناصر ایک حد تک کارفرما ہیں۔ دریائے عشق کا قصہ طبعزاد نہیں ہے۔ یہ عظیم آباد سے دلی پہنچا۔ اسی دور میں میر درد کے بھائی میر اثر نے مثنوی "خواب و خیال" لکھی۔ اس میں کوئی مسلسل قصہ نہیں ہے لیکن زبان اور اندازِ بیان کے اعتبار سے متفرق مرقعے نہایت جاندار ہیں۔ ۱۱۹۷ھ میں نواب محبت خاں رند نے "اسرارِ محبت" کے نام سے ایک عشقیہ داستان منظوم کی۔ قصہ طبعزاد ہے۔ یہ مثنوی اپنے زمانے میں مقبولیت کا تمغہ حاصل کر چکی ہے۔ بارھویں صدی کے اختتام تک مثنویوں کا پہلا دور تھا۔ اس دور میں کئی اور مثنویاں لکھی گئیں۔ جو اپنی جگہ اچھی بھی ہیں لیکن میر صاحب کے قائم کئے ہوئے معیار پر ایک بھی ٹھیک نہ اتر سکی۔

مثنویوں کے دوسرے دور کا آغاز میر حسن سے ہوتا ہے۔ میر حسن نے ۱۱۹۹ھ میں "بدرِ منیر اور بے نظیر" کا قصہ منظوم کر کے ایک نیا معیار قائم کر دیا اور یہ اس دور کے مثنوی نگاروں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ قرار پایا اگرچہ اس کا قصہ سنسکرت سے ماخوذ ہے جو فارسی کے ذریعہ اردو میں آیا ہے لیکن اس کو جس خوش اسلوبی سے نباہا ہے وہ میر حسن جیسے صاحبِ کمال ہی کا حصہ ہے۔ ایک طرف اس میں ڈرامائی عناصر کی ہم آہنگی اور زبان کی سادگی اور پرکاری اور دوسری طرف ہندوستانی معاشرت کا سچا نقشہ اس کارنامہ کی کامیابی کے ذمہ دار ہیں۔ اس میں فوق الفطرت عناصر موجود ہیں لیکن حیاتِ انسانی کی حقیقتیں بھی قصے کے پسِ پردہ متحرک نظر آتی ہیں۔ مزید برآں شاعر کے تجربے اور مشاہدے کی باریکیاں اس کے فنی پہلو کو بلند کر دیتی ہیں۔ اس دور میں بلکہ اس کے بہت بعد تک اساتذۂ فن نے اس کے تتبع میں مثنویاں لکھیں لیکن "سحر البیان" کے سامنے کسی کی شعبدہ بازی نہ چل سکی۔ اس دور میں جرأت کی بزمیہ مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں مثنوی "حسن و عشق" (۱۲۲۵ھ) خصوصیت رکھتی ہے۔ اس کا قصہ طبعزاد ہی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن فنی نقائص کی وجہ سے مقبول نہ ہو سکی۔ اس دور میں مصحفی نے بھی "دریائے عشق" کے قصے کو "بحر المحبت" میں منتقل کر کے اپنے زورِ قلم کا ثبوت دینا چاہا لیکن ابھر نہ سکا۔ مصحفی کے ایک شاگرد طالب علی نے "سوز و گداز" لکھی۔ اور دوسرے شاگرد میر تقی ہوس نے "نظامی لیلیٰ مجنوں" کا ترجمہ کیا ہے۔ "سوز و گداز" کا قصہ طبعزاد ہے۔ دونوں مثنویاں زبان کے لحاظ سے اونچا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن فنی پہلو کمزور ہے۔ اسی دور میں نواب اعظم الدولہ سرور نے "یوسف زلیخا" "شیریں فرہاد" "لیلیٰ ..." ی سات مثنویاں لکھیں، جو "سبعہ سیارہ" کے نام سے مشہور ہیں۔

١٢٤٢ھ میں لکھنؤ کے ایک شاعر راحت نے 'نل دمن' کے مشہور قصّے کو منظوم کیا۔ "سحر البیان" کے بعد صناعی کا دوسرا نمونہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" (١٢٥٤ھ) ہے۔ گل بکاولی کا قصّہ اردو نثر میں موجود تھا۔ نسیم کے زورِ قلم نے اسے چمکا دیا۔ "گلزار نسیم" کی کامیابی کا راز اس کے ڈرامائی عناصر اور ان کی ترتیب میں مضمر ہے۔ قصّہ اور پلاٹ کے نشیب و فراز، شاعرانہ نازک خیالیوں اور حسنِ بیان نے اسے غیر فانی بنا دیا۔ اس دور سے مثنوی نگاروں کے لئے "سحر البیان" سلاست و سادگی اور "گلزار نسیم" مرصع سازی کا نمونہ بن گئی۔ اس دور میں آفتاب الدولہ قلق نے "طلسم الفت" لکھ کر "گلزار نسیم" کا طلسم اور "سحر البیان" کا سحر توڑنا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ مضامین کے پھیلاؤ، تصنّع اور عریانی نے اس کا مرتبہ گھٹا دیا۔ اس کا قصّہ طبعزاد ہے۔ یہ اپنے نقائص کے باوجود معیاری مثنویوں میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ واجد علی شاہ نے صنفِ مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی اور "غزالہ و ماہ پیکر" اور "دریائے تعشق" لکھ کر قدرتِ زبان کا ثبوت دیا ہے مگر فنی نقائص کی وجہ سے انہیں اعلیٰ رتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ "دریائے تعشق" کا قصّہ طبع زاد اور دلچسپ ہے لیکن قصّے کو صناعی کے ساتھ آخری منزل تک پہنچانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کے آخری دور کے شاعر مرزا شوق کی مثنویاں "زہرِ عشق" "بہارِ عشق" اور "فریبِ عشق" اس صنف میں بیش بہا اضافے ہیں۔ بہارِ عشق اور زہرِ عشق کے قصّے طبعزاد ہیں۔ زہرِ عشق میں بہارِ عشق کی بہ نسبت ڈرامائی عناصر کو زیادہ کامیابی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ اگرچہ پلاٹ اور کردار وغیرہ کے نباہنے میں نقائص ضرور پائے جاتے ہیں تاہم طبعزاد قصّوں میں فنی نقطۂ نظر سے یہ جدت کا نمونہ ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز شگفتہ اندازِ بیان اور زبان میں مضمر ہے۔ سحر البیان اور گلزار نسیم کے بعد شوق کی مثنویوں کو نیا معیار اور اس صنف میں سنگ میل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ سب سے آخر میں احمد علی شوق نے ١٣٠٥ھ میں "ترانۂ شوق" لکھ کر اگلے دور کی معیاری مثنویوں کی خصوصیات کا مجموعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قصّے کا خاکہ معمولی ہے مگر زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اس کا مرتبہ اونچا ہے۔ "ترانۂ شوق" نے دلوں میں ولولے ضرور پیدا کر دیئے لیکن زمانہ بدل چکا تھا۔ مذہبی مثنویوں کا دور پھر شروع ہوا اور نظموں نے طول طویل مثنویوں کی جگہ لے لی۔ آزاد اور حالی کی کاوشوں سے جدید دور کا آغاز ہو گیا۔

مثنوی ادب کے مذکورہ بالا سرسری جائزے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ادب کے کسی دور میں صنفِ مثنوی کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ بزمیہ مثنویوں کا سلسلہ دور جدید تک برابر پایا جاتا ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے مثنوی اردو زبان کے ارتقاء میں دوسرے اصناف کے ساتھ برابر کی شریک رہی ہے۔ ہر مثنوی اپنے دور کے ادبی رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ جہاں صنفِ غزل نے ادب کو داخلی شاعری سے مالا مال کر دیا وہاں مثنوی نے ایک

حد تک خارجی شاعری عطا کی ۔ لیکن فنِ قصہ و ڈراما کے نقطۂ نظر سے ترقی کی رفتار بہت سست پائی جاتی ہے ان میں شاید ہی کوئی ایسی مثنوی ہو جو فارسی کے شاہکاروں کے مقابلے میں بھی پیش کی جا سکے ۔

شمالی ہند میں ادب دہلوی اور لکھنوی ایسے دو دبستانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ۔ شعرائے دہلی جو ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے اپنے ساتھ دہلوی خصوصیاتِ شاعری بھی لیتے گئے ۔ لہٰذا لکھنؤ میں ایک مدت تک انہیں کا طوطی بولتا رہا ۔ اگرچہ آتش و ناسخ کے دور سے طرزِ فکر اور طرزِ بیان میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن لکھنوی ادب کی تعمیر اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی ۔ مثنویوں کو بھی انہیں دو دبستانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے میر ۔ میر اثر ۔ مصحفی ۔ شاگردانِ مصحفی ۔ جرأت ۔ اعظم الدولہ سرور ۔ مومن اور داغ کی مثنویاں دہلوی دبستان سے تعلق رکھتی ہیں جن میں میر اور میر حسن قافلہ سالار ہیں ۔ اس دبستان کی مثنویاں سادگی و پرکاری بے تکلفی ، جذبات نگاری ، سوز و گداز اور حقیقت نگاری کی حامل ہیں ۔ سب سے پہلے میر صاحب نے مثنوی کا ایک معیار قائم کیا ۔ کچھ عرصے تک اسی معیار کو سامنے رکھا گیا لیکن بہت جلد میر حسن کی "سحر البیان" سخن سنجوں کے سامنے آگئی جو زبان ، انداز بیان اور ڈرامائی عناصر کی وجہ سے بلند مرتبہ حاصل کر سکی اور دوسرے باکمالوں نے اسی کو نمونہ قرار دیا ۔ ہر چند بعض کارنامے زبان و انداز بیان کے اعتبار سے "سحر البیان" تک پہنچ جاتے ہیں لیکن دوسرے نقائص کی وجہ سے ان کا درجہ کم ہو جاتا ہے ۔ زیادہ مثنویاں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں قصہ پن یا قصّے کے برتنے میں نقائص رہ گئے ہیں ۔

دبستانِ لکھنؤ ادب کا ایک جداگانہ دور ہے ۔ اس دور کی لکھنوی طرزِ معاشرت کی نزاکتوں اور نفاستوں نے ذہن و فکر اور زبان و بیان پر اپنا گہرا اثر ڈالا جس کے سبب سے نازک خیالی ، معنی آفرینی ، تصنع و تکلف ، صنعت گری وغیرہ شاعرانہ خصوصیات قرار پائیں ۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ معاشرت کی بدعنوانیوں کی جھلکیاں ، سوقیانہ پن ، عریانی ، ہوسناکی ، انگیا ، چوٹی وغیرہ کی شکل میں رونما ہوئیں ۔ راحت ، اختر پیا ، قلق اس دبستان کی نمائندگی کرتے ہیں اور سرِ فہرست نسیم ہیں ۔ ان میں نسیم کا کارنامہ اس مکتبِ خیال کا بہترین نمونہ ہے مگر اس میں سوقیانہ پن اور ابتذال نہیں پایا جاتا ہے ۔ نسیم کی نازک خیالی اور معنی آفرینی نے ایک نیا معیار قائم کر دیا ۔ اس کے بعد سے اساتذۂ فن کے سامنے دو معیار سامنے آتے گئے ۔ بعض نے میر حسن کی پیروی کی اور بعض نے نسیم کو استاد مانا ۔ ان میں چند ایسے بھی ہیں جنہوں نے جدتِ طبع سے کام لے کر میر حسن اور نسیم دونوں کی خصوصیات کو یک جا کر کے نیا باب کھول دیا ۔ مرزا شوق اور احمد علی شوق نے اپنے کارناموں میں دونوں دبستانوں کی خصوصیات کا مجموعہ پیش کر کے مثنوی کے لئے ایک خاص زبان اور اندازِ بیان کو رواج دیا ۔ اسے صنفِ مثنوی میں چوتھا پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ مگر قصّے کے ڈرامائی نقائص

کی وجہ سے وہ "سحر البیان" یا "گلزار نسیم" سے اونچا درجہ حاصل نہ کر سکے۔

عالمگیر شہرت رکھنے والے تین قصّوں "یوسف زلیخا" "لیلیٰ مجنوں" اور "شیریں فرہاد" کو بھی اردو میں منظوم کیا گیا ہے۔ تینوں قصّے فنی نقطۂ نظر سے مکمل ہونے کی وجہ سے ہر دور میں فنکاروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ فارسی میں بھی بڑے بڑے باکمالوں نے ان قصوں کو منظوم کیا ہے۔ عشقِ حقیقی کا دم بھرنے والوں نے قصوں کو صوفیانہ رنگ دے کر مجاز کے پردے میں حقیقت کے جلوے دکھائے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تینوں قصّے ڈرامائی عناصر کے حامل پائے جاتے ہیں اور اتنے مکمل ہیں کہ کہیں جھول جھال نہیں پایا جاتا۔ قصوں کے پلاٹ کی ترتیب اور پیچیدگیاں کسی جگہ ہمارے لطف کو صدمہ نہیں پہنچاتیں۔ ان کے کردار جیتے جاگتے انسانی کردار ہیں جو اسی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ان رومانی قصوں کے پس پردہ اخلاقی درس بھی دیا گیا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ پند و موعظت کسی جگہ بھی دل و دماغ پر بوجھ نہیں بننے پاتے نہ قصّے محض کھیل تماشا بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی میں ان قصوں کی عظمت کا راز مضمر ہے۔

تینوں قصوں میں یوسف زلیخا کو ہر حیثیت سے فوقیت اور اولیت حاصل ہے۔ اس قصّے کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس کو جس رنگ کی عینک سے دیکھا جائے ویسا ہی نظر آئیگا۔ قصّہ رومانی بھی ہے اور اخلاقی بھی اساتذۂ فن نے اس میں بعض عنوانات کا اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ اصل قصہ ایک مکمل رومان ہے اور ڈرامہ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ یہ ایک علٰحدہ موضوع ہے۔ انشاء اللہ کسی اور صحبت میں اس پر تفصیل سے عرض کیا جائیگا۔

تین سو سال کی مدت میں بیسیوں بزمیہ مثنویاں لکھی گئیں لیکن ان میں چار پانچ ہی ایسی ہیں جو ہر اعتبار سے مکمل ہیں اور جن پر اردو ادب بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ ابتدا سے دورِ جدید تک لسانی نقطۂ نظر سے زبان میں تراش خراش اور اندازِ بیان کی لطافت میں برابر ترقی ہوتی گئی مگر ڈرامائی عناصر اور جمالیات کے نقطۂ نظر سے مثنویوں نے تسلی بخش ترقی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ "گلشنِ عشق"، "قطب مشتری"، "سیف الملوک و بدیع الجمال"، "سحر البیان"، "گلزار نسیم" بلند درجہ حاصل کرسکیں اور دوسری مثنویاں زبان و بیان کے اعتبار سے بلند مرتبہ ہونے کے باوجود صرف اپنے زمانے تک ہی محدود رہیں اور وقتی مقبولیت حاصل کرسکیں۔ قصّہ کہانی کے فنی پہلو سے بے پروائی کا ایک بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ دکن میں ایک ادبی زبان تیار ہوچکی تھی لیکن جب شمالی ہند میں پہنچی تو فارسی کے دلدادگان نے فارسی کے زیرِ اثر زبان کی از سرِ نو تہذیب شروع کی لہٰذا زبان کے بعض شناسوں نے اپنا تمام زور زبان کی صفائی پر صرف کیا اور قصّہ کہانی کے فنی و جمالیاتی پہلو پر توجہ نہ دے سکے۔ مثنوی ادب میں قصوں کا اعادہ اور کم درجہ طبعزاد قصّے ہمارے اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔

پروفیسر حنیف فوق

ہمارا تمثیلی ورثہ
اور
"لہو اور قالین"

اردو ڈرامہ کا حال بھی تقریباً اردو تنقید کا سا ہے یعنی ایک طرف اس کی تہی دامنی کا احساس ہے اور
وسری طرف برابر اس کے سرمائے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قدیم ڈرامائی ادب کے نئے نئے گوشے بھی ہمارے سامنے آرہے
یں اور جدید تخلیقی کاوشیں بھی زندگی کی ہزار عشوہ سامانیوں کی آئینہ داری کر رہی ہیں۔ پھر تھیٹر ہمارے یہاں کوئی
جنبی چیز نہیں۔ ناٹک نے سنسکرت ادب میں جو اہم مقام حاصل کیا تھا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اردو ڈرامہ ایک جانب
مغرب کے لائے ہوئے اُن رجحانات سے مانوس ہے جن کا آغاز پہلے پہل یونان کی مردم خیز سرزمین میں ہوا تھا۔ اور دوسری
جانب خود ہماری "پراچین سبھیتا" کا وارث ہے۔ اسی طرح ڈرامہ کی تنقید کے سلسلہ میں جہاں ارسطو کی بوطیقا اور ہوریس
(EPISTLE TO THE PISOS) ڈرامہ نگاری کے اولین اصولوں کا تعین کرتی ہیں وہاں بھرت کی
ناٹیہ شاستر" اور نندکشور کی "ابھینا درپنم" بھی ہماری بہت کچھ معاونت کر سکتی ہیں۔ قدیم سنسکرت ڈرامہ میں
تخیل، اشاریت اور محاکات کا عمل اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس لئے پروفیسر لیوی نے کہا تھا کہ ہندوستانی فطانت
نے ایک نئے آرٹ کا آغاز کیا۔ جسے ہم 'رس' کے لفظ سے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ قدیم سنسکرت
ڈرامہ میں تصورات کی کارفرمائی فطرت کی تعالی کے یونانی تصور سے بہت کچھ مختلف ہے۔ خود 'رس' کا لفظ ہی
ں اختلاف کی جامع تعبیر ہے۔ یہ لفظ شروع شروع میں (مثال کے طور پر رگ وید میں) سوم کے عرق کے مفہوم
ں استعمال ہوتا رہا ہے۔ پھر کبھی کبھی اسے مزہ اور ذائقہ کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن معاشرت کی
بی کے ساتھ ساتھ ہندو افکار کا دائرہ بھی وسیع ہونے لگا اور 'رس' کے لفظ کو بھی وسیع سے وسیع تر مفہوم
ں استعمال کیا جانے لگا۔ اب اسے ہر شے کے بنیادی عنصر سے تعبیر کیا گیا۔ یہی نہیں 'رس' سرور و خوشی کی انتہائی
یفیت کے اظہار کا نام بھی بن گیا۔ بھرت نے "ناٹیہ شاستر" میں اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ سرور کی اس
یفیت کا نام ہے جو آہنگ، اظہار اور تہذیبِ جذبات، مشاہدہ سے محسوساتی اور تجرباتی ذریعوں سے حاصل
وتی ہے اس طرح دیکھنے اور سننے والوں میں "رس" جگانے کا نظریہ قدیم ہندی آرٹ اور ڈرامہ کی جمالیاتی بنیاد

بن گیا۔ اس کے علاوہ انسانی جذبات کو قدیم ہندی مفکروں نے آٹھ بنیادی رسوں میں تقسیم کر دیا جس طرح
یونان کے مذہبی رجحانات کے تحت "کورس" وہاں کے ڈرامہ کا لازمی جزو تھا اسی طرح حرکات رقص قدیم ہندی
ڈرامہ کا اہم ترین حصہ تھیں بلکہ یہاں ڈرامہ کا آغاز ہی رقص کی اداکاری، نرت اور اظہار سے ہوا تھا۔ اسی اہمیت
کے پیش نظر "ابھینا درپنم" میں بدن کی حرکات، اداؤں کے اظہار، آواز اور تلفظ کی مخصوص کیفیتوں کے
استعمال اور لباس و پوشاک کی جلوہ آرائی کے قوانین بھی مدون کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ موضوع ان چار
شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شاخ پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ دراصل رمزیت ہندی ڈرامے کی نمایاں خصوصیت
تھی۔ اس لیے رمز و ایما کی طلسماتی صورتوں پر ہندی ڈرامہ کے نقادوں نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ ایک ایک
انگلی کے اشارے یا آنکھ کی خفیف سے خفیف گردش کو بھی معنویت کا پابند بنا دیا ہے۔ ان ڈرامہ نگاروں کے یہاں
انفرادی محسوسات اور شخصی کرداروں سے زیادہ کائنات کی مجموعی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بھرت "ناٹیہ
شاستر" میں کہتا ہے کہ راجا کو پرجا کے ساتھ یا گرو کو چیلوں کے ساتھ جو نسبت ہے وہی مرکزی جذبہ کو دیگر محرکات
سے ہے۔ چنانچہ رس اور بھاؤ کے باہمی رشتہ سے ڈرامہ کا جو ڈھانچہ ہندوستان میں ترتیب پایا۔ اس میں جمالیاتی
مسرت کو اہم مقام حاصل تھا۔ اس مسرت کا دائرہ ہندو تصورات اور صنم پرستی کے گرد گھومتا تھا۔ یہ محض
اتفاق نہیں کہ مصری ذہانت کا بہترین نمونہ اہرام یا مقبرے ہیں جن سے اس دور میں زندگی کی عام ناآسودگی
اور مردہ پرستی کی تہذیبی قدروں کا حال کھلتا ہے۔ جب زندگی میں کوئی حسن باقی نہ رہ جائے تو انسان لامحالہ
موت میں دلکشی تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح یونان کی شہری ریاستوں کی تلاش و تحقیق کی فضا میں انسانی ذہن
کی سرگرمیاں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔ اسی فکر و جستجو کے ماحول میں جو خصوصیت سے ایتھنز کی چھوٹی سی
ریاست میں پروان چڑھ رہا تھا دنیا کے تین بڑے المیہ نگار یعنی آئی سی لس، سوفوکلیس، اور یوریپڈیس
کے بلند پایہ آرٹ کی نشو و نما ہوتی ہے۔ جس طرح فکر و جستجو نے انسانی عمل کی مختلف تعبیروں کے سامنے ٹریجڈی
کے خط و خال یونان میں سنوارے ہیں۔ اسی طرح کامیڈی کا بہترین تصور ہندوستان کی لہلہاتی ہوئی وادیوں نے
برگ و بار لایا ہے۔ یہاں ہندی اصنام پرستی اور خیال آرائی کی بدولت کالی داس کے ہاتھوں "شکنتلا" اور
"وکرم اروسی" جیسے شاہکار معرض وجود میں آتے ہیں۔ اردو ڈرامہ روز آغاز ہی سے ہندوستان کی قدیم و جدید
روایتوں کو ملانے والی کڑی بن گیا۔ ان قدیم تہذیبی روایات اور دیرینہ اثرات کی گونج ہمیں اردو کے پہلے ڈرامہ
"اندر سبھا" میں ملتی ہے۔ جہاں موسیقی کی جھنکار اور دیو مالائی آثار کے ساتھ ہندوستان کے مخصوص جاگیردارانہ
میں محبت تمثیلی طور پر تشدد اور آزمائش کی آگ سے گزر کر آخر آخر میں اپنی پاکیزگی اور صداقت کا حق منوا لیتی ہے۔

جہاں تک یونانی ڈرامہ کا تعلق ہے۔ اس نے ٹریجیڈی کے جس بلند معیار کو پا لیا ہے وہاں تک دوسرے

کجر

لوں کے ڈرامہ نگار صرف کبھی کبھی پہنچ سکے ہیں۔ لیکن کامیڈی کا رنگ ان کے یہاں اتنا چوکھا نہیں۔ زندگی کی تصویر کشی
لئے ان دونوں رنگوں پر صناعانہ قدرت کی ضرورت ہے کیونکہ دونوں کے سوتے زندگی کی متنوع کیفیتوں سے پھوٹتے
ں۔ اسی لئے ارسطو کے خیال میں ایک بڑا المیہ نگار ایک اچھا طربیہ لکھنے والا بھی ہو سکتا ہے۔ اور شیکسپیئر کے ڈراموں
ں یہ اصول عملی طور پر صادق ہوتا نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ارسٹوفینز کی کامیڈی میں یونان کی زندگی
ے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی ملتی ہے لیکن پاکیزگی، عظمت اور جمال کا وہ تصور جو ہندوستان کی مخصوص
ضا کی دین ہے نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں کامیڈی محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں رہی اور نہ اسے محض
فراد یا سماج کے خلاف طنز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے بلکہ یہاں کامیڈی ذہنی اور خارجی زندگی کی کامل
م آہنگی سے عبارت اور تہذیب کے ایک خاص نقطۂ عروج کی علامت رہی ہے۔ شدرکا کے ڈرامہ "کھلونہ
اڑی" پر لکھتے ہوئے ——— جس کا اصل ڈھانچہ بہت پہلے ترتیب دیا ہوا بتایا جاتا ہے ———
زف وڈ کرچ نے کہا تھا کہ یہ ڈرامہ صرف وہ تہذیب پیدا کر سکتی ہے جسے استقلال حاصل ہو گیا ہو اور جس
ے اپنی معاشرت میں پیش آنے والے مسائل کا حل ڈھونڈ لیا ہو۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یورپ کے تمام
ھنی میں اس سے زیادہ تہذیب یافتہ کوئی ڈرامہ نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس تہذیبی تسکین میں ہندی
ھانیت، تناسخ، کرم اور نروان کے عقاید کو بہت کچھ دخل ہے اور ان عقاید کی طبقاتی خصوصیات
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اس تہذیب نے جیون رس میں ڈوبے ہوئے جو لافانی ادبی کارنامے
ں کئے ہیں انھیں فراموش کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف یونان میں دیوتاؤں کی الوہی حیثیت کو
سانی فکر کے تجسس، تحیّر اور تشکیک کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے یہاں ڈراموں میں دیومالائی عناصر
ھ میں نہ آنے والی فطرت اور زندگی کی تازہ وادیوں کے اجنبی اور نامانوس تاثرات کا عکس ہوتے ہوئے بھی
ندوستان کی طرح قطعی، بنیادی اور اٹل نہیں ہیں۔ چنانچہ یونانی دیوتاؤں کی سرزمین میں ہمیں انسانی عناصر
ب نظر آتے ہیں۔ پہلے پہل ٹریجڈی انسانیت اور الوہیت کی آویزش باہمی ہی سے جنم پاتی ہے چنانچہ
طون سے بھی تقریباً سو سال پہلے آئی سی لس کے ڈرامہ اگیمناں (AGMAMNAN) میں ہمیں
یک اور پُر اسرار قوتوں کی تنقید ملتی ہے۔ جنھیں پروہتوں نے مذہب اور فطرت کی تعبیر کے طور پر پیش کیا تھا۔
سچ تو یہ ہے کہ یہ پیغام بر انسانوں کے لئے کبھی بھی کیا بھلائی کا سامان لائے ہیں؟ لفظوں کی کاریگری کے درمیان
پیغام صرف برائی کی خبر لاتا ہے۔ یہ پیغامبر دہشت پھیلاتے ہیں تاکہ انسانوں کو خوف زدہ رکھیں"۔ اس سے
ا ہے کہ یونان میں حیات و کائنات کے متعلق انسانوں نے اپنے شعور کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔
لک کہ ڈلفی کے مندر میں کندہ کئے ہوئے اصولوں میں پہلا اصول "اپنے آپ کو پہچانو" تھا۔ دراصل ٹریجیڈی

بھی فطرت کے وسیع پیش منظر میں انسانی زندگی کی اپنے آپ کو پہچاننے کی اولین کوششوں کا ثمر تھی۔ یونان کے ڈرامہ نگاروں نے انسانی ذہن کو عام دہشت زدگی، پراسرار دیوتاؤں کے خوف اور ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکی سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور موت کو بھی انسانی فتح بنا کر پیش کیا ہے۔ (سنیکا کے الفاظ میں مصائب سے مقابلہ کرتا ہوا انسان دیوتاؤں کے لئے بھی ایک دیکھنے والا نظارہ ہے۔)

یونانی ڈرامہ کا ہم اس پس منظر میں مطالعہ کریں تو ارسطو کے نظریۂ تزکیۂ جذبات (THE THEORY OF KATHARSIS) ——— جس کا ٹریجیڈی کی تاریخ سے گہرا تعلق رہا ہے ——— کا مفہوم واضح ہونے لگتا ہے۔ المیہ کے مشاہدے سے رحم اور خوف کے ملے جلے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن انسان کی عظمت اور برتری کا احساس اُس کی شکست کے ماحول پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جذبات سے خوف، رحم کے تاثرات دور ہو جاتے ہیں اور ہمیں انسانی زندگی کے حسن اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خیالات اور نظریے یونانیوں کے نزدیک ذہن کی حسین اور غیر فانی اولاد تھے۔ اس لئے استدلال، معقولیت اور منطق کو یونانی علوم میں بڑی اہمیت حاصل تھی جن کے ذریعہ وہ زندگی کے سربستہ رازوں کو سمجھنے کی سعی کرتے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ وہ زندگی کے حسن کا واضح شعور رکھتے تھے اور اس بلند آدرش کے سامنے انہیں حال کی ناآسودگی کا گہرا احساس تھا۔ ان کی نظر مجسمہ کی موزونیت میں بھی حسن تلاش کر لیتی تھی اور خوبصورت بدن کے تناسب میں بھی انہیں اسی جمالیاتی مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں ادب اور زندگی کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ زندگی کی یہ لہر، خوشی کی یہ تلاش اور انسانی زندگی کی ناآسودگی کا یہ احساس ہمیں موج در موج یونانی ڈرامہ میں کروٹیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ یونانی تھیٹر کی مخصوص روایات، ہزاروں تماشائیوں کا انبوہ، کھلی ہوئی فضا اور کورس کا آہنگ یہ سب ایسے عناصر تھے جنہوں نے نہ صرف فنِ ڈرامہ کو عظمت اور وسعت بخشی بلکہ اسے یونان کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان سے فطرت کی جدوجہد کا عکس بنا دیا۔ شیلڈگل اپنی کتاب "ڈرمیٹک آرٹ اینڈ لٹریچر" میں یونانی ڈرامہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "المیہ شاعری انسان کے عکس کو فطرت کی اس سطح سے الگ کر کے پیش کرنا چاہتی تھی جہاں حقیقت پاؤں میں زنجیریں ڈال دیتی ہے اور اسے غلام کی طرح زمین کا پابند بنا دیتی ہے۔" یونانی ڈرامہ میں ہمیں پہلی مرتبہ آدمی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس عظمت کی بے مصائب کے باوجود اور انسانی کمزوریوں کے باوصف ایک المیہ میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا موضوع افرادِ قصہ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ انسان اور نوعِ انسان بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو کورس "دراصل خصوصیت کو عمومیت سے ملانے والی کڑی ٹریجیڈی کی فلسفیانہ تعمیم پیش کرنے کی صورت ہی کا نام تھا۔

گجر

یونانی ڈرامہ اور خصوصیت سے ٹریجیڈی نے دنیا کے ڈرامائی ادب کو جس حد تک متاثر کیا ہے اس کا اندازہ کرنا شاید آسان نہیں۔ اس کی بازگشت ہمیں دنیا کے بڑے بڑے ڈرامہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ اردو ڈرامہ اگر اس سے براہِ راست نہیں تو بالواسطہ ضرور متاثر ہوا ہے۔ پارسی تھیٹر محض تجارتی ادارہ سہی، لیکن اس عہد کے ڈرامہ نگار مثلاً طالب، احسن، بے تاب یا آغا حشر ڈرامہ کی عظیم روایات سے ناواقف ہونے کے باوجود انگریزی تمثیلوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے ملزم یا موجد ہیں۔ چنانچہ ان ڈرامہ نویسوں کی بدولت ڈرامہ کا وہ ڈھانچہ ہمارے یہاں رواج پاتا ہے جو قدیم سنسکرت ڈراموں کے انداز سے مختلف اور مغربی ڈراموں سے قریب تر ہے۔ ایک طرف اردو ڈرامہ اندر سبھا کی روایات کا وارث ہے اور اس طور پر گویا ہندوستان کے قدیم تہذیبی اثرات کو اپنے دامن میں جگہ دیئے ہوئے ہے۔ اس مخصوص ملکی تہذیب کا سلسلہ رہس، ناٹک منڈلی، رام لیلا، سوانگ، نقل اور سنگیت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ جدید دور میں بھی قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف مغربی اثرات سے ڈرامہ کی وہ شکلیں ہمارے یہاں رواج پانے لگتی ہیں جنھیں ہم ایک اعتبار سے یونان کے ڈرامائی تصورات کا پرتو کہہ سکتے ہیں۔

اردو ڈرامہ ارتقا کی کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ قصہ کا تسلسل تو ہمیں قدیم مثنویوں میں بھی مل جاتا ہے اور ہماری داستانیں بھی بہت سے تحیر آفریں واقعات کا مجموعہ کہی جا سکتی ہیں لیکن اسٹیج کی موجودگی اور ڈرامائی اجزا، کی فراہمی نے جس باقاعدہ ڈرامہ نگاری کا آغاز اردو میں کیا اس کی روایات دھندلی ہونے کے باوجود نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قدیم سنسکرت یا قدیم یونانی ڈرامہ کے پس پردہ جو تہذیبی قوتیں کام کر رہی تھیں اردو ڈرامہ دورِ انحطاط کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ان سے محروم رہا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ڈرامہ یونانی یا سنسکرت ڈرامہ کی طرح کبھی پوری قومی زندگی کا ترجمان نہیں بن سکا۔ بلکہ ایک عرصہ تک اس کی باگ ڈور راندۂ درگاہ عناصر یا سماج کے ایک جزوِ قلیل کے ہاتھوں میں رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ڈرامہ کی پیش کش پر تالیاں پیٹنے والے ہاتھ تو بے شمار تھے لیکن دھڑکنے والے دل اور سوچنے والے دماغ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اس لئے اردو میں ڈرامہ کی کلاسیکی روایات جو ہمیں ملتی ہیں نہ تو ان میں ہمہ گیری ہے اور نہ ان سے انسانیت کی عظمتوں یا کائنات کی وسعتوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ اردو کے قدیم ڈرامے تجارتی نقطۂ نظر کی وجہ سے بلند مرتبہ تک نہ پہنچ سکے صرف ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ تھیٹر کبھی اپنے تماشائیوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اردو ڈرامہ کی بلندی یا پستی سے ہم اس دور کے سماجی رجحانات کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہونگے۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈرامہ نے داستانی انداز سے لے کر خطیبانہ اور مصلحانہ موضوعات تک ایک طویل سلسلۂ ارتقا طے کیا ہے۔ خود آغا حشر کے آخری زمانہ کے ڈرامے ان کی اولین

کوششوں سے مختلف ہیں۔ اور اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اپنے خطیبانہ آہنگ کے باوجود اب ڈرامہ نگار زندگی کی پیچیدگیوں، سماجی گتھیوں، انسانی نفسیات کی پیچ در پیچ صورتوں اور اجتماعی مسئلوں کی طرف بھی متوجہ ہونے لگا ہے۔

اردو ڈرامے کے جدید رجحانات کے سوتے زندگی کی ان بدلتی ہوئی صورتوں سے پھوٹتے ہیں جنہوں نے ڈرامہ نگاروں کو مسائل کی تحقیق و جستجو کی جانب مائل کیا۔ مغرب میں ابسن، چیخوف، برنارڈ شا، اسٹرنڈ برگ، میٹر لنک، ایلیٹ، استرادسکی اور یوجین اونیل ان بدلتی ہوئی صورتوں کے ترجمان ہیں۔ اردو میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، اشتیاق حسین قریشی، منٹو اور میرزا ادیب نے ان موضوعات کو اپنے ڈراموں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور عبد الماجد دریا بادی کلاسیکی، نو کلاسیکی اور جدید روایات کے درمیان بیچ کی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید ڈرامہ نگاروں کے یہاں گھریلو ماحول اور روزمرہ کے مسائل کو وہی اہمیت حاصل ہے جو قدیم دور میں کبھی دیومالائی روایات کا طرۂ امتیاز تھی۔ جس طرح یونانیوں کے لئے (السرڈ ائس نکول کے خیال کے مطابق) خانگی ٹریجیڈی کا وجود ناممکن تھا اسی طرح اب جدید دور میں دیوتاؤں کا خود مختارانہ عمل بھولی ہوئی کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں اکثر ڈرامہ نگاروں نے مختلف صورتوں میں ایک غیر انسانی سماج کے دم گھوٹ دینے والے ماحول سے انسانیت کی آویزش کو بے نقاب کیا ہے۔ اس آویزش نے کہیں فرد اور سماجی اداروں کی کش مکش کی صورت اختیار کی ہے اور کہیں وجود کی ٹریجیڈی کے آزادانہ اظہار کی سعی کی ہے اس کے علاوہ جدید ڈرامہ نگاروں کے یہاں مکالمہ کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ نگاری نہ قدیم طرز کی شاعرانہ اور خطیبانہ زبان کا سہارا لیتی ہے اور نہ روزمرہ کی عام گفتگو کی بے جان پیروی سے عبارت ہے۔ جدید ڈرامہ نگاروں کے یہاں مکالمہ نگاری پلاٹ کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ کرداروں کی مختلف خصوصیات کے اظہار اور ڈرامائی تاثر کو گہرا کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ دور حاضر کے ڈرامہ نگاروں نے سماجی تعلقات اور طبقاتی رابطوں کی اہمیت کو سمجھا ہے اور انسانی کردار پر ان کے مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کے یہاں انسان محض اپنے آپ میں سمٹا ہوا محسوس نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کی زندگی سے زندگی پاتا اور ان کی راہوں سے اپنے سفر کی راہ متعین کرتا نظر آتا ہے۔ گویا اس کے اعمال صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے پھیلے ہوئے سلسلے کا پتہ دیتے ہیں۔ جہاں ایک فرد کی زندگی کا دائرہ ہزاروں افراد کی زندگی کے چھوٹے بڑے دائروں سے مل جاتا ہے۔ چونکہ جدید ڈرامہ نگاروں میں اکثر نے طبقات میں بٹی ہوئی زندگی کے روپ کو پہچانا ہے۔ اس لئے ان کے ڈراموں میں انسان کی مجرد تصویروں سے زیادہ اس کی

سماجی شخصیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ـــــــ یہ طبقاتی کش مکش کبھی نظریاتی آویزش کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی انسان کے مادی وجود سے سماجی شعور کی جدوجہد کا پتہ دیتی ہے۔ اس شعور کے مختلف مدارج متنوع مظاہر ہو سکتے ہیں۔ مختلف کرداروں کا عمل بھی اکثر اسی شعور کے مختلف مدارج کا پتہ دیتا ہے اور ان کے آپس کے تصادم سے نئی زندگی کے شرار ے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔

خیال و عمل کے اس دوراہے پر بعض ڈرامہ نگار زندگی کی ناآسودگی، کج روی اور استحصال سے سمجھوتا کر لیتے ہیں اور بعض اپنے ماحول کی ناساعدت کا احساس دل میں لئے اسے بدل دینے کے ولولے سے آگے بڑھتے ہیں میرزا ادیب اس دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کو ابھی صرف زندگی کی آرزو سمجھتے ہیں اور اس کے دامن میں پلنے والے مظالم اور ناانصافیوں کا انہیں پورا پورا احساس ہے۔ ان کے خوابوں میں حقیقت کی تلخی کا گمان ہوتا ہے۔ اور حقیقت پر خوابوں کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ وہ سماج کے باغی ہیں لیکن ان کی یہ بغاوت بیک وقت رومانی بھی ہے اور انقلابی بھی۔ "لہو اور قالین" ان کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں طنز کی تلخی مستقبل پر یقین، اور حال سے بیزاری کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرت اور نظام معاشرت سے گہری واقفیت جھلکتی ہے۔ کہیں زندگی کے مطالعہ نے ان کے یہاں جن کرداروں کی تخلیق کی ہے ان میں رومانیت کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ رومانیت سے انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کی منزل واضح ہے لیکن کبھی کبھی چھوڑی ہوئی منزل کی یاد ان کے قدموں کو گرانبار بنا دیتی ہے۔ ان کی نظریں افق کی تاریکی میں کھو جاتی ہیں لیکن انہیں اس کا احساس رہتا ہے کہ ان ہی تاریکیوں سے روشنی کا اجالا کبھی بھی پھوٹنے والا ہے۔

"لہو اور قالین" ایک ایکٹ کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہاں ایکانکی ڈرامہ کی چند خصوصیات اپنے ذہن میں رکھیں تو ان فن پاروں کے پرکھنے میں آسانی ہوگی۔ جس طرح مختصر افسانہ ناول کا خلاصہ نہیں اسی طرح ایک بابی ڈرامہ محض کئی باب کے ڈراموں کا نچوڑ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی اپنی تکنیک ہے جس میں طویل ڈراموں کے اجزاء موجود ہونے کے باوجود پیش کرنے کے طریقے اور موضوع دونوں اعتبار سے جامعیت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کرداروں اور موضوع کے پیش کرنے میں کسی طرح کا توقف روا نہیں۔ ڈرامہ نگار کم سے کم وقت اور مختصر لفظوں میں فوراً حرفِ مطلب کا آغاز کر دیتا ہے اور ڈرامہ کے مرکزی نقطہ یا بنیادی خیال کی طرف تیزی سے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے راہ میں تعجب خیز حادثوں یا اچانک موڑوں سے سابقہ نہیں پڑتا لیکن اس کے ذہن میں منزل کا احساس ہمیشہ واضح رہنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک ایکٹ کے ڈراموں میں غیر ضروری مکالموں، زائد کرداروں یا فاضل کوائف کی گنجائش بھی نہیں۔ لیکن آرٹ کی اس صنف میں بڑی وسعت، لچک اور تنوع کا امکان ہے۔ زندگی کے ہمہ گیر اور گہرے موضوعات سے نئے کردار

کا موضوع نہیں لیکن اس حقیقی پس منظر نے اسے زندگی کی تصویر بنا دیا ہے۔ چنانچہ ماحول و کردار کی مطابقت کے ساتھ خوشی ، یاس ، ارمان اور نا امیدی کے بدلتے ہوئے رنگوں سے فطرت اور انسان کی جنگ میں انسانی کردار کی بلندی کی یہ داستان ترتیب پاتی ہے۔ ڈرامہ نگار نے جس ہمدردی اور فنکاری سے مختلف نقوش کو ابھارا ہے ، اس نے اس تمثیل کو تاثر کی پہنائیگی بخش دی ہے۔

میرزا ادیب نے بعض اوقات بہت معمولی پلاٹ سے بڑا کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر "بہن" کا سارا قصہ ایک معمولی پلاٹ کے گرد گھومتا ہے لیکن اس معمولی سے قصے میں انسانی روح کے کرب کی داستان بیان کی گئی ہے۔ پہلے پہل یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید ڈرامہ نگار نے ایک نفسیاتی نکتہ پر اس ڈرامہ کی بنیاد رکھی ہے لیکن یہ نفسیاتی نکتہ سماجی معنویت کا حامل ہے میرزا ادیب نے لاشعور کی تاریکی میں اندھوں کی طرح ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انسانی شخصیت کو سماجی بنیادوں کی روشنی میں سمجھنا چاہا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ ڈرامہ نفسیاتی مریضانہ موشگافی سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو نفسیات کے جھومنتر سے تمام انسانی دکھوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرزا ادیب ان میں سے نہیں۔ وہ ٹونے ٹوٹکوں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اگرچہ کہیں کہیں ڈرامائی ضرورت کے تحت زندگی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ان کی نظریں اس طرح جم جاتی ہیں کہ سماجی نقوش مدھم پڑنے لگتے ہیں لیکن اس معاملے میں ان کا ذہن اتنا صاف ہے کہ وہ اس معمولی سے واقعہ کو حاصلِ زندگی نہیں سمجھنے لگتے اور انسانی ضروریات سے بے نیاز ہونا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ "بہن" ہی کو لے لیجئے۔ یوں تو ہم جمیلہ کی تنہائی اور اس کی زندگی کی ویرانی کو کمتری کی الجھن کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں لیکن غور سے دیکھئے تو اس ڈرامہ کا کنویس زیادہ وسیع ہے۔ اس صنعتی نظام میں کسی کو دوسروں کے غم میں شریک ہونے کی فرصت نہیں۔ زندگی اتنی تیز رو اور اس قدر خود پرست ہو گئی ہے کہ انسانی رابطے اور جذباتی رشتے ٹوٹنے لگے ہیں۔ ایک جانب جمیلہ ہے جسے بچپن سے محبت کی تلاش رہی ہے لیکن جواب تک انسانی ہمدردی اور محبت پانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ دوسری جانب اس کی سہیلی نزہت ہے جو اس محبت کو سیم و زر کے پیمانے سے ناپتی ہے۔ اپنی بہن کی محبت نہ پاکر جمیلہ حد درجہ چڑ جاتی ہے اور ایک مریضہ کی خاطر جس نے اسے بہن کہہ کر پکار لیا تھا وہ جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ لیکن اسے اس محبت کا جواب بھی چند سکوں سے ملتا ہے کیونکہ اس تاجرانہ نظام میں ہر جذبہ خرید و فروخت کی جنس بن گیا ہے۔ ڈرامہ نگار نے بہت خوبی سے اس غم کی تنہائی کے نقوش ابھارے ہیں۔ جمیلہ کے دل کی ویرانی کی داستان سننے کے لئے کوئی آمادہ نہیں۔ سب اپنی اپنی مصروفیتوں میں گرفتار رہیں۔ نزہت کو صرف سوٹوں کے کپڑے کی فکر ہے اس کی دوسری سہیلیاں ہنس بول کر وقت گزار رہی ہیں۔ یہاں ڈرامہ نگار کا طنز ملاحظہ ہو۔

نزہت ـــــ میں کہتی ہوں جمیلہ یہ نرسیں بڑی خود غرض ہوتی ہیں ـــ اچھا بھئی ـــــ میری اچھی بہن

گجر

ذرا حافظہ پہ زور دو نا ۔ کہاں ہے وہ دکان ہے ؟

آخر جمیلہ اپنی گونگی ملازمہ کے گلے میں باہنیں ڈال دیتی ہے ۔ اور دونوں کی سسکیوں میں انسانی ہمدردی کی آواز سنائی دیتی ہے میرزا ادیب کا یہ ڈرامہ بھی کرداروں کے مطالعہ، مکالمہ کی نزاکت، پلاٹ کی چستی، اور موضوع کی سماجی معنویت کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ (بار بار گگی پر تشدد اتنی ناگوار گزرتی ہے کہ پورا ڈرامہ پڑھنے کے لئے ہمت درکار ہے)

میرزا ادیب کے ڈراموں میں طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی آمیزش بہت خوشگوار معلوم ہوتی ہے ۔ انہوں نے اس ذریعہ سے پلاٹ اور کردار کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے کا کام بھی لیا ہے ۔ ان کے اس طرح کے ڈراموں میں " فنکار " اور " بچہ گاڑی " کا شمار کیا جا سکتا ہے ۔ دونوں ڈرامے نچلے متوسط طبقہ کا ماحول پیش کرتے ہیں ۔ ان ڈراموں میں حقیقت کی سنگینی اور طنز کی رنگینی نے مل جل کر زندگی کی دلکش ترجمانی کی ہے ۔ ہمارے ملک میں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کی اقتصادی بدحالی کی داستان کچھ بہت زیادہ چونکا دینے والی تو نہیں لیکن " فنکار " میں میرزا ادیب نے اسے استعجاب انگیز ڈھنگ سے ضرور بیان کیا ہے ۔ سرفراز ایک مصوّر ہے اور اگر مصوّری کو " تقریب بہر ملاقات " کی جگہ ذریعۂ معاش بنا لیا جائے تو اس چور بازاری کے دور میں نتیجہ ظاہر ہے ۔ چنانچہ معاشی تنگ دستی ازدواجی زندگی کی ہم آہنگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے ۔ اسی حالت میں ایک ہزار کے پڑے پائے ہوئے نوٹ " کھل جا سم سم " کی طرح نئی زندگی کا دروازہ بھی کھول دیتے ہیں ۔ لیکن خوشی کا یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ جاتا ہے ۔ پھر بھی اس خواب میں جو چند لمحوں کے لئے حقیقت بن گیا تھا ۔ بڑی جان ہے ۔ اس ڈرامے میں طنز و مزاح کے عناصر کے باوجود زندگی کی ناآسودگی کا احساس بہت گہرا ہے ۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات کی دو سطحیں اس ڈرامے میں پیش کی گئی ہیں ۔ ایک وہ جب ناآسودگی ہوتی ہے اور دوسری وہ جب خیالی آسودگی کی جنت تعمیر کرنے کا خواب دیکھا جا رہا ہے ۔ حقیقت اور سراب کے تصادم سے ایک تیسری سطح بھی ڈرامہ کے اختتام پر نمودار ہوتی ہے ۔ یہ وہ سطح ہے جہاں مصائب کے باوجود زندگی کو گوارا کرنے اور جد و جہد کی سختیاں سہنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے ۔ یہ ڈرامہ اپنے پلاٹ کی دلکشی اور مکالمہ کی برجستگی کی وجہ سے بھی قابلِ ذکر ہے ۔

" بچہ گاڑی " میں میرزا ادیب کا طبقاتی شعور بہت نمایاں ہے ۔ سراج کو اپنے بچپن میں بچہ گاڑی پہ سیر کرنا نصیب نہ ہوا ۔ وہ امیروں کے بچوں کو سیر کرتے دیکھ کر دل کی حسرت دل میں لئے ہی بچہ سے جوان ہو گیا ۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا بیٹا اس کی طرح بڑا ہو کر یہ ارمان دل میں لئے رہ جائے شاید وہ اس طرح خود اپنے بچپن کی اس گھٹی ہوئی آرزو کی تشفی کرنا چاہتا ہے ۔ اس لئے وہ خون پسینہ ایک کر کے " بچہ گاڑی " خرید لیتا ہے ۔ ایک طرف باپ کی محبت ہے اور دوسری جانب ماں کی مامتا جو اپنے بچے کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی ۔ اور ان کے

درمیان "بچہ گاڑی" جو میاں بیوی کے لئے خاصی فساد کی جڑ بن گئی ہے میرزا ادیب نے ہلکے پھلکے مکالموں اور سادہ جملوں سے کرداروں کی اچھی عکاسی کی ہے۔ سراج، مہراں اور رحمت کے کردار اس روزمرہ کی زندگی کی مانوس فضا میں خوب ابھرتے ہیں۔ اور ڈرامہ نگار شروع کے چند مختصر سے جملوں ہی سے ناظر کی توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس ڈرامہ کے ماحول اور مکالمہ میں مکمل ہم آہنگی کی جھلک ملتی ہے نہ اس کی زبان تصنع آمیز ہے اور نہ اس میں زندگی کی کوئی خیالی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کے انداز نگارش کی نرم آہنگی میں ہلکے رنگوں کا بیاد بھی ہے اور دھوپ چھاؤں کی آمیزش بھی۔ چنانچہ کرداروں کی ذہنی کیفیت بدلتے ہی آہستہ رو جملوں میں بھی برق رفتاری آجاتی ہے۔ مثلاً

مہراں ---- (لہجے میں ہمدردی) تم روتے رہے لحاف کے اندر! ہائے میں مرجاؤں۔

سراج ---- میاں نے پیٹا جو تھا بُری طرح ۔ پر وہ بھی سچا تھا۔ پچیس تیس کی گاڑی کہاں سے خرید کر دیتا۔

مہراں ---- عزت بھی کتنی بڑی چیز ہے۔ ---- پر میں نے کہا گڈو کے ابا

اس طرح اس ڈرامہ کا آخری جملہ بھی قابل لحاظ ہے۔ مہراں جو ابھی تک اپنے شوہر سے "منحوس" بچہ گاڑی لانے پر لڑ رہی تھی اس کے کھو جانے کے بعد کہتی ہے۔

مہراں ---- ہائے میرے اللہ! دو دو بجے تک کام کرکے یہ پیسے جمع کئے تھے۔ بیچارے نے۔ کتنے شوق سے لایا تھا۔

شاید یہ انسان کے "فردوسِ گمشدہ" کی گھریلو تفسیر ہے۔

میرزا ادیب نے وجود اور حقیقت کی کشمکش میں کہیں کہیں رومانیت کا سہارا لیا ہے۔ ان کی یہ رومانیت اس وقت بھی نمایاں تھی جب انہوں نے آبادی سے بغاوت کرکے صحرا کو اپنی فکر و نظر کا موضوع بنایا تھا۔ ان کی رومان پسندی بھی دراصل جھوٹ، منافقت اور خودغرضی کی قدروں کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اپنی تمام خیال آرائیوں کے باوجود یہ رومان پسندی خارجی حقیقتوں کو محض تخیل کے زور سے اسیر کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ چنانچہ اس رجحان نے طلسماتی تصویروں کے ذریعہ ادب میں صرف ہمارے جذباتی شعور کی ترجمانی کی ہے۔ اس نے خیال کی جدلیاتی حرکت سے نظریں پھیر لی ہیں اور انسانی عمل کے محرکات کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ رومانیت حقیقت کی تلخیوں سے منہ موڑ کر خود اپنی دنیا تعمیر کرتی ہے یا حقیقت کے ایک جزو کو زندگی کے مجموعی اجزا سے الگ کرکے پیش کرتی ہے لیکن رومانیت کو انقلابی رومانیت کے قالب میں بھی ڈھالا جاسکتا ہے۔ جہاں فن کار حقیقتوں کے کامل شعور کے ساتھ حال و استقبال کے ڈانڈوں کو

ملا دیتا ہے۔ ابھی میرزا ادیب کے یہاں رومان اور انقلاب کے رنگوں کے باوجود دونوں کا حقیقت آفریں امتزاج نہیں ملتا۔ ان کے ڈراموں میں اس تخلیقی حرارت کی کمی ہے جو حقیقتوں کو نئے سانچے میں ڈھالتی ہے شاید اس لئے جہاں وہ واضح سماجی بنیادوں سے علیحدہ ہوکر لکھتے ہیں ان کے فن میں کمزوری آجاتی ہے۔ چنانچہ "غزالہ" اور "دیوار" پلاٹ کی باقاعدہ تراش اور کرداروں کے نفسیاتی مطالعہ کے باوجود تمثیل نگاری کے بلند معیار کو نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس کے برخلاف "چور" میں ڈرامہ نگار نے نفسیات کے چور گوشوں کے ساتھ ماحول کے عام گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل میں ایک مسئلہ بازیافتہ خواتین کی جذباتی زندگی کا بھی ہے۔ 'چور' ایک ایسے ہی جذباتی مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور مختلف کرداروں کی جذباتی کیفیتوں کو تقسیم کے پس منظر میں ڈرامہ نگار نے بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ اس ڈرامہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ میرزا ادیب نے پروفیسر جبار کی صورت میں ایک مثبت کردار پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی مستقبل آفریں جدوجہد اور اسے تشکیل دینے والے کردار کم نظر آتے ہیں لیکن جبار کا کردار انسانیت دوستی کے خمیر سے گوندھا گیا ہے وہ ہمدردی کے ساتھ مظلوم ناہید کے دل کا کرب محسوس کرنے کے بعد ایثار و قربانی کی راہ اختیار کرسکتا ہے۔ دراصل ایسے ہی کرداروں سے زندگی کی تنومندی، حسن اور بلندی کا احساس ہوتا ہے۔

میرزا ادیب نے ڈرامائی ہیئت کے سلسلہ میں تجربے بھی کئے ہیں لیکن یہ تجربے انہیں حقیقت نگاری کے راستے سے دور لے گئے ہیں۔ ان کی تصوّر پسندی "لہو اور قالین" اور "رقصِ شرر" میں نمایاں ہوتی ہے۔ وہ یہاں واسطہ اور مقصد میں صحیح توازن قائم نہیں رکھ سکے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تمثیلوں نے میلو ڈرامائی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ وہ اپنی نیک نیتی کے باوجود داخلی تصویروں سے سماجی اقتدار کی توضیح کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ داخلیت حقیقت کی مسخ شدہ تصویر پیش کرتی ہے۔ ان ڈراموں میں "رقصِ شرر" تاثراتی انداز کی موشگافی ہے۔ اور "لہو اور قالین" میں اظہاریت کے دبستانِ خیال سے آب و رنگ مستعار لیا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں کوئی گہرائی نہیں۔ یہ مصنف کے خلوص کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں لیکن ادب میں خلوص اور نیک نیتی ہی سب کچھ نہیں۔ "رقصِ شرر" میں تو وجود کے بجائے ہم محض سائے سے دوچار ہوتے ہیں اور پانی کے بلبلے کی طرح اس کا بنیادی خیال ہاتھ آتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ "لہو اور قالین" میں میرزا ادیب نے کرداروں کے لئے خطِ مستقیم کھینچا ہے۔ اور ایک ہموار سطح پر رکھ کر ان کی بنیادی خصوصیات کا مطالعہ کرنا چاہا ہے لیکن یہ محض جذباتی خاکے ہیں جنھیں ڈرامہ نگار نے ایک پیچیدہ اور استعجاب انگیز پلاٹ کے ذریعہ جوڑ دیا ہے۔ کسی فرد کا طبقاتی کردار کھینچنے کے لئے جس قدر گہرے مشاہدے اور تجزیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کی طرف ڈرامانگار نے پوری طرح توجہ نہیں کی ہے۔ ایک طبقہ کے متنوع کرداروں کے مشاہدہ کے

بعد ہی ہم ان میں عمومیت تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن " لہو اور قالین " میں پہلے سے بنے ہوئے ذہنی خاکہ میں ڈھل جانے کے سبب سے کرداروں میں زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ اسی طرح مسافر فن کے ظاہری تقاضوں کو پورا کرتا ہے لیکن اس کی فضا اسرار، ہیبت اور مافوق الفطرت واقعات کی فضا ہے جس کا اچانک اور غیر متوقع اختتام نوشتۂ تقدیر کی ایشیائی روایات کی یاد تازہ کرتا ہے۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کے بارے میں ایک بات بوثوق کہی جا سکتی ہے کہ ان میں فن کی تقدیس اور زندگی کے احترام کا برابر خیال رکھا گیا ہے۔ وہ پریم چند کی طرح ادبی خدمت کو پوری عبادت سمجھتے ہیں اور بڑی خاموشی و متانت سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے ان ڈراموں میں بعض جگہ زبان و بیان کی کمزوریاں بھی ملتی ہیں لیکن انہیں نظر انداز کئے بغیر بھی ہم ان کی ادبی اہمیت کا اعتراف کر سکتے ہیں۔ چنانچہ " بیٹا " میں خودکشی کے لئے وہ مناسب فضا کی تعمیر میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اور اس لئے اس ڈرامے کا اختتام ایک ذہنی جھٹکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح " دو اجنبی " اپنی پہلی شائع شدہ صورت میں زیادہ قابل قبول تھا۔ دراصل یہ ڈراما خصوصی کرداروں سے زیادہ کرداری علامات کو پیش کرتا ہے اس لئے ڈرامہ نگار نے ان دو کرداروں کو نام دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی ہے۔ ایسی حالت میں حقیقت نگاری کے تقاضے بدل جاتے ہیں اور ان دو کرداروں کی آئندہ رفاقت سے ہمدردی اور انسان دوستی کی ایک مثالی تصویر سامنے آتی ہے۔ یہاں ڈرامہ نگار کا مقصود بھی انفرادی جذبات سے زیادہ انسانی ہمدردی کی تصویر کشی ہے جس کے لئے وہ پہلا اختتام ہی موزوں نظر آتا ہے جہاں شخصی کرداروں کے بجائے وفا کا نسائی روپ اور استقلال کا مردانہ وجود زندگی کی دشوار گزار راہوں پر ہاتھوں میں ہاتھ دیئے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

میرزا ادیب کے ان ڈراموں میں وحدتِ ثلاثہ کے یونانی اصول کی پابندی کی گئی ہے۔ اگرچہ خود ایکانکی ڈرامہ کی حد تک بھی یہ اصول متعدد ڈرامہ نگاروں نے توڑا ہے چنانچہ تھارنٹن وائلڈر (THORN TON NIVEN WILDER) کے ایک ایکٹ کا ڈرامہ " کرسمس کا طویل ڈنر " (THE LONG CHRISTMAS DINNER) کا زمانی وقفہ کم و بیش نوّے سال کا ہے۔ پھر بھی اس اصول کے برتنے سے تاثر کی وحدت پیدا کرنے میں زیادہ کامیابی کا امکان ہے میرزا ادیب کے یہ ڈرامے سنسکرت کے قدیم ڈرامائی تصور سے اس حد تک قریب ہیں کہ کسی مخصوص " رس " کی طرح ان میں بنیادی خیال کی کڑی پابندی کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ڈرامے ایکانکی ڈرامہ کے معیارِ نقد پر بھی پورے اترتے ہیں۔ میرزا ادیب کی فنی گرفت مضبوط ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ڈراموں میں فکر کی تابناکی اور تخلیقی جودت کی کمی نظر آتی ہے۔ کسی نظارہ کی تجلی سے ابھی ڈرامہ نگار کے حواس سرشار نہیں ہیں۔ ڈرامہ نگار کے یہاں زندگی کی ارتقاء کا ہمہ

احساس نہیں ہوتا ۔ اور نہ ابھی ان ڈراموں سے کسی واضح اور مبسوط فلسفۂ حیات کا پتہ چلتا ہے ڈرامہ نگار کے فکر و نظر کی راہیں ابھی پورے طور پر متعین نہیں ہوئی ہیں ۔ اور نہ ابھی اس کی تخلیقات میں انسانی علم اور تجربہ کا نچوڑ ملتا ہے ۔ اس کی کچھ ذمہ داری تو ہمارے مخصوص حالات اور سخت گیر نظام حیات پر بھی عاید ہوتی ہے ۔ جنہوں نے انسانی خوابوں اور تمناؤں کے راستہ میں ظلم کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں ۔ تاریکی کچھ اتنی شدید ہے کہ خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان صدیوں کا فاصلہ معلوم ہوتا ہے ۔ اسی لئے میرزا ادیب کا دائرۂ عمل متنوع ہونے کے باوجود محدود ہے ۔ ان کا فن ابھی جلال و جمال کے رنگوں سے نا آشنا ہے ۔ یونانی ڈرامہ کی عظمت اور جلال یا سنسکرت ڈرامہ کی آسودگی اور جمال کی جھلک ان کے ڈراموں میں نہیں ملتی ۔ اس کے علاوہ عہدِ حاضر کے ڈرامہ نگاروں کے مانند وہ ایک عظیم انسانی ذہن کا پتہ بھی نہیں دیتے ہیں ۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فن کو اکثر زندگی کی انفعالی صورتوں کا پابند بنا دیا ہے اور اس کے اثباتی رخ پر نظر نہیں ڈالی ہے ۔ ورنہ یہاں خونِ دل سے چراغاں بھی ہوتا ہے اور زندگی دار و رسن کی آزمائش میں بھی مسکراتی رہتی ہے ۔ اسی جد و جہد کی آگ سے گزر کر فن میں صلابت، پختگی اور عظمت کے عناصر آتے ہیں ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میرزا ادیب نے جدید نسل کے اضطراب، نا آسودگی، تصور پسندی، انتشار اور بدحالی کی اچھی ترجمانی کی ہے ۔ ان کے فن کے آئینہ خانے میں موجودہ عہد کی بیکاری اور بیزاری کا صاف اور واضح عکس ملتا ہے ۔ قوت اور توانائی نہ سہی یہ ڈرامے اضطرار اور آرزومندی کے مظاہر ضرور ہیں ۔ اور اس طور پر زندگی کی جدید صورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ میرزا ادیب انسانیت دوست ادیبوں کے اس قافلہ میں شریک ہیں جو زندگی کی جمہوری روایتوں کا احترام دل میں لئے آگے بڑھ رہا ہے ۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

"میرؔ"

باقر مہدی

صفیہ اختر

(خطوط کے آئینے میں)

ڈاکٹر جانسن نے سب سے پہلے یہ شہور جملہ خطوط کے بارے میں کہا تھا جو آئے دن ہم استعمال کرتے رہتے ہیں۔ "مادام! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آدمی کے خطوں میں اس کی روح عریاں ہو جاتی ہے؟" ظاہر ہے یہ جملہ ان خطوں کے بارے میں کہا گیا تھا جو اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے جاتے ہیں۔ ورنہ یہ ہر ایک ادیب یا شاعر کے بس کا کام نہیں ہے کہ وہ اپنے بے تکلف دوستوں، رشتہ داروں اور محبوباؤں کو جو خطوط لکھتا ہے اُسے خود شائع کرا دے۔ خطوط ادب کی کسی خاص صنف سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود خطوط سے جتنا ذہنی لطف حاصل ہوتا ہے وہ شاید ہی کسی اصنافِ ادب کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہو۔ خطوط میں زندگی کے ان دستاویز کا سارا کرب اور ساری خوبصورتی سمٹ کے آجاتی ہے۔ شخصیت کے سارے پیچ و خم یوں کھلتے چلے جاتے ہیں جیسے کسی "طلسمی دنیا" کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ جذبات کے ناپید اکنار سمندر کی گہرائی صفحۂ آرٹ پر موج در موج اترتی چلی آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سیلاب سا آگیا ہے۔ جس کی زد سے سنجیدہ سے سنجیدہ قاری کا بچنا محال ہے۔ وہ باتیں جو ہونٹوں پر آنے کی جرأت نہیں رکھتیں بڑی بے باکی سے خطوط میں بے نقاب ہو جاتی ہیں اور ان باتوں کی وجہ سے شخصیت میں رنگینی اور شگفتگی آجاتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ خطوط انسان کے بہترین جذبات کی ترسیل کا ذریعہ ہیں۔ ان میں وہ موہوم اور خوابناک خیالات جنم لیتے ہیں، جن کی آرزو ہر دل میں مچلتی رہتی ہے۔ خطوط کے بارے میں متضاد رائیوں کا اظہار بہت کم ملتا ہے البتہ مختلف جذباتی ردعمل کا امکان رہتا ہے ——— خطوط ہمیں عظیم انسانوں کی بہترین اور بدترین خصوصیات سے روشناس کراتے ہیں۔ ان میں وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے شخصیتوں کی تعمیر کی پوری تاریخ اپنے سارے پیچ و خم کے ساتھ آئینہ بن کے سامنے آجاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر خطوط، تاریخ اور سوانح عمری کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم خطوط کو سوانح عمری کی ایک صنف کہہ سکتے ہیں۔ روزنامچہ لکھنے کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسے دور میں خطوط کی ادبی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مشہور امریکی مورخ

ل بیکر (CAR L BACKER) نے بڑی اچھی طرح خطوط کے بارے میں کہا ہے کہ :۔

" انسانوں نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں ان واقعات کا ریکارڈ تو ہر صورت میں مل جاتا ہے لیکن ان واقعات کو رونما کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیت کا کتنا حصہ ہے اس کا علم صرف خطوط سے ہو سکتا ہے جذبات اور جبلّتوں کے پیچیدہ اور پوشیدہ رازوں کو خطوط ہی میں کھلنے کا موقع ملتا ہے ۔"

اس طرح یہ معلوم کرنا کہ اہم نظریات اور خیالات کی تخلیق کرنے والے کی ذہنی حالت کیسی تھی اور اس پیچھے کون کون سی باتیں تھیں ، ان محرکات کا پتہ صرف خطوط ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے ۔

مجھے " زیرِ لب " پڑھتے ہوئے خطوط کی زندگی میں اہمیت کا اندازہ ہوا تھا جس کا اظہار میں نے تمہید ں کر دیا ہے ۔ " زیرِ لب " مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کی بیوی صفیہ مرحومہ کے خطوط کا مجموعہ ہے ان کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے ۔ یہ خطوط بظاہر صفیہ اور اختر کے دو سال کی زندگی کی داستان ہیں لیکن ن میں اس دور کی پوری کہانی ملتی ہے جس میں زندہ رہنے کی جد و جہد کے باوجود زندگی کو پنپنے کے مواقع نصیب یں تھے ۔ جاں نثار اختر جب بھوپال کو بعض سیاسی اور سماجی وجوہ سے چھوڑ کر اور ترک ملازمت کر کے بمبئی ملے آئے تھے ۔ تب ہی سے صفیہ کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اور اس خلا کو پر کرنے کا صرف ایک ذریعہ ھا یہ خطوط ہی ایک دوسرے کو باخبر رکھتے تھے ۔ ان خطوط میں ایک ہندوستانی عورت کا عظیم کردار اپنی وری تابناکی کے ساتھ جلوہ فگن ہے ۔

صفیہ مرحومہ سے میری ملاقات میرے عزیز دوست پروفیسر ابو سالم (علی گڑھ یونیورسٹی) نے کرائی ھی ۔ میرے ذہن میں اس ملاقات کے نقوش آج تک محفوظ ہیں ۔ وہ بیمار تھیں اور میں ان کو دیکھنے گیا تھا یرے محترم دوست مجاز بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کے چہرے سے زندگی کی کربناک جد و جہد کا پتہ چلتا تھا ۔ کمزوری اور خون کی کمی کی وجہ سے پیشانی پر بار بار پسینہ آجاتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی اور موت کی کشمکش تیز تر ہوتی جا رہی ہے ۔ شمع رہ رہ کے جھلملا رہی تھی ۔ لیکن ان کی باتوں سے ناقابلِ شکست عزائم کا پتہ چلتا تھا ۔ میں نے آج تک کسی مریض کو اتنا حیات بخش نہیں دیکھا ہے ۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ حسرتوں اور ارمانوں کی راکھ بن کر رہ گئی ہیں ۔ اس لئے جب " زیرِ لب " شائع ہو کر آئی تو میں نے ایک ہی رات میں پوری ختم کر ڈالی ۔

صفیہ نے اپنے پہلے خط میں جس ہمّت و استقلال کے ساتھ اختر سے مجبوراً علیحدگی کو برداشت کیا ہے وہ ہمارے گھروں کی عورتوں میں خال خال نظر آتا ہے ۔ یہ خط ملاحظہ ہو ——

کچر

محبوب منزل

بھوپال ۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء

عزیز اختر!

"شدید انتظار کے بعد خط ملا استعفیٰ میں آج پرنسپل کے پاس نہ پہنچا سکی، وہ جا چکا تھا کل صبح لے جاؤں گی۔ تم نے استعفیٰ دیدیا اچھا کیا۔ ایک طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یونہی ممکن تھا۔ اگرچہ دوسری جانب بھوپال کی زندگی کی سہولتیں اور کالج کی ملازمت کشش انگیز تھی میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی، میرے لئے یہ فیصلہ مشکل ہوتا بہرحال تم نے اپنے عزم کا ثبوت دیا۔ اور سچ جانو میں تمہاری فوقیت کے احساس سے سر جھکا دینے پر تیار ہوں۔

تمہیں کل ہی پیسے روانہ کروں گی۔ تمہیں اس طرح واقعتاً سخت تکلیف ہوگی بے تکلف ہر ضرورت اور ہر پریشانی سے مطلع کرتے رہنا۔ ہاں عصمت آپا کے یہاں ایک آدھ ماہ گزارا کر لو تو اچھا ہے۔ شاید سے تمہارا پرانا خلوص ہے۔ اور عصمت آپا کو تمہارے (CAUSE) سے خلوص ہے ظاہر ہے کہ ان لوگوں پر تم کبھی بار نہ ہوگے۔ اس طرح سے سوچنا تمہاری زیادتی ہوگی

اور ——— خود کو کسی طرح متاثر نہ کرنا۔ اچھے برُے وقت سب گزر جاتے ہیں پریشانی کا مقابلہ عزم اور استقلال سے کرنا اخلاقی بلندی کی دلیل ہے۔ جذباتی طور پر اپنی بیروزگاری کا صدمہ نہ لے بیٹھنا۔ ظاہر ہے کہ اگر تم چاہو تو تمہاری ٹھاٹھ دار ملازمت آج بھی تمہاری منتظر ہے۔ لیکن یہ تو اپنی (CHOICE) کا سوال ہے۔ اس پر خود ہی جی کو کڑھانا کیسا؟ اپنی تندرستی کی طرف سے لاپرواہ ہو کر بری طرح دوڑ دھوپ میں بھی مت لگ جانا۔ خدانخواستہ بیمار حیران ہونے کی نوبت نہ آجائے میرے دوست!

میں تم سے علیحدگی کے دن پوری ہمت اور پورے استقلال کے ساتھ گزار لونگی۔ کالج کی دنیا، گھر کی دنیا سبھی کچھ تو میرے لئے اجڑ گیا۔ مگر اختر! بہت سے لوگ تو تم سے بھی زیادہ پریشانیاں اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں تو ان کی طرف دیکھنا ہوگا۔ اپنے قلم کو میں طول نہیں دوں گی ———"

——— پہلے خط کے اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ صفیہ زندگی کی قدروں کی پرکھ رکھتی ہیں۔ اچھے اور بلند مقاصد کے لئے صدمات اٹھانا جانتی ہیں۔ اس خط میں کتابی باتوں کو نہیں دہرایا گیا ہے بلکہ روزانہ کی زندگی نے جو باتیں سکھائی ہیں ان کا حقیقت پسندانہ اظہار ہے مجھے یہ خط پڑھ کے مشہور انگریزی شاعر ورڈس ورتھ "(WORDS WORTH) کی نظم مکمل عورت" یاد آجاتی ہے جس کے آخری بند میں اس نے کہا ہے کہ "وہ مجھے تسکین و آرام بھی دیتی تھی مشورے اور احکام بھی"

اس خط میں بھی عزم، ہمت اور استقلال کا بار بار استعمال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کس طرح سے اپنے غم کو چھپا کر اختر کو زندگی سے برسرپیکار ہونے کا سبق دے رہی تھیں ظاہر ہے یہ اُس وقت کا خط ہے جب جدائی کا زخم تازہ تھا۔ اور یادوں کے پھول مہک رہے تھے۔ اس حالت میں جس اعلیٰ اور ارفع خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ کسی معمولی شخصیت کی عورت کا کام نہ تھا۔

وہ اپنے محبوب دوست اور شوہر سے دور جب نینی تال کی حیات بخش سرزمین میں چند دن گزارنے جاتی ہیں تو بھی ایک لمحہ کے لئے اختر کی یادوں کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ یہ خط ملاحظہ ہو۔

نینی تال - ۱۶ رجون ۱۹۳۸ء

اختر عزیز!

بار بار جی چاہا کہ تمہیں لکھوں کہ کسی طرح مجھ تک نینی تال پہنچ جاؤ۔ آگرے سے سیدھی گاڑی کاٹھ گودام آتی ہے مگر اس ڈر سے نہ لکھ سکی کہ تم منظور نہ کروگے۔ یہ دن کیسے تڑپ اور ترس کے گزر گئے۔ زندگی کیسی کھوکھلی اور ادھوری رہی۔ اختر اگر تمہارا جی چاہتا ہے تو تم دنیا کی ہر مصلحت کو ٹھکرا کر میرے پاس آجاؤ۔ میری آغوش تم کو پناہ دے گی اور میں تمہیں پاکر دنیا کی ہر راحت پالوں گی۔ پیسوں کی خاطر جو ہم تم دونوں اس بے دردی سے اٹھا دیا کرتے ہیں۔ خود کو اس طرح ہلکان کر دیں اس کی قائل نہیں ــــــ

تم نے مجھے ڈیڑھ سو روپے بھیج دیئے جبکہ تمہیں تین سو ہی ملے ہونگے۔ صرف ڈیڑھ سو میں تم مہینہ کاٹوگے۔ تم نے اپنے ساتھ اور میرے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ اختر! کل سے آج تک میں پیسے پاکر بڑی مسرور اور فتح مند تھی۔ آج مجھے جرم کا احساس ستا رہا ہے۔ میں اس دریا دلی سے پیسے اٹھاؤں، اور تم اتنے بڑے شہر میں پیسہ گن گن کر خرچ کرو، یہ کہاں کی محبت ہے۔ دوست میں نے صبح باون روپے کی شال، دس کی چھتری، پندرہ کا ایک کشمیری نمدہ اور سترہ کی ایک میز خرید لی ہے۔ شام کو تمہارا خط ملا اختر! مجھے اس درجہ نہ چاہو۔ تمہاری دیوانی محبت سے آج مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔ تم اپنے کو مجھے چاہنے دو۔ مجھے تمہیں چاہنے میں ہمیشہ راحت ملی ہے۔

میں اب ہر تفریح اور ہر سیر کے موقع پر مجرم محسوس کروں گی۔ میں آج ہی سامان پلندہ کرنا شروع کروں گی اور جلد سے جلد روانہ ہونے کی کوشش کروں گی۔ تم وہاں تنہا پریشان ہوتے رہو اور میں غم غلط کرنے کی کوشش کروں، یہ برداشت سے باہر ہے۔

عجیب جبر سا محسوس ہوتا ہے اختر! میں ادنیٰ سی نوکری کے سہارے بھی تم تک پہنچ سکوں گی۔ اگر یہ بچے درمیان میں حائل نہ ہوتے۔ تو میں بغیر نوکری کے بہانے بھی آہی جاتی۔ کیا تم میرا پیٹ نہ بھر سکتے تھے

پران الجھنوں کو دیکھتے ہوئے بچوں کی ذمہ داری کا احساس کھٹکتا ہے ۔دوست ! اچھا تم اس کا جواب اب لکھنؤ کے پتے پر لکھنا تاکہ میں یا اکیس کو بھیج وہاں مل سکے ۔

آؤ بہت سا پیار کروں تمہیں !——— تمہاری صفو"

——— میں نے یہ پورا خط نقل کر دیا ہے ۔اس میں صفیہ کی متوازن شخصیت کے تین پہلو ایک ساتھ ملتے ہیں ۔ایک طرف وہ نہایت جذباتی انداز میں اجاڑ دن اور سنسناتی ہوئی رات کا ذکر کرتی ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفیہ کی محبت جدائی کے لمبے دنوں اور نیند اڑانے والی کالی راتوں میں اور شدید اور گہری ہوتی جا رہی ہے اور برہا کی آگ انھیں جلائے دے رہی ہے ۔دوسری طرف وہ اختر کے پاس سے روپیہ پاکر بہت خوش ہوتی ہیں ۔اور بہت سی چیزیں خرید لیتی ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے انہیں خیال آتا ہے کہ ان کا محبوب بمبئی جیسے بے رحم شہر میں پیسے گن گن کر خرچ کرتا ہوگا ۔پہلے پیراگراف کی محبوبہ یہاں ایک درد مند بیوی کے روپ میں نظر آتی ہے جو تھوڑے سے پیسے خرچ کر دینے کے بعد یہ سوچتی ہے کہ کہیں وہ فضول خرچی تو نہیں کر رہی ہے جبکہ اس کا "شوہر" در بدر کی ٹھوکریں "کھا رہا ہوگا اور یہ "احساس جرم" (جو حقیقت میں کوئی جرم نہیں ہے) اسے وقتی خوشی سے بھی محروم رکھتا ہے ——— وہ یہ دیکھ کر بھی ایک معصوم عورت کی طرح خائف ہو جاتی ہے کہ کہیں زیادہ محبت کرنے کی بازی بھی اختر نہ لے جائیں ۔ہماری ہندوستانی عورت کے کردار کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ اپنے محبوب اور شوہر سے اس کے مقابلہ میں زیادہ اور تیز تر محبت کرتی ہے ۔یہ جذبات کی بہت ہی نازک کہانی ہے ۔ جس کے لئے شاعروں اور ادیبوں نے لاکھوں صفحے نذر کئے ہیں ۔——— شخصیت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ جدائی کے غم کو ختم کرنے کے لئے ہر حال میں محبوب کے پاس رہ کر زندگی گزارنا چاہتی ہیں ۔یہ ایک ساتھی کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے ساتھی کا ہر کڑے وقت میں مددگار رہتا ہے ۔محبت ہی ایسی دولت ہے جو دو افراد کے اتصال سے اور بڑھتی ہے ۔اور جدائی اس کو زیادہ شدید کر دیتی ہے ۔مگر بچوں کے مستقبل کا خیال انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ صبر اور شکر سے حالات کا مقابلہ کریں ——— اسی طرح وہ (ص ۴۲) پر بچوں کو دیاں لکھنے کے بعد فوراً یہ بھی لکھتی ہیں کہ "اگر ایسے حالات میں یہ نہ ہوتے تو زندگی بھی مشکل ہو جاتی ———" یہ خیال بذاتِ خود بہت ہی صحت مند ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور خوش آئند بنانا چاہتی تھیں ۔

ایک جگہ وہ اختر کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "اسٹیفن والی بات جواب دینے قابل ہے دوست ! تم جانتے ہو ! میرا پیار ہے تو تم سے اور میری زندگی ہے تو تم سے ! مجھے کسی اسٹیفو

نوعت نہیں ، اب تک میری پارسائی نے تمہیں پارسائی کی تلقین کی ہے اور تم نے مجھ سے درس وفا لیا ہے ۔اس سے
انکار نہ کرنا ! پھر میں ایسی قیمتی شے کس طرح کھو سکوں گی جس کی بنیادوں پر میری تمہاری بے لوث محبت کی عمارت تعمیر ہوئی ہی
یں تمہارے لئے ہی پیدا کی گئی تھی ۔ تمہارے انتظار میں زندہ رہی پروان چڑھی اور مرتے دم تک تمہاری ہی رہوں گی ۔
ے لئے تم ہی سب کچھ ہو ، میری عزت کے محافظ ، میرے بچوں کے نگران ، میرے دوست ، ساتھی ، رفیق ، اور پھر ایک
وستانی عورت کے ساجن !

آؤ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دو ، میری دنیا جگمگا اٹھے گی ۔"

" تمہاری اپنی صفو "

——— یہ چند جملے کسی اچھے سے اچھے رومانی افسانے کا حصہ بن سکتے ہیں مگر پھر بھی ان کی حقیقت
بدیل نہیں ہو گی ان میں جو گہرا خلوص ، جو دردمندی ہے وہ عورت کی اچھی خصوصیات کی بہترین مثال ہے ۔ مجھے یہ جملے
ڑھ کر الیزبتھ[۱] بارٹ براؤننگ کا وہ خط یاد آگیا جو اس نے اپنی بہنوں کے نام لکھا ہے اور جس میں اپنے محبوب شوہر
کا اسی طرح ذکر کیا ہے اور اس بات کا خاص کر ذکر کیا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے تھے ۔ اس
خط کو لکھے ہوئے ایک صدی گزر چکی ہے ۔ (یہ خط ۲ ر اکتوبر ۱۸۴۶ء میں روما (Ro AME) سے لکھا گیا
تھا) لیکن اپنی بے پناہ محبت کی وجہ سے یہ خط آج بھی بار بار پڑھنے کے لائق ہے ۔ ——— مجھے صفیہ کے ان خطوط
کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ ان کی شخصیت میں رومانویت کے اچھے عناصر ہیں وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں
شوہر اور محبوب کے لئے دو الگ الگ شخصیتیں نہیں ہیں ۔ یہ خالص ہندوستانی تصور ہے کیونکہ ہمارے سماج میں
محبوب کو ہمیشہ یا زیادہ تر شوہر کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ۔ محبوب کے خیالی آدرش کو اس سے الگ کر کے نہیں
دیکھا گیا ہے جیسا کہ یورپ کے ممالک میں یا پوری رومانوی تحریک میں ملتا ہے ۔ ہندوستانی عورت کے محبوب کا تصور
اس کے "مجازی خدا" کا بھیس بدل کر ہی آتا ہے ۔ یہاں صنعتی انقلاب نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں تیزی سے آج تک
تبدیلی نہیں ہوئی ہے ۔ اور کبھی کبھی تو ایسا خیال آتا ہے کہ وقت کی رفتار اس ملک میں آکر نہایت سست ہو گئی ہے اس
کے باوجود صفیہ کے خطوط میں جو عورت کی شخصیت ابھری ہے وہ تمام تر ہندوستانی ہوتے ہوئے نئی بھی ہے اور
نئی ان معنوں میں ہے کہ وہ اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو ایک طرف تو تعلیم یافتہ ہے دوسری طرف تعلیم سے
مذہبی زندگی میں فائدہ اٹھانا بھی جانتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ شعوری طور سے اس آئیڈیالوجی سے خود کو وابستہ
کر چکی تھیں جو مستقبل کا معمار ہے اس لئے ان کی رومانویت میں مریضانہ عناصر نہ آسکے وہ اختر سے شدید محبت کرتی

---

[۱] مشہور انگریزی شاعر براؤننگ کی بیوی (ELIZEBETH BARRETT BROWNING)

تھیں اور ان کی الگ شخصیت بھی تھی یہ نہیں ہے کہ وہ اختر کا عکس بن کے رہ گئی ہوں۔ یہ عشق کا نیا تصور کرتا ہے جس میں ایک دوسرے میں گم ہو جانے کے بجائے اپنی شخصیت کی تعمیر میں مددگار و معاون بننا پڑ اس لئے ایک روح دو قالب والا پرانا خیالی عشق آج کے دور میں" بیدار اور باشعور عشاق" کے لئے کشش نہیں رکھتا ہے۔ بقول ایک شاعر ؎

آج کے دور میں الفت کے نئے عنوان ہیں!

کوئی دیوانہ نہیں کوئی نہیں خاک بسر

صفیہ کے ان خطوط میں جس عشق کا تصور ملتا ہے وہ یہی ہے ——— ان کے اس خط اسٹیفن کا ذکر ملتا ہے۔ یہ "دی ویل آف لونلی نس" کا اہم کردار ہے۔ شاید اختر نے انھیں چھیڑنے کے اس کا ذکر کیا تھا۔

جن لوگوں نے کیتھرائن مینسفیلڈ (KATHERINE MANSFIELD) کے خطو ہیں انھیں صفیہ کے خطوط پڑھتے وقت اُن خطوط کی ضرور یاد آتی ہوگی۔ مجھے تو حیرت ہوگئی کہ بعض خطوط اسی جذبے اور خیال کا ذکر ملتا ہے جو صفیہ کے یہاں ہے یہ توارد و نہیں ہے بلکہ عورت کسی بھی ملک کی ہو وہ ج پورے خلوص سے محبت کرتی ہے تو بڑی حد تک یکساں ہوتی ہے۔ یہ کردار کی ایسی خوبی ہے جو عمومیت رکھتے ہ بھی بڑی انفرادی ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی گھریلو باتوں کا ذکر۔ وہی موسم کا (یہاں موسم کا مقابلتاً کم کا ذکر کیا رومانوی انداز بیان، برسات اور خوبصورت چاندنی راتوں کا دلفریب انداز میں ذکر، وہی روپے کے خ کرنے کا حساب، وہی کمرے کو سجانے کی دھن، اور سب سے بڑھ کر وہی برہا کی آگ میں جلتی ہوئی روح ——— اس کے باوجود ٹنک (Tig کیتھرائن کا قلمی نام) اور صفو کی شخصیتیں بہت مختلف ہیں۔ اور ان وہی فرق ہے جو ایک ہندوستانی اور انگریزی کی شخصیت میں فرق ہونا چاہیئے۔ اب تو میں جب کبھی کیتھرائن کے خ پڑھتا ہوں تو صفیہ کے خطوط اور جب صفیہ کے خطوط پڑھتا ہوں تو کیتھرائن کے خطوط یاد آتے ہیں۔ ——— شا مجھ سے اس بات پر لوگوں کو اختلاف ہو کیونکہ کیتھرائن کی انگریزی افسانوی ادب میں بڑی اہمیت ہے اور ا خاص مرتبے کی مالک ہے۔ اس کے مقابلے میں صفیہ کی ساری ادبی اور غیر ادبی شخصیت اس کے خطوط م ہے میں نے تو دونوں کے خطوط کا مقابلہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انداز بیان اور جذبات نگاری کے لحاظ کے خطوط کسی لحاظ سے بھی کیتھرائن کے خطوط سے کم نہیں ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ کیتھرائن اپنی زندگی میں

سے

رتی ۔ اور صفیہ موت کے بعد ایک صاحب طرز ادیبہ بن گئی۔ صفیہ کے یہ خطوط اردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ
چکے ہیں۔ البتہ یہ سانحہ ہمیشہ یاد رکھا جائیگا کہ اس کو لکھنے والی ایک اچھی ادیبہ کے تمام عناصر اپنی شخصیت میں
ی تھی مگر کم عمری کی موت نے اردو ادب کو اس سے محروم کر دیا ـــــ کیتھرائن ہر روز خط لکھتی تھی اور یہ سلسلہ
عرصہ تک رہا' صفیہ بھی ہفتہ میں کم از کم دو خط ضرور لکھتی تھی ۔ اور دونوں کے یہاں ڈاک اور پوسٹ مین کا انتظا
ہی شدید ہے۔ جتنا کہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ کیتھرائن کا پورا دن اداسی اور ذہنی پریشانی میں گزر جاتا تھا اگر
ی خط نہیں آتا تھا یہی حال صفیہ کا ہے ایک دوسرے کو خط کے لئے سخت بے چینی رہتی تھی اور خط ملنے پر
یت مسرت ـــــ

صفیہ کے ان خطوط کو غور سے پڑھنے والے ان کے متوازن ادبی مذاق کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ
عمری کی نظم ہو، کرشن چندر کا افسانہ ہو یا ندیم کی افسانہ نگاری یا علی عباس حسینی کی کتاب " ناول کی تاریخ
تنقید " ہو۔ ان سب پر چند جملوں میں جامع تنقید کر جاتی تھیں ۔ ان کے خطوط میں ہارڈی کے ناول کا تذکرہ بھی ملیگا
ر ساتھ ہی ساتھ اردو میں کوئی عظیم ناول نہ ہونے کی شکایت بھی ۔ اس لئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ صفیہ میں
ک اچھے ادیب بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں، تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے ۔

عورت کی شخصیت میں ماں اور محبوبہ یا بیوی کے تمام عناصر ایک دوسرے میں جذب رہتے ہیں ۔
جملے ملاحظہ ہوں :-

" اچھا آؤ معصوم بچوں کی طرح ہر آلودگی سے پاک ہو کر میرے سینے پر سر رکھ دو اختر!
ں کبھی کبھی تمہیں وہ محبت بھی دے سکتی ہوں جو بچے کو ماں سے ملتی ہے تاکہ وہ پروان چڑھ سکے۔"
(صفحات ۱۸۰-۸۱ " زیر لب")

اسی طرح وہ زندگی کی اہمیت کا ذکر کرتی ہیں تو غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز ❊ صبر کرتے ہی بنے گا غالب

ان کی مہلک بیماری شروع ہو چکی ہے ۔ لیکن وہ یہ جملے لکھ کر اختر کو زندگی سے پیار کرنے کی تلقین کرتی
ں ـــــ " آؤ میری جانب دیکھو پیارے ، ملائمت سے آج سے میں تمہارے دل میں بھی ایسے
لات کا آنا نہ برداشت کروں گی، تمہاری زندگی، تندرستی اور مسرتوں کی مجھے ضرورت ہے، میرے بچوں کو ضرورت
، تمہارے ادبی حلقہ کو ضرورت ہے، خود آج زندگی کی بڑھتی ہوئی تحریک کو ضرورت ہے تم اس طرح جینے کے مفہوم
بعض وقت محدود نہ کر لیا کرو، خود کے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیو، پھر غم تمہارے پاس بھی نہ پھٹکے گا ۔"
صفیہ کی موت کو عرصہ ہو چکا ہے لیکن آج بھی یہ جملے عمل، جدوجہد اور زندگی سے محبت کرنے کا پیام

دیتے ہیں ان جملوں کو پڑھتے ہوئے دل کی دھڑکن تیز تر ہو جاتی ہے اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ جاگ اٹھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک انجانی قوت ان خطوط میں پوشیدہ ہے جو آدمی کو بہتر آدمی بننے پر مجبور کرتی ہے۔

ان خطوں کے انداز تخاطب پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے زیادہ تر انہوں نے عزیز اختر یا میرے اپنے اختر کا استعمال کیا ہے۔ اور اپنے کو صرف تمہاری صفو۔ لیکن صرف ایک خط میں (جس کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے) خود کو " تمہاری دوست ساتھی اور دلہن " بھی لکھا ہے۔ عورت خود کو دلہن لکھ کر اپنے شوہر کی عمر دراز کی متمنی رہتی ہے اور اس دعا کو اتنے خوبصورت طریقے سے کہنا ایک خوبصورت دماغ ہی کا کام تھا۔ ــــــــ ان کا جمالیاتی ذوق کسی شاعر سے کم نہیں تھا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں " یہاں ایک نوخیز نورا بھی موجود ہے۔ گو کہ اس کا مس کرجی بھاتنے عرصے کے بعد یہ تلاش کامیاب ہوئی۔ اتفاق سے میرا ہاؤس سرجن بھی خوبصورت واقع ہوا ہے اور تم جانتے ہو کہ خوبصورتی مجھے کھینچتی ہے البتہ یہ ضرور جی چاہتا ہے کہ تم بھی میرے خط میں شریک ہو سکتے۔ کبھی کوئی خوبصورت چیز دیکھوں تو تمہاری موجودگی اور تمہاری شرکت کی تشنگی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ مجھے " ــــــــ

یہ خط اس وقت لکھا گیا ہے جب صفیہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو چکی تھیں اور انہیں اپنے مہلک مرض کا پورا علم تھا لیکن کہیں بھی شدید مریضانہ اداسی یا موت کی آرزو نہیں ملتی ہے۔ یہی بات ہے کہ ان کے اس دوران کے خطوط اور بھی حیات بخش ہیں۔ یہ ایک بلند شخصیت کی نشانی ہے۔

دنیا کے عظیم خطوط کو مرتب کرتے ہوئے ایم۔ لنکن سپیسٹر (M. L. SEPASTER) نے اپنے دیباچہ میں بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے۔ جن میں عشقیہ سے لے کر تاریخی اور سیاسی خطوط بھی شامل ہیں اس کا خیال ہے کہ خطوط کو عظیم بنانے میں گہرا خلوص، موڈ کی صحیح تصویرکشی اور والہانہ انداز بیان کا بڑا دخل ہے۔ اس لحاظ سے صفیہ کے خطوط کو یقیناً اس کی کتاب میں جگہ مل سکتی ہے۔ یہ عشقیہ خطوط نہیں ہیں لیکن ان میں عشق کی بیتابی اور ساری کشش موجود ہے۔ یہ ادبی خطوط نہیں ہیں لیکن ان کی ادبیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خطوط صفیہ کی شخصیت کی آئینہ داری کرتے ہیں اور جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ ان کی شخصیت میں صحت مند رومانی عناصر، سماجی شعور، سیاسی سوجھ بوجھ اور نکھرا ہوا ادبی مذاق کا امتزاج ملتا ہے۔

آخر میں ان کے آخری خط کا اقتباس دینا ضروری ہے جو اس پوری داستان کا صحیح خاتمہ ہے۔

" اختر آؤ! تم مجھے مرنے نہ دو، میں مرنا نہیں چاہتی۔ البتہ میں تھک بہت گئی ہوں ساتھی! آؤ میں تمہارے زانو پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں۔ پھر تمہارا ساتھ دینے کے لئے میں ضرور ہی اٹھ کھڑی ہونگی ــــــــ "

گجر

یہ خط ان کے انتقال سے صرف بیس دن پہلے لکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کو پڑھتے ہوئے قاری کی
ہیں نمناک ہوجاتی ہیں۔ ساری جدوجہد کے بعد بھی زندگی بظاہر فتح نہ حاصل کرسکی اور ایک طویل
رکی خواہش پوری ہوگئی۔ لیکن اس خط میں غم اور مسرت کے ملے جلے جذبات نے امید اور مایوسی کی دھوپ
ؤں نے، اور موت اور زندگی کی آخری کشمکش نے، جو ادبیت بخشی ہے وہ کہانی کو نقطۂ عروج پر
پاکر انجام کو اور بھی حیات بخش بنادیتی ہے ——— صفیہ اختر کی زندگی ایک مسلسل کشمکش اور
دجہد کی داستان ہے کبھی حالات سے اور کبھی موت سے ———

یہ خطوط اردو ادب میں ایک بالکل ہی جداگانہ مرتبہ کے مالک ہیں۔ ان کا مقابلہ نہ تو غالب کے
ط سے کیا جاسکتا ہے اور نہ شبلی کے۔ "زیر لب" سے پہلے اردو ادب میں ایسے خطوط کا کوئی دوسرا
عہ نہیں نظر آتا۔ دوسرے اردو ادب کی تاریخ میں صفیہ اختر ہی کا پہلا نام ہوگا جن کو صرف ان کے
ط کی وجہ سے یاد کیا جائیگا۔

○

انسان کو چاہیئے کہ وہ زندگی سے محبت کرے اور موجودہ نظام نے اس کے ارتقا کی
راہ میں جو خار بچھا دیئے ہیں۔ اس کے کرب و اضطراب سے اپنے سینے کو گرمائے
تاکہ اس کا روشن ضمیر ایک صحت مند آگ سے ہمیشہ دہکتا رہے۔

گجر

فراق گورکھپوری

○

حیاتِ عشاق گردشِ شام و سحر کے پھیر میں نہ آئے
تری نظر رات بھی ہے دن بھی وہی سلائے وہی جگائے

بہار اک جلوۂ دل آرا ، بہار آئے بہار جائے
کوئی ہو موسم وہ جسمِ رنگیں مری نگاہوں میں لہلہائے

نہ پوچھ کیا کام کر گئی ہے ، دل و نظر میں اتر گئی ہے
تری نظر سب کو آزمائے ، تری نظر کون آزمائے

شگفتہ دل کو نہ کر سکے گا رکا رکا زیرِ لب تبسم
میں ان لبوں پر کبھی تو دیکھوں وہ مسکراہٹ جو مسکرائے

کلیجے چھنک چھنک کے رہ گئے ہیں دلوں پہ وہ بجلیاں گری ہیں
کہاں پہنچتی ہیں وہ نگاہیں بھریں جو پلکوں کے سائے سائے

یہ رنگ و نورِ انساں ، یہ شعلہ سازِ حسنِ انساں!
جو تجھ سے کافر کا سامنا ہو ، چراغِ کعبہ بھی جھلملائے

کلیم کو بات کا سلیقہ نہ ہو تو اس کا علاج ہی کیا
جو چھیڑ دوں میں تری کہانی برقِ ایمن کو نیند آئے

وہ چھاؤں تاروں کی جس کے نیچے رموزِ کونین کھل رہے ہوں
وہ خواب آلود آنکھ جس دم سکوتِ شب کے بیاں سنائے

حیاتِ فانی سے بڑھ کے فانی ، نگاہ برق و شرر سے کمتر
یہ عشق ہے تو سلام اپنا ، یہی وفا ہے تو باز آئے

سُنی نہیں تو نے یہ کہاوت کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل"
کبھی تو دیکھوں تجھے خدارا مغائرت کا حجاب اُٹھائے

یہی ہے تیری نظر کا اُٹھنا ، یہی ہے تیری نگاہ ہونا
کہ رات کی سرمگیں فضا میں شعاعِ مہتاب تھرتھرائے

تو اس طرح یاد آ رہا ہے کہ شامِ غم میں یہ ڈر رہا ہوں
کہیں نہ آ جائے میرے دل میں وہ یاد جو تجھ کو بھول جائے

تری رسا کاریوں کے قائل رموزِ سربستۂ دو جہاں کے
ترے نثار اے خیالِ گیسو خدا تری زندگی بڑھائے

ہ ایک ہو گئے ہیں خیال میرا جمال تیرا — نہیں ہے فرق ان میں اب سرِ مُو اسے نکالے سے چھپائے

ت بیداریِ مسلسل، ممات اک خواب جو نہ ٹوٹے — نشاط کی غفلتوں سے بہتر وہ غم جو انسان کو جگائے

ہا دل تڑپ تڑپ کر بیک ادا مٹ کے رہ گئے ہیں — نہ پوچھ کیا ان دلوں پہ گزری جو رہ گئے تھے بچے بچائے

روح و روانِ مجمع، وہی ہیں شمع و چراغِ محفل — جو بیٹھے ہیں تیری انجمن میں مٹے مٹائے بجھے بجھائے

رکار نگیں سکوت گویا نوائے سازِ جمال بھی ہے — جو نرگسِ ناز مسکرائے، تری جوانی بھی گنگنائے

توں اور دیوتاؤں کا بھی جہاں سے دشوار تھا گزرنا — حیات کوسوں نکل گئی ہے تری نگاہوں کے سائے سائے

ر ہو علم و فن میں یکتا، اگر نہ ہو عشق آدمی میں — نہ ایک ذرّے کا راز سمجھے، نہ ایک قطرے کی تھاہ پائے

طاب بے لفظ کر گئے ہیں، پیامِ خاموش دے گئے ہیں — وہ گزرے ہیں اس طرف سے جس دم بدن چرائے نظر بچائے

لمحے الہامِ عشق کے ہیں، اترتی ہیں آیتیں دلوں میں — وہ شام جب بزمِ آرزو میں رخِ نظر تاب جگمگائے

مرے لئے وقت وہ ہے جس دم فراق دو وقت مل رہے ہوں

وہ شام جب زلف لہلہائے، وہ صبح چہرہ رسمسائے

گ

اثر لکھنوی

○

دل میں جو سوز ہے وہ شمعِ فروزاں میں نہیں
خون صد شعلہ تپاں تارِ رگِ جاں میں نہیں

یاد سے تیری دلِ زار بہل جاتا تھا
اب وہ دھندلی سی کرن بھی شبِ ہجراں میں نہیں

شور کرتی ہے عبث بلبلِ شوریدہ مزاج
دل کے ٹکڑے ہیں گلِ تر مرے داماں میں نہیں

خواب جو دیکھے گئے اب نہیں دیکھے جاتے
برہمی پہلی سی اُس زلفِ پریشاں میں نہیں

رنگ و نکہت سے ہے گویا چمنستاں خالی
پھول اشکوں کے اگر دامنِ عصیاں میں نہیں

ننگ ہے جامہ دری عشق کے دیوانوں میں
جلوۂ صبح اگر چاکِ گریباں میں نہیں

دور پر دور چلے اور چلے اور چلے!!
ذکر و فکر اس کے سوا حلقۂ مستاں میں نہیں

کروٹیں کتنی ہی تہذیب نے بدلیں لیکن
دردِ انسانیت اب تک دلِ انساں میں نہیں

سُن لیا ہم نے بھی اک بزم میں چرچا تھا اثرؔ
کام کی بات کوئی آپ کے دیواں میں نہیں

○

آنند نرائن ملاؔ

غرورِ فتح میں جتنی جفائیں ہوتی جاتی ہیں
یہ سب کل کی لڑائی کی بِنائیں ہوتی جاتی ہیں

نہ جانے کون ہیں کرتے ہیں جو توبہ جفاؤں پر
ہم ایسوں سے خطاؤں پر خطائیں ہوتی جاتی ہیں

یہ بزمِ ہوش اک بزمِ خموشاں بن چکی ہوتی
غنیمت ہے کہ مستوں کی صدائیں ہوتی جاتی ہیں

نزاعِ زیست ذہنوں میں ابھی گو غیر واضح ہے
محاذوں پر صف آرا پھر بھی رائیں ہوتی جاتی ہیں

وہ ساری مشکلیں جو روکتی ہیں راہ روؤں کو
قدم اُٹھے جہاں سب دائیں بائیں ہوتی جاتی ہیں

سرِ محفل سیئے جاتے ہیں دیوانوں کے لب لیکن
در و دیوارِ زنداں میں صدائیں ہوتی جاتی ہیں

طلوعِ صبح کی تاخیر پر یہ بد دلی کیوں ہے
یہ کیا کم ہے روپہلی سی گھٹائیں ہوتی جاتی ہیں

جنابِ شیخ نے اپنا لیئے دونوں جہاں ملاؔ
نمازیں پڑھتے جاتے ہیں خطائیں ہوتی جاتی ہیں

آل احمد سرور

○

سرور لاکھ حقائق نے انتقام لیا — ہر ایک حال میں ہم نے جنوں کا نام لیا

ہزار مرحلۂ ذوق و آگہی گزرے — کبھی خودی سے کبھی بےخودی سے کام لیا

وہ رند ہم ہیں جو ساقی سے شرمسار نہیں — تمام خونِ جگر دے کے ایک جام لیا

بڑے بڑوں کو کیا جس نگاہ نے بےخود — اسی نگاہ نے گرتے ہوؤں کو تھام لیا

خدا کی راہ پہ چلنے کی کم ہوئی توفیق — بتوں کے سامنے اکثر خدا کا نام لیا

کسی کی خطرۂ طوفاں سے چھیڑ چھاڑ رہی — کسی نے عشرتِ ساحل فسوں کا نام لیا

نگاہِ یار ادب آموز تھی ہزار مگر — وفورِ شوق میں دامن تو ہم نے تھام لیا

جہاں سے روزِ ازل نعمتیں ملیں سب کو

سرور ہم نے وہیں سے غمِ عوام لیا

○

قتیل شفائی

○

چاندنی سموئی ہے نقرئی جبینوں میں — رات کیوں نہ ہم کاٹیں جاگ کر حسینوں میں
اف وہ نیند کے سائے نیم باز آنکھوں پر — بھر رہا ہو مے کوئی جیسے آبگینوں میں
بدلیاں ہوں ساون کی یا سماں ہو پھاگن کا — حسرتیں سلگتی ہیں بھیگتے مہینوں میں
مدتیں ہوئیں تجھ کو دل دیے ہوئے لیکن — اپنا ذکر آتا ہے اب بھی نازنینوں میں
جانے تیری سکھیوں نے تجھ سے کیا کہا ہو گا — ہم تو ہو گئے رسوا اپنے ہم نشینوں میں

○

ہانپتی ہے تنہائی خواہشوں کے زینوں میں — دل کہاں دھڑکتے ہیں ان گداز سینوں میں
کنکروں میں کھوئے ہیں موتیوں کے سوداگر — حیرتیں پرافشاں ہیں سانولے پسینوں میں
بے بسی کی مہریں ہیں محنتوں کے ہونٹوں پر — ڈھل رہا ہے سناٹا چیختی مشینوں میں
مسکرا رہے ہوں گے وہ کسی کنارے پر — ناخدا نہیں ملتے ڈوبتے سفینوں میں

دوستوں کی نیت کو تم قتیل کیا سمجھو
ہم نے سانپ پالے ہیں اپنی آستینوں میں

○

گجر

ظہیر کاشمیری

محفل میں دل کا داغ نمایاں نہ کر سکے

تا صبح اک چراغ فروزاں نہ کر سکے

ساحل تو ایک سلسلۂ بے ثبات تھا

ہم آپ ہی تہیۂ طوفاں نہ کر سکے

دل ہر قدم پہ شعلۂ حرماں بنا رہا

ہم گھر کی روشنی سے چراغاں نہ کر سکے

منزل نظر پڑی تو بگولوں نے آ لیا

وحشت ملی تو سیرِ بیابان نہ کر سکے

جن کو تھا ادعائے غمِ گُل وہی ظہیر

پھولوں کے ساتھ چاک گریباں نہ کر سکے

سلام مچھلی شہری

○

غمِ ہستی میں حسن و عشق کے عالم پہ کیا گزری!
سناؤ تم پہ کیا بیتی نہ پوچھو ہم پہ کیا گزری

قریبِ شیشۂ دل ایک ناگن بن کے ڈستی تھی
مگر اب دُور رہ کر کاکلِ برہم پہ کیا گزری

(ق)

یہ استفسار اب بھی قافلے والوں میں تازہ ہے
کہ منزل مل گئی پر عظمتِ پرچم پہ کیا گزری

ہمارے ساغرِ مے سے اچانک آگ جب اُٹھی
خدا جانے نظارہ ہائے جامِ جم پہ کیا گزری

سویرا ہو گیا غنچے ہنسے، بُلبُل نے لے چھیڑی
مگر اک بات یعنی پھر دلِ شبنم پہ کیا گزری

خُتن میں آتش و گل ساتھ لیکر جب بہار آئی
خوشی میں آہوؤں کی چشم ہائے نم پہ کیا گزری

بہ عزمِ زندگی جب مفلسوں نے جام ٹکرائے
تو پھر محلوں کے رنگیں جام ہائے جم پہ کیا گزری

سنور کر اور بھی جب زہرۂ ھیروشما نکلی
تو جانے اے سلام اک ساحرِ ایٹم پہ کیا گزری

گجر

شادؔ عارفی

وہ جو دانشوروں سے ڈرتے ہیں
طنز کے نشتروں سے ڈرتے ہیں

ہم "سخن پروروں" سے ڈرتے ہیں
ورنہ ہر کھوٹے کھروں سے ڈرتے ہیں

ہم اگر مندروں سے ڈرتے ہیں
تیغ کے مشوروں سے ڈرتے ہیں

آپ کے واسطے ہیں چشم بہ راہ
آپ جن منظروں سے ڈرتے ہیں

عقل آئی ہے ٹھوکریں کھا کر
کیا کریں۔ رہبروں سے ڈرتے ہیں

جن کا ہر قہقہہ۔ حماقت ہے
لوگ ان مسخروں سے ڈرتے ہیں

رنگ محلوں میں رہنے والے بھی
آجکل، بے گھروں سے ڈرتے ہیں

یہ بڑے تجربے کی باتیں ہیں
ہم جو افسوں گروں سے ڈرتے ہیں

"شاملِ بزمِ عیش" و "شیشۂ مے"
وقت کے پتھروں سے ڈرتے ہیں

جن پہ بیٹھے ہیں ظلِ تاجِ شہی
عادتاً۔ مقبروں سے ڈرتے ہیں

ان کے قدموں سے ہم نہیں ڈرتے
اپنے اپنے سروں سے ڈرتے ہیں

"انقلابات ہیں زمانے کے"
اہلِ زر بے زروں سے ڈرتے ہیں

شادؔ یہ شاعرانِ "جنس مزاج"
آج تک دلبروں سے ڈرتے ہیں

گجر

نظرؔ حیدرآبادی

واقف نہیں ترانۂ زاغ و زغن سے میں!

انصاف چاہتا ہوں تری انجمن سے میں

غربت میں وہ بھی قصۂ پارینہ بن گئی

شہرت بچا کے لایا تھا اپنے وطن سے میں

اترا نہیں ہے بادۂ دوشینہ کا خمار

بیدل نہیں ہوں تلخیٔ کام و دہن سے میں

پنہاں سہی، پہ رکھتا ہوں اک نسبتِ عجیب

دلدادگانِ عشرتِ دار و رسن سے مین

کس جرم میں نظرؔ کو نظر سے گرا دیا؟

پوچھوں گا ایک روز یہ اہلِ وطن سے میں!

گجر

جمیل ملک

فاصلے درمیاں کہاں ہوتے — تم اگر میرے رازداں ہوتے

اپنے دم سے ہے روشنی ورنہ — دونوں عالم دھواں دھواں ہوتے

ہم فقیروں کا کیا ٹھکانہ تھا! — آپ اگر میرِ کارواں ہوتے

تُو نہ ہوتی تو لے نگارِ حیات — دل میں یہ ولولے کہاں ہوتے

وقت کے وہ مزاج داں ہی نہ تھے — ورنہ دنیا کے پاسباں ہوتے

شعلۂ گل کی بات کیوں کرتے! — سایۂ گل میں گر جواں ہوتے!!

باغ وہ باغ ہی نہیں ورنہ — اس جگہ کتنے آشیاں ہوتے

زخمِ دل ہم اگر دکھا سکتے — یوں نہ معتوبِ دوستاں ہوتے

کون سنتا جمیلؔ اگر ہم لوگ

صرف اپنی ہی داستاں ہوتے

راہی معصوم رضا

سمومِ سختیٔ حالات کی نہ بات بنی
نسیمِ فن نے بچالی کسی کی گلبدنی

سُنے جو رُک کے نشاطِ تکلّمِ بُلبُل
کئی فسانے سُنادے کلی کی کم سخنی

چلی تو دیر تک آئی زبانِ شیخِ حرم
بھٹک رہا ہے حرم میں خلوصِ برہمنی

فضائیں کھو نہ سکیں ایک نعرۂ حق کو
بجھا سکیں نہ ہوائیں چراغِ کوہ کنی

اندھیری رات سے ٹکرائے تو جنوں والے
نگارِ صبحِ وطن ! ہائے تیری دل شکنی

جنونِ بادِ مخالف کی سازشوں کی قسم
یہاں وہاں جل اٹھے ہیں چراغِ ہم وطنی

یہ کون لوگ ہیں آخر بتا زمینِ وطن !
طلب جو کرتے ہیں ہم سے ثبوتِ ہم وطنی

غزل

سکندر علی وجد

نظر آزمانے کو جی چاہتا ہے — نئے گل کھلانے کو جی چاہتا ہے

اِدھر آئے شاید وہ موجِ ترنم — کوئی گیت گانے کو جی چاہتا ہے

تری راہ میں رہ نوردِ محبت — ستارے بچھانے کو جی چاہتا ہے

وہی بات رہ رہ کے یاد آ رہی ہے — جسے بھول جانے کو جی چاہتا ہے

زمانہ مرا آزمایا ہوا ہے — تجھے آزمانے کو جی چاہتا ہے

لبوں پر مرے کھیلتا ہے تبسم — جب آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

کئی مرتبہ دل پہ بجلی گری ہے — مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے

تکلّف نہ کر آج برقِ تجلّی — نشیمن جلانے کو جی چاہتا ہے

رُخِ زندگی سے نقابیں اُلٹ کر

حقیقت دکھانے کو جی چاہتا ہے

جور سامری

ی سختی کے آگے اپنی گردن خم نہ کی ہم نے بہت ملحوظ رکھا ہے وقارِ عاشقی ہم نے

بتی کی صورت بخش کر سوزِ محبت کو زمانے میں کیا اونچا مقامِ آدمی ہم نے

، پر شوق کو تعلیم دے کر ضبطِ گریہ کی بدل کر رکھ دیا گویا مزاجِ دلبری ہم نے

ئے اس طرح بڑھ بڑھ کے پنجے ہر مصیبت سے ہر اک غراتے خطرے کی کلائی موڑ دی ہم نے

) حرمت پہ مٹ کر تری چاہت پہ فدا ہو کر بڑھا دی تیری عظمت اے نگارِ زندگی ہم نے

یا چشمۂ آبِ بقا سے کچھ سکندر نے بہا دی لیکن اس دھرتی پہ امرت کی ندی ہم نے

لم کیا ملا سب کچھ میسر آ گیا گویا !! مگر کہتی ہے دنیا اک مصیبت مول لی ہم نے

ما ہے اس قدر دل جب سے تیری دھن لگی اسکو بھلا دی اہلِ ظلم و جور کی ہیکڑی ہم نے

رسے تیشۂ جرأت نے ہر کوہِ الم کاٹا ! حقیقت میں بڑھائی آبرو فرہاد کی ہم نے

ن ریت کی دیوار تھی کب تک کھڑی رہتی سمجھتے بوجھتے کھایا فریبِ دوستی ہم نے

ترے ہی جگمگاتے گیت تھے اے تاجور جن سے

مٹائی دہر سے ماحول کی افسردگی ہم نے

فجر

یعقوب عثمانی

چاہتی ہے آخر کیا ، آگہی خدا معلوم

کتنے رنگ بدلے گی ، زندگی خدا معلوم

کل تو خیر اے رہبر، تیرے ساتھ رہرو تھے

آج کس پہ ہنستی ہے ، گمرہی خدا معلوم

اب بھی صبح ہوتی ہے ، اب بھی دن نکلتا ہے

جا چھپی کہاں لیکن ، روشنی خدا معلوم

راستی گریزاں ہے ، آشتی ہراساں ہے

کس سے کس سے الجھیگا ، آدمی خدا معلوم

اب تو وقت آیا ہے ، ڈوب کر ابھرنے کا

کتنی کشتیاں ڈوبیں ، اور ابھی خدا معلوم

ذوقِ نغمہ پیرائی ، تو ہی بڑھکے دے آواز

کب سے غرقِ حیرت ہے ، خامشی خدا معلوم

صرف جیک مانگی تھی ہم نے آدمیت کی کیوں بپھر گئے یعقوب، مدعی خدا معلوم

گجر

ہاب جعفری

○

بوالہوس سے پرسرِ محفل پری پیکر کھلے
آہ اس دنیا میں کیوں کر حشر کے منظر کھلے

نرغۂ دشمن سے بچ نکلے گا عشقِ تیغ زن!
اے مرے غمخوار آ نکلے کہاں تم سر کھلے

یوں تو تھا بے دست و پا، جب زندگی سے رن پڑا
حسن کی شہ پا کے اک دن عشق کے جوہر کھلے

دوست کے پہلو میں دشمن، رشتۂ الفت کی خیر!
آستینوں میں چمکتے ہیں کئی خنجر کھلے

اب کے کچھ ہو کر رہیگا فصلِ گل آنے تو دو
یا تو اپنا سر ہی جائے یا قفس کا در کھلے

صلح اس سے کیجئے جس کو ہو کچھ تابِ سخن
پیش کیا جائے جہاں ہر بات خنجر پہ کھلے

سینۂ پرخوں میں صدہا آرزوئیں دفن ہیں
ہم بھی دیکھیں کاش یہ گنجینۂ گوہر کھلے

آتی ہے زنداں میں اس پردہ نشیں کی یاد بھی
مجھ اسیرِ غم کی خاطر، پا برہنہ سر کھلے

نقشِ حسرت کیا ہیں گویا حسرتوں کی مورتیں
دل کو گر چیروں تو گویا بتکدے کا در کھلے

یاں تو رکھتے ہیں حسابِ دوستاں در دل کہ ہم
جس گھڑی جس وقت چاہیں میکدے کا در کھلے

محجر

وحید اختر

مانا کہ جامِ سم ہے یہاں قیمتِ سخن

ہر اک کو کیا نصیب ہے یہ تلخیٔ دہن

اک خطِ نورِ آئینۂ دل پہ کھنچ گیا

جب بھی لچک گئی نگہ ناز کی کرن!

دوشیزگیٔ حسن کی وہ نوشگفتگی

سرتاقدم نسیم بہاراں ہے وہ بدن

اب بھی ہمارا نام وہاں لے کے دیکھ لو

رکھتی ہے ہم سے خاص تعلق وہ انجمن

لائے بہارِ خلوتِ صدرنگ جانے کب

اپنے ہی خوں میں رنگ چلو اب تو پیرہن

کل ہم کو قید و بند گوارا ہو یا نہ ہو

مہلت ہے آج ظلم کو کر دیکھے ہر جتن

انساری سیمابی

ذکرِ جمال باعثِ تسکینِ جاں رہے
جب تک رہے شباب یہی داستاں رہے

خالی جو یوں بہار میں رطلِ گراں رہے
کیونکر دلوں میں عظمتِ پیرِ مغاں رہے

یاد آ رہی ہیں عشق و جنوں کی وہ منزلیں
ہم اپنے آپ سے بھی جہاں بدگماں رہے

پایانِ شوقِ انجمنِ ناز بھی نہ تھی
صد حشر درکنار رہے ہم، جہاں رہے

دل میں ہجومِ درد، نظر ترجمانِ غم
مشکل کہ آج رازِ محبت نہاں رہے

گزرے جو بے شراب و سبو تیری یاد میں
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے

اہلِ قفس کو گریۂ سیل آفریں سے کام
صحنِ چمن میں پھول کھلیں یا خزاں رہے

صیاد و برق دام فگن بے سبب نہیں
یعنی نہ میں رہوں نہ مرا آشیاں رہے

نظمِ چمن میں آ نہ سکا کوئی انقلاب
کچھ پھول مرکزِ نگہِ باغباں رہے

ہجر

اکبر حیدرآبادی

خاک اڑاتے پھر رہے ہیں کب سے دیوانے نہ پوچھ!
منتظر ہیں فصلِ گل کے کتنے ویرانے نہ پوچھ

مصلحت نے وقت کی بیگانہ جن کو کر دیا
اُن میں بھی ہیں کتنے چہرے جانے پہچانے نہ پوچھ

تشنگی رندوں کی آ کر میکدے میں دیکھ لے
دور میں آئے نہیں ہیں کتنے پیمانے نہ پوچھ

عشق سے کیا باز آتا یہ دلِ شوریدہ سر؟
شیخ جی کس کس طرح آئے تھے سمجھانے نہ پوچھ

جان و دل اب تک سلامت ہیں مگر اس شوخ کو
دے چکے ہم "جان و دل" کے کتنے نذرانے نہ پوچھ

کب جلے گی بزم میں شمعِ تمنا یہ بتا!
مضطرب ہیں ظلمتوں میں کب سے پروانے نہ پوچھ

زورِ طوفاں کو سمجھ، اپنے سفینے کو بچا
کتنے ساحل روند ڈالے موجِ دریا نے نہ پوچھ

اب جہاں رکھ دیں قدم گلریز ہو جائے زمیں
آ گئے کن منزلوں میں تیرے دیوانے نہ پوچھ

چھین کر رندوں سے ساغر، خود ز فیضِ احتساب
محتسب ہی لوٹتے ہیں کتنے میخانے نہ پوچھ

وہ سرورِ ساعتِ دیدار و رنجِ انتظار!
دوری و قربت کے مجھ سے اب وہ افسانے نہ پوچھ

زندگی ہے آج بھی اکبرؔ سراپا انتظار
کیا قیامت دل پہ ڈھائی اک تمنّا نے نہ پوچھ

تحسین سروری

جب غمِ دنیا سے میں گھبرا گیا
یاد آکر کوئی جی بہلا گیا

جب خیال آیا دلِ مرحوم کا!
خونِ ناحق کا سماں یاد آگیا

انکھوں آنکھوں ہوئی تھی کوئی بات!
مفت میں بے چارا دل مارا گیا

ٹوٹتی جاتی ہے زنجیرِ جنون
ہائے، کیا موسمِ گل آگیا

ان کے ہر انداز میں، ہر گھات میں
ایسی کوئی بات تھی دل آگیا

کر گئی تحسین وحشت اپنا کام
کیا کریں دامن جواب ہاتھ آگیا

گجر

بشیر نواز

○

پتہ کیا تجھکو اُٹھ کر جانے والے میری محفل سے
ترے ہر ہر قدم کے ساتھ ٹپکا ہے لہو دل سے

وہ یادیں بھی برنگِ اشک سب ہو گئیں ظاہر
چھپا رکھا تھا میں نے جن کو اب تک اتنی مشکل سے

سکونِ بے حسی آتا نہیں خوش میری فطرت کو
ہزاروں بار لوٹ آیا ہوں طوفانوں میں ساحل سے

خدا رکھے ابھی تک اُس سے اتنا ربط قائم ہے
دھوآں اُٹھ کے رہ جاتا ہے اسکے نام پر دل سے

ہے اب خونِ شہیداں کا ہر اک قطرہ اک انگارہ
جو ہو ممکن بچالے اپنا دامن، کہہ دو قاتل سے

مری بے چینیوں پر ہنس پڑا نورِ سحر ورنہ
ٹپک جانے ہی کو تھا خون چشمِ ماہِ کامل سے

ہمیں ارزانیٔ غم کا نہیں ہے اب کوئی شکوہ
لٹے ہیں وسعتِ دل آزما کے ان کی محفل سے

فرازِ دار ہو، زنداں ہو، یا بزمِ نگاراں ہو!
سب افسانے ہیں وابستہ ہماری شوخیٔ دل سے

س۔ا۔عشرت

عشق میں جانے مرے کون سی منزل ہو گی
جب تسلّی تری توہینِ غمِ دل ہو گی

ناخدا عظمتِ طوفان سے ناواقف ہے
موج جو اٹھے گی پروردۂ ساحل ہو گی

لطف آنے لگا دورِ غمِ فرقت میں مجھے
آپ کی اس میں توجہ بھی تو شامل ہو گی

بے سبب عشق ہی بدنام ہوا جاتا ہے
ہر ادا حسنِ جہاں سوز کی قاتل ہو گی

میں تری بزم سے اٹھ کر تو چلا آیا ہوں!
سونی سونی سی ترے پیار کی محفل ہو گی

حضرتِ شیخ کدھر آ گئے مے خانے میں
آپ پی لیں تو ہمارے لئے مشکل ہو گی

گجر

دآحل

تزئینِ شعر و فن کو ستم ہی سے ہے ثبات
بے سود میرے غم پہ پشیماں نہ ہو کوئی

فتنے اٹھاؤ زہد و تقدس کے نام پر
ملحد کہو جو تاجرِ ایماں نہ ہو کوئی

تائیدِ امن کرنے لگے مُوجدِ ستم
یوسف کی طرز ملزم داماں نہ ہو کوئی

دنیا ہے بے خبر مرے اشکوں کے راز سے
بے لوث پیار سے مرے نالاں نہ ہو کوئی

سر رکھنا آستاں سے پرے میری حسرتو!
نظروں میں ان کی سجدۂ ارزاں نہ ہو کوئی

ظہور حسین قیصر

کوئی دیکھے تو ذرا حوصلے دیوانوں کے
رخ بدل دیتے ہیں اک آن میں طوفانوں کے

کس میں ہمت تھی ترے عشق کو اپنانے کی
چاک سلتے ہی رہے اپنے گریبانوں کے

اب بھلا کوئی کہاں دامِ بلا میں آتا
شمع جل جل کے بجھی سامنے پروانوں کے

نطق پر اپنے بڑا ناز تھا فرزانوں کو
بات کرتے نہ بنی سامنے دیوانوں کے

یا وحشت کا ہدف ایک زمانہ ہوتا کاش ٹکڑے نہ نظر آتے گریبانوں کے

قاضی عبد الغفار

پندار کا صنم کدہ

تمہید

سید محمد انصار کا خاندان شہر کا بہت پرانا اور شریف خاندان تھا۔ ان کا جیسا صحیح النسب سیدوں کا خاندان دُور دُور نہ تھا۔ بہادر شاہ کے زمانے تک ان کے آباو اجداد مغلیہ سلطنت کے بہت معزز جاگیر دار تھے مگر غدر کے ہنگامہ میں قدیم ثروت برباد ہو گئی، پھر بھی یہ کافی خوشحال تھے۔ زمانہ کے انقلابات اور مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات نے رفتہ رفتہ اس خاندان کی نئی نسلوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ سید محمد انصار اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی ماں بہت ہوشمند اور زمانہ شناس بی بی تھیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد جب ان کا بچہ بہت کم عمر تھا۔ انھوں نے اس بچے کی تعلیم و تربیت پر اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔ میاں انصار فطرتاً لاابالی اور آوارہ گرد مزاج رکھتے تھے جب تک ماں کے قبضے میں رہے انگریزی تعلیم پائی۔ مذہبی تربیت بھی حاصل کی۔ اپنی جاگیر کا انتظام کرنا بھی سیکھا۔ لیکن ابھی ان کی عمر ۲۰ سال ہی کی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ طبیعت نے اپنے فطری راستے پیدا کئے اور انصار صاحب اپنے عالیشان مکانات میں تالے ڈال کر دنیا کی سیر کرنے نکل گئے۔ نکلے تو ایسے کہ ۲۰ برس تک پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں ہیں۔ اب جو ۲۰ برس بعد چڑھتی عمر میں واپس آئے تو ایک عورت بھی ساتھ لائے۔ عام طور پر یہ مشہور تھا کہ کوئی "باہر والی" ہے۔ اور انصار صاحب کے اکثر نکتہ چین تو صاف صاف کہتے تھے کہ وہ "نکاحی" بھی نہیں ہے بلکہ محض داشتہ ہے۔ بہر حال یہ تو واقعہ ہے کہ خاندان کی غیرتمند سیدانیوں نے غیر کُف کی ایسی عورت سے ملنا جلنا گوارا نہ کیا۔ خاندان کے خاندان نے منہ موڑ لیا۔ انصار صاحب کی نام نہاد بیوی کی صورت دیکھنے کا کوئی روادار نہ تھا۔ مگر ان حضرات کی طبیعت خاندان اور رشتہ داری اور کُف کی پابندیوں سے کچھ اس قدر آزاد تھی کہ وہ بقول اپنے "ان قدیم احمقوں" کی حماقتوں پر بیٹھے دیئے ہنسا کرتے تھے۔ خاندان کے اکثر مرد البتہ ان سے عزیزانہ اور نیازمندانہ بھی ملتے تھے۔ یہ زیادہ تر . . . . اس لئے کہ سارے خاندان میں سب سے زیادہ خوش حال انصار صاحب ہی تھے۔ اور غیرتمند عزیزوں کے ساتھ سلوک بھی کرتے رہتے تھے۔ تاہم آخر ان سے ملتے تو تھے۔ مگر تعصبات سے

ہ بھی پاک نہ تھے۔ چنانچہ جب انصار صاحب کے یہاں پہلوٹی بیٹی پیدا ہوئی تب بھی خاندانی حیثیت سے کوئی عزیز
ور رشتہ دار نہ تو مبارک باد دینے آیا اور نہ کسی نے پیدائش کی تقاریب میں شرکت کی۔ البتہ انصار کے والد کے
یک پرانے دوست میر امانت علی ہر حال میں شریک رہتے تھے۔ وہ تھے تو بہت پرانی وضع قطع کے آدمی لیکن
ن کو انصار کے خیالات سے بڑی حد تک اتفاق تھا۔ اپنے دوست کے بیٹے سے نہ صرف وہ وضعداری
باہتے تھے بلکہ بڑے میاں خود بھی باوجود بہت بوڑھے ہونے کے خیالات ایسے رکھتے تھے جو جدید خیالات
ے نہ جانے کس طرح متاثر ہو چکے تھے۔ ان کا زندگی کا فلسفہ تقریباً وہی تھا جو انصار کا۔ باوجودیکہ دونوں
ندگی کی مختلف منزلوں میں تھے۔

نومبر ۲۸ء میں دفعتاً انصار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور اب ان کی بیوی (جس کو اہل خاندان نے
بھی ان کی بیوی مانا ہی نہ تھا) بالکل تنہا رہ گئیں، سوائے ایک میر امانت علی کے کہ وہ اب بھی نہ صرف اپنی
ضعداری نباہتے تھے بلکہ ہر موقعہ پر ماں اور بیٹی کا ساتھ دیتے تھے اور میر صاحب کا وقار بھی کچھ ایسا تھا کہ ان
ے مقابلے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ ماں بیٹی کو ستائے۔

میر صاحب نے اپنی نگرانی میں عطیہ کی تعلیم جاری رکھی اور ان کے مشورے سے عطیہ کی ماں لطیفہ بیگم دنیاداری
ے تمام کام انجام دیتی تھیں۔

باپ کو مرے دو سال ہو گئے۔ عطیہ کی عمر اب سترہ سال کے قریب ہے۔ میر صاحب اور لطیفہ بیگم اس
کر میں ہیں کہ اس کے لئے کوئی اچھا شوہر تلاش کیا جائے۔

زمانہ

مارچ فروری ۱۹۳۰ء

افراد

لطیفہ بیگم :۔ سید محمد انصار کی بیوی، عطیہ کی ماں ۔ عمر ۴۷ سال۔
عطیہ :۔ سید محمد انصار اور لطیفہ بیگم کی بیٹی ۔ عمر ۱۷ سال۔
میر امانت علی :۔ سید محمد انصار کے والد کے خاص دوست اور لطیفہ و عطیہ وغیرہ کے سرپرست۔
ناصر :۔ سید انصار کا بھانجا، جو کالج میں تعلیم پا رہا ہے اور ابتدائی زمانہ میں عطیہ کا ہم سبق بھی رہا ہے۔
وہ اکثر لطیفہ کے پاس آیا جایا کرتا ہے۔ عمر ۱۹ سال۔
ڈاکٹر رضا :۔ جن سے عطیہ کی شادی ہوئی۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے پیشے میں بہت
کامیاب اور تہذیب جدید کے دلدادہ ہیں۔ عمر ۴۰ سال۔

ریحانہ :- ڈاکٹر رضا کی بیٹی، پہلی بیوی کے بطن سے ۔
نازو :- ڈاکٹر ناصر کے گھر کی ماما ۔ عمر ۲۵ سال ۔

منظر اوّل

(لطیفہ بیگم کا مکان ۔ ایک انگریزی وضع کے دالان میں چوکیوں کے فرش پر لطیفہ بیگم بیٹھی ہوئی ہیں ۔ کچھ کپڑا سامنے پھیلا ہوا ہے ۔ جس کو وہ قینچی سے قطع کر رہی ہیں ۔ چوکی کے پاس ایک تپائی پر سینے کی مشین کھلی رکھی ہوئی ہے ۔
میر امانت علی لطیفہ بیگم کی چوکی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں)

لطیفہ :- جی ہاں ! تو پھر کیا کہا انھوں نے ؟

میر صاحب :- کہا کیا ، وہی جھک مارا جو ہمیشہ مارتے ہیں ! کہنے لگے عطیہ بہت معقول لڑکی ہے مگر میرے غیر کُفو ہونے کا سوال اُٹھاتی ہیں ــــــ اور اس کا کوئی جواب نہیں ! میں نے کہا ، مرد اور خون کے امتیازات کو اسلام نے مٹا ڈالا لیکن مسلمان ابھی تک اُسی بت کی پوجا کئے جاتے ہیں ــــــ پھر دیر کیا ہے ، کعبہ کے تمام قدیم بتوں کو اپنے گھر کے طاقوں میں بٹھا لو ــــــ کہنے میر صاحب آپ تو لڑتے ہیں ، میں نے کہا میں لڑتا نہیں ہوں ایک بات کہہ رہا ہوں ــــــ ایسی ہی واہیات باتیں کرتے رہے ۔

لطیفہ :- میر صاحب ! اس خاندان کی طرف اب خیال ہی کرنا فضول ہے اور پھر اگر آپ نے کچھ سن کر راضی کیا تو عطیہ کے عزتِ نفس کو کس قدر صدمہ پہنچیگا جب وہ یہ محسوس کریگی کہ اس کو کسی خاندانی لڑکے کے ساتھ منڈھ دیا گیا ہے ! میر صاحب ، آپ تو عمر بھر ازدواج کی زنجیروں سے آزاد رہے ، آپ شاید

میر صاحب :- جی نہیں ۔ جی نہیں ، بیاہ تو میں نے نہیں کیا مگر دنیا میں تو میں رہا ، آنکھیں تو میری کھلی رہیں تو میں نے بند نہیں کئے ، میں جانتا ہوں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں کہ میں عورت کے نفسیات سے واقف نہیں ! جی نہیں ، جی نہیں ، ایسا نہیں ہے ! کچھ تو میں بھی سمجھتا ہوں ۔

لطیفہ :- بات یہ ہے میر صاحب ! کہ بازاری اصطلاحوں میں جس چیز کو عورت کی شرم و حیا کہتے ہیں درحقیقت اس کی عزتِ نفس کا ایک جذبہ ہے ۔ عورت اس لئے کسی مرد کے ساتھ اظہارِ محبت سے باز نہیں رہتی کہ وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتی یا شرماتی ہے بلکہ وہ سمجھتی ہے کہ کسی کی طرف اس کا ہاتھ بڑھانا اس کے وقار کے منافی ہے ۔ وہ مطلوب ہو سکتی ہے طالب نہیں ہو سکتی

——— میرا تو اب یہ خیال ہے کہ اس خاندان سے قطع نظر کیجئے۔ وہ ساتویں آسمان پر رہنے والا ملکوتی خاندان ہے۔ اور اب میں غریب زمین پر رہنے والی ایک غریب بازاری عورت ہوں۔
——— بازاری عورت! ایسی بازاری عورت جو تین گز لمبا شجرہ ونسب نامہ پیش نہیں کر سکتی!

میر صاحب :۔ سچ کہا تم نے! زمین والے زمین ہی کی باتیں کریں۔ آسمان تک پہنچنے کی کوشش ہی کیوں کریں مگر لطیفہ! میں تم سے کہتا ہوں، یہ غرور ایک دن بُری طرح ٹوٹے گا۔ بڑے بڑے مغروروں کے سر ٹوٹ رہے ہیں ——— اندھے دیکھتے نہیں کہ دنیا میں ہو کیا رہا ہے، ایک ہی لکیر پیٹے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ انکا مذہب زمانہ کی تمام ضرورتوں پر حاوی ہے اور دوسری طرف اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ گویا کولھو کے ایک بیل ہیں جو ایک ہی محور پر گھومے جاتے ہیں۔ نہ ادھر قدم بڑھ سکتا ہے نہ اُدھر۔ ہزار خندہ کفر است' بر مسلمانی!

لطیفہ :۔ اچھا تو پھر ناصر کے لئے بھی دروازے بند ہونے چاہئیں۔ کل کو عطیہ اور ناصر کے دلوں میں اگر کوئی جذبہ پیدا ہو گیا جو نہ پیدا ہونا چاہیئے تو دقتیں پیدا ہوں گی۔ سنتی ہوں کہ ناصر کی والدہ تو کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں کہ ان بچوں کی دوستی کے پردے میں لطیفہ کچھ اور فکریں کر رہی ہے!

میر صاحب :۔ بکنے دیجئے! بکنے دیجئے!! غریب عطیہ کا وہ بچپن کا ہم سبق ہے۔ ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ ان کا ایک دوسرے سے دل بہلتا ہے ہم کون کہ دروازے بند کریں۔ عطیہ کی تربیت ماشاءاللہ ایسی ہے کہ وہ خود ہی ناصر کو پیشقدمی نہ کرنے دیگی اور اول تو مجھے اس کے کچھ آثار ہی معلوم نہیں ہوتے۔

لطیفہ :۔ مگر ناصر کی اماں!

میر صاحب :۔ ناصر کی اماں! نکتہ چینی، عیب پروری، بہتان، بغض اور جہالت کی اماں ہیں۔ ان کے لئے دروازہ کھلا بھی رہا تو ہم بند کر دیتے۔ ان کم بختوں کو زندہ رہنے کا حق ہی کیا حاصل ہے۔ اس جنس کو تو غدر سے پہلے ہی فنا ہو جانا چاہیئے تھا۔ اچھا تھا یا بُرا وہ زمانہ تو گیا۔ جب کبوتروں کے جوڑے بنا بنا کر کابکوں میں بند کر دیتے تھے۔ اور کپڑے کی گڑیوں کی طرح چچا کی بیٹی کا پھوپھی کے دادا کے ماموں کے چچا کے سمدھی کی بھتیجی سے چھوٹے تایا کی خالہ کے پوتے کے ساتھ نکاح پڑھایا اور کابک کے ایک خانے میں بند کر دیا! چلو نقارے بج گئے بیاہ ہو گیا! اب جو یہ بوڑھیاں چاہیں کہ وہ بھی کبوتر کے سے جوڑے لگایا کریں تو یہ ممکن نہیں ———

(دفعتاً عطیہ داخل ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ ہے)

عطیہ :۔ کبوتر کا جوڑا، دادا کوئی اچھا جوڑا ہے تو منگوا دیجئے، کل ہی تو میرے شیرازی جوڑے کی

کبوتری مر گئی ۔

اچھے دادا : ضرور منگوائیے ـــــــــ

میر صاحب ؛ (مسکرا کر) بیوقوف چھوکری ! کیا ناصر ٹینس کھیلنے آیا ہے ؟

عطیہ :۔ جی ہاں دادا ۔ ہم آج میچ کھیل رہے ہیں ۔ مگر وہ کبوتر کا جوڑا ـــــــــ

میر صاحب :۔ عجیب لڑکی ہے تمہاری ـــــــ لطیفہ بیگم ! ماشاء اللہ اتنی بڑی ہو گئی اور باتیں کرتی ہے بچوں کی سی ـــــــ

لطیفہ :۔ جا ! بیٹی جا ، دن ڈھل رہا ہے ، پھر ٹینس کا وقت کیا رہے گا ۔

(عطیہ جاتی ہے مگر جاتے جاتے کہتی ہے ۔ دادا ! کبوتر کا جوڑا ، میرے لئے ـــــــ ، ضرور ـــــــ ضرور ہاں !)

میر صاحب :۔ ذرا دیکھتی رہو کہ ناصر کوئی ایسی توقعات پیدا نہ کر دے جس سے آئندہ عطیہ کو تکلیف پہنچے ـــــــ اور میں اب کوئی دوسری ترکیب سوچوں گا ۔ چلو تھوڑی دیر ٹینس کا میچ دیکھیں ۔

دوسرا منظر

(شب کے وقت عطیہ اور ناصر بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے ہیں)

عطیہ :۔ ایک چال زیادہ چل گئے تم !

ناصر :۔ گن لو ، گن لو ، میں تو ایک چال کم چل کر مات دینے والا ہوں !

عطیہ :۔ جی ہاں ! آپ ہیں بھی ایسے ہی شاطر ! لیجئے (ایک مہرہ بڑھاتی ہے) ہے کچھ جواب چال کا !

ناصر :۔ (ناصر ایک مہرہ بڑھا کر) اور ہے کچھ جواب اس چال کا ۔

عطیہ :۔ (پھر ایک مہرہ بڑھا کر) اور ہے کچھ جواب اس چال کا ۔

ناصر :۔ (مہرہ بڑھاتے بڑھاتے رک جاتا ہے) ہاں ! تو یہ چال ہے آپ کی ، سمجھ گیا میں !

عطیہ :۔ خاک بھی نہیں سمجھے ! وہ چال ہی کیا جو سمجھ میں آجائے ۔

ناصر : اور پھر عورت کی چال !

(عطیہ بساط سے نظر اٹھا کر بغور ناصر کا چہرہ دیکھتی ہے ۔ ناصر آنکھیں جھکائے ہوئے ہے)

ناصر :۔ لیجئے ، میں یہ چلا (ایک مہرہ بڑھاتا ہے)

(عطیہ خاموش ہے ، بساط سے اس کی توجہ ہٹ گئی ہے)

ناصر :کیا تم چال نہ چلو گی ؟ سوچ کیا رہی ہو ؟

عطیہ :(چونک کر) میں ؟ کچھ بھی نہیں -

ناصر :- تو پھر چلئے چال -

عطیہ :- (عطیہ نظر نیچی کئے ہوئے) یہ کیا کہا تھا تم نے عورت کی چال کے متعلق ؟

ناصر :- اوہو ! آپ اس سوچ میں ہیں ، میں نے تو مذاقاً ایک جملہ کہہ دیا -

عطیہ :- سنجیدگی یا شدت سے اور سختی کے ساتھ جو اہانت کی جائے وہ اس قدر مجروح نہیں کرتی جس قدر کہ وہ توہین ، جو مسکراتے ہوئے طنز اور ہنستے ہوئے مذاق کے ساتھ کی جاتی ہے ——— تم جانتے کیا ہو ، عورت کے متعلق !

ناصر :- کیوں ؟ نہیں کیوں جانتا میں ! عورت کی نفسیات پر کوئی پچاس کتابیں پڑھ چکا ہوں ! جی ! اور وہ بڑا مضمون یاد نہیں جو "عالم نسواں" میں نکلا تھا -

عطیہ :- کتابوں میں عورت کا حال پڑھنے والا ، اور مضمون لکھنے والا گدھا ! مرد !

ناصر :- واہ عطیہ واہ ! یہ گدھوں کی نئی قسم بتائی تم نے ، کتابیں پڑھتے ہیں ، مضمون لکھتے ہیں ——— اور شاید ٹینس اور شطرنج بھی کھیلتے ہیں -!!

عطیہ :- بکو نہیں ، بکو نہیں ، لو چال چلو ،

ناصر :- بھئی اب چال وال کو رہنے دو - برابر اٹھاؤ بازی !

عطیہ :- بازی برابر نہ اٹھیگی ، ہار تمہاری ہو گی -

ناصر :- بازی تو برابر ہی اٹھیگی - دیکھنا تم -

عطیہ :- دیکھنا !

ناصر :- دیکھنا !

عطیہ :- شرط ہے ؟

ناصر :- شرط ہے ؟

عطیہ :- لاؤ ہاتھ !

ناصر :- لو ہاتھ !

(ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں اور اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ لئے ٹہلنے لگتے ہیں)

ناصر :- (عطیہ کے ہاتھ کو ذرا دبا کر) اور جو میں جیت گیا عطیہ !

عطیہ :- اور جو میں جیت گئی ناصر !

ناصر :- قسمت جس کی زور کرے ۔

عطیہ :- قسمت کا کھیل نہیں ہے یہ ناصر ! ہمت کا کھیل ہے !

تیسرا منظر

(چند خاندانی بڈھے جمع ہیں ایک صحنچی میں تخت پڑا ہے۔ اس پر دو صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، دو سامنے مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا سا حقہ درمیان میں رکھا ہے ایک طرف پرانی وضع کا ایک شمع دان رکھا ہوا ہے)

"جی ہاں ! عقلا تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ " پسرِ نوحؑ بابداں بنشست ؛ خاندانِ نبوتش گم شد "

"جناب ! وہ تو خاندان پر دھبہ لگنا تھا لگ گیا ۔ انصار مرحوم خود تو باپ دادا کا نام ڈبو کر رخصت ہوگا اور یہ کلنک کا ٹیکہ ہمیشہ کے لئے ہم لوگوں کی پیشانی پر چھوڑ گئے ۔"

"آپ نے سنا ! وہ صاحبزادی عطیہ آجکل ناصر سے بہت گھل مل رہی ہیں ——— "

"جناب میں خوب جانتا ہوں ، انصار مرحوم کی داشتہ بڑی چالاک عورت ہے اور چالاک نہ ہوتی تو خود انصار کو کیسے پھانس سکتی ، اب وہ دن رات اس فکر میں ہے کہ عطیہ کو پھر اسی خاندان میں کھپا دے ۔

"لاحول ولاقوۃ ہمارا شجرۂ نسب . . . ۸ برس سے ———

" . . . ۸ برس کیسے جناب تیرہ سو برس کہیئے ———

"جی ہاں ! جی ہاں !! یہی مطلب ہے میرا ——— تیرہ سو برس سے ہمارا شجرۂ نسب اس قدر رہا ہے کہ کوئی شخص نقطہ نہیں لگا سکتا اس میں جی ! اور اب خدا کی شان ہے کہ ایک بازاری اپنی بیٹی کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتی ہے ۔"

"استغفراللہ ، استغفراللہ"۔

"لاحول ولاقوۃ "

"العظمۃ للہ "

"لیکن جناب ناصر کی والدہ کو ذرا سمجھا دینا ہے ۔کہیں ان کا انصار کا سا حشر نہ ہو"۔

"سمجھا دیا ہے جناب ، خوب سمجھا دیا ہے ۔، وہ خود ہی کہتی ہیں ناصر کے باپ زندہ ہوتے تو ناصر

مجال بھی نہ ہوتی کہ اس کے گھر کی طرف جائے اور رشتہ ـــــــ رشتہ کے تو نام ہی سے وہ بھڑک جاتی
بلکہ انہوں نے ناصر سے صاف صاف کہہ بھی دیا ہے کہ تفریح، دل لگی کے علاوہ اگر ذرا بھی کچھ اور خیال
کیا تو سنکھیا کھا لونگی ـــــــ "

"مگر بھائی صاحب! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ناصر کو زیادہ روکنے ٹوکنے کی ضرورت نہیں، نوجوان
تھوڑی تفریح کرتا ہے، آخر جاتا تو وہ بھی ہے کہ جب ماں ہی کا کبھی نکاح نہ ہوا تھا تو اب لڑکی کا نکاح
ا ـــــــ اجی ادھر اُدھر کوٹھوں بالاخانوں پر تفریح نہ کی چلو، دو گھنٹے عطیہ ہی سے ہنس بول
"

"بھئی واہ، بھائی صاحب، بات تو خوب نکالی آپ نے۔"

"خوب نکالی بات ـــــــ خوب خوب۔"

"ارے میاں، یہ کام تو ہم سب نے کئے ہیں، سب ہی کرتے ہیں، اب ہمارے یہ بھائی صاحب
ہیں۔ ان ہی کے قصے سب کو یاد ہیں۔ وہ مشتری کو بھگا کر لانا، ان کی بیوی کا خفا ہو کر چلا جانا اور مقدمہ
، اور پھر بچوں کی پرورش کے جھگڑے، اور جہیروں کا قصہ اور جہیز کی واپسی ـــــــ سب ہی کچھ
، اور انہوں نے سب ہی کچھ کیا۔ مگر یہ تو نہیں کہ اپنے حسب نسب پر دھبہ لگایا ہو ـــــــ "

"جی نہیں، جی نہیں! اس معاملہ میں میں نے ہمیشہ بہت احتیاط برتی۔ غلطیاں تو انسان کرتا ہی
مگر باپ دادا کی قبروں پر کیوں لات مارے ـــــــ"

"بجا ہے، بجا ہے!"

"شرافت بڑی چیز ہے جناب، بڑی چیز ہے!"

"اس میں کیا شک۔"

"اب دیکھیئے نا بھائی عابد علی نے نکاح کے بعد ہی بیوی کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا مگر نیک بخت
برابر اسی طرح بیٹھی ان کی سیوا کرتی رہی، روٹی اس نے پکائی، چولھا اس نے جھونکا، مگر اُف نہیں کی اور پھر
ئی عابد علی کو کھانے پکا کر کھلائے، کیا کچھ نہیں کیا ـــــــ شرافت اس کو کہتے ہیں، اب بھلا اس
ہ کی گانے ناچنے والی عورتوں اور چھوکریوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جیسی لطیفہ اور عطیہ ہیں! ہڑ دنگی
ن پسند، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں، غیر مردوں میں بیٹھ بیٹھ کر یہی ہی کریں۔ تھیٹر کی پیشہ والیاں ـــ
ـــ خدا محفوظ رکھے جناب!"

"سنتے ہیں کہ لطیفہ کے یہاں تو میر امانت علی کا عمل دخل بہت ہے!"

"بہت ۔ اجی جناب بہت سے بھی کچھ زیادہ ۔ بڈھا بھی ایک ہی خرانٹ ہے، وہ اس فکر میں ہے کہ عطیہ کو کہیں ٹھکانے لگا کے لطیفہ کو اپنے قبضے میں لائے، وہ تو دراصل مال کی فکر میں ہے ——

"سچ کہا آپ نے۔"

"سنتا ہوں کہ بھائی احسان علی کے یہاں میر صاحب نے عطیہ کے لئے کچھ تحریک کی تھی مگر ایسا صاف جواب دیا کہ بڈھا اپنا سا منہ لے کے چل دیئے۔"

"تو کیا بھائی احسان علی عطیہ کو اپنے لڑکے لئے قبول کرتے ؟ اجی لاحول ولا قوۃ۔"

"انہوں نے تو صاف کہہ دیا کہ جب تک زندہ ہوں خاندان کے شجرہ پر دھبہ نہیں آ سکتا ۔ بلکہ جب میر صاحب نے کچھ زیادہ کہا تو وہ بگڑ گئے ۔ انہوں نے کہا جناب! لطیفہ ہوں یا عطیہ وہ تو وہی ہیں جو ہیں، گھر میں رہیں یا کہ پر بیٹھ جائیں !! یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ یا ان کی اولاد ہمارے گھروں کو ناپاک کرے ——"

"خوب کہا انہوں نے۔"

"اچھا جناب! میں تو اب چلتا ہوں۔"

"کہاں، کہاں تشریف رکھیئے نا۔"

"جی مجھے آج بھائی معصوم علی کے مقدمہ میں شہادت دینے عدالت میں جانا ہے نا۔"

"ہاں، ہاں میں بھول ہی گیا تھا۔ آج شہادت ہے آپ کی، کیا ارادے ہیں۔"

"اجی ارادے ورادے کیا، نکاح میں ہم موجود تھے، بلکہ دولہا کے پاس ہی بیٹھے تھے ۔ مہر کہنے کا بندھا مگر اس کے ادا کرنے کا تو ہمارے خاندان میں کوئی رواج ہی نہیں، آج تک تو کسی نے ادا نہیں کیا۔ ہمارے خاندان میں کبھی کسی کی بیوی کو طلاق ہوئی، ناظم حسین اور کاظم حسین دونوں بھائیوں نے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کر لیا، خود ہمارے دادا نے شادی کے تین سال بعد بیوی کو میکہ بھیجا تو عمر بھر نہ بلایا، بلکہ ۱۵ سال تک تو ہمارے والد کی پرورش ہی ان کے گھر ہوئی پھر کیا کسی نے مہر ادا کیا ۔ اور علاوہ بریں میری شہادت تو یہ ہے کہ مہر معاف ہو چکے —— (کسی قدر مسکرا کر) جناب جب شوہر کہتا ہے کہ معاف ہو چکے تو ضرور معاف ہو چکے ——"

"اچھا تو خدا حافظ ۔ سلام علیکم ——"

"وعلیکم السلام۔"

"وعلیکم السلام۔"

(محفل برخاست ہوتی ہے)

چوتھا منظر

(عطیہ اپنے کمرے میں ایک میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے اور اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیٹھی ہے وہ خود ہی آہستہ آہستہ اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے کبھی باتیں کرتے کرتے میز کے پاس سے اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ کبھی پھر کسی کونے میں کرسی پر جا بیٹھتی ہے۔)

"کیا میں اتنی کمزور ہوں؟ حقایق پر جذبات کو حاوی کروں؟"

"ناصر کی طلب محض خواہش ہے ——— پھر خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار!"

"کیوں میں اپنے دل کی کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں کیا میں جانتی نہیں کہ اس کی جنس فریب ہے، دغا بازی ہے، ——— یہ بھی نہ جانا تو میں نے جانا کیا!!

"ہرن کو خدا نے مضبوط ٹانگیں اور تیز رفتار اسی لئے تو دی کہ وہ شیر سے اپنی جان بچا سکے۔ پھر اگر وہ ہرن کم بخت، خود اپنی ٹانگ توڑ کر شیر کے سامنے بیٹھ جائے تو قصور کس کا ہے؟ تین مہینہ سے وہ بہانہ بازِ زندگی کی کس قدر دلفریب تصویریں میرے سامنے رکھ رہا ہے، مگر یہ نقش کچے ہیں اور وہ رنگ اڑنے والا ہے۔ کیا میں بے وقوفوں کے باغ عدن میں بے خبر پڑی ہی رہوں ——— وہ اظہار محبت کے جوش خروش میں کہتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ اماں اور چچا کے حکم سے کیونکر ——— سرتابی کروں، اور کہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ بھاگ جاؤں ——— گویا عزت تو میرے میرے لئے نہیں ہے، اگر "عیش" مجھے دینا چاہتا ہے۔ بغیر آبرو کے عیش کا تصور ——— عورت کا تصور تو نہیں ——— ان جانوروں کا تصور ہے جن کا نام مرد ہے!! وہ اماں سے ڈرتا ہے، چچا سے ڈرتا ہے ——— وہ ابھی ننھا بچہ ہے، لیکن مجھے آغوش میں لینے کے لئے وہ پورا مرد ہے!! میری آبرو کو اپنے خاندان کی عزت کے مقابلہ میں تولتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی طرف کے پلہ میں مکر و فریب کا وزن رکھ کر اس کو میرے پلہ سے بھاری بنا دے گا ——— بے ایمان! بے ایمان!!

(غصہ کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھ لیتی ہے)

"مجھے لکھتا ہے کہ ——— "میں مجبور ہوں" ——— چچا صاحب زہر کھانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔"

"۶۰ برس اس دنیا میں گزار لینے کے بعد بھی چچا صاحب کی موت کا امکان اس قدر ہولناک ہے، مگر ۲۰ برس کی لڑکی کی اخلاقی موت کا یقین اس عالی خاندان مرد کے ضمیر میں ایک چٹکی بھی نہیں لے سکتا!! ———

(تیز تیز ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک بالکل بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے۔ پھر دفعتاً اپنی ساری کے دامن میں آنسو پونچھتی ہوئی اٹھتی ہے۔ ساری کے پلو کو غور سے دیکھتی ہے۔)

"آنسو! ایک کتے کے لئے جو صبح میرے گھر کی دیوار پر کائیں کائیں کر رہا تھا اور اب کسی گھوڑے پر بیٹھا غلاظت کھا رہا ہوگا! آنسو! ایک کتے کے لئے جو شام میرے سامنے دم ہلا رہا تھا اور اب کسی کوچہ میں پڑا مکھیاں مار رہا ہوگا! آنسو! معصوم آنسو! ——— موتیوں سے گراں تر ——— ایسے کے لئے جو ان کی قیمت نہ جانتا ہو سؤروں کے سامنے ایسے موتی مت بکھیرو۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا ———

(تن کر سیدھی ہو جاتی ہے۔ ساری کو سنبھال لیتی ہے اور بہت تمکنت کے ساتھ میز کے سامنے جا بیٹھتی ہے)

"جس کا ایک زرِ خالص سے پُر ہو وہ کھوٹے پیسہ کے ضائع ہونے کا غم کیوں کرے میں عورت ہوں اور عورت کا سرمایہ میری گرہ میں ہے، ایسے کتنے ہی کھوٹے پیسے میرے سامنے خاک پر لوٹیں گے اور میں ان کو پانی میں پھینک دونگی، میں نے چند روز دھوکہ کھایا، مگر دھوکہ ایک ہی دفعہ کھایا جا سکتا ہے ——— وہ منزل طے ہو گئی، وہ دروازہ بند ہو گیا ——— یہی لکھ دوں اس کو؟ یا کچھ نہ لکھوں ———"

(سوچتی ہے اور پھر کھڑی ہو جاتی ہے)

"جواب نہ دینا ہی سب سے زیادہ قطعی اور مختشم جواب ہے، دل کا دروازہ میں نے بند کیا ہے گھر کا دروازہ میں اس کے لئے بند نہیں کرتی ——— وہ بے شرم اکثر آئیگا، اسی طرح جس طرح آیا کرتا تھا، اور میں اس وقت کا انتظار کرونگی جب وہ خود اپنے جال میں گرفتار ہوگا ——— انتقام کی ساعت ——— دیر سے آئے یا جلد ——— آئیگی ضرور ——— اس وقت پورا انتقام لیا جائیگا اس دھوکا باز سے ——— تول اور ناپ کر ———!!

○

"میر صاحب اماں سے ڈاکٹر رضا کا ذکر کر رہے تھے، شاید پیام ہی لائے تھے ——— کیوں نہیں اس کو قبول کر لوں ——— گویا کوئی میرے کان میں کہہ رہا ہے۔

"عطیہ! تیرے لئے محبت کا دروازہ بند ہے، لیکن زندگی کے باقی دروازے کھلے ہوئے ہیں اور انتقام کا دروازہ بھی ——— دوشیزیت کی پابندیوں سے آزاد ہو جا ——— نکاح کے دروازے سے زندگی کے میدان میں قدم رکھ اور پھر ——— جب تک تیرا حسن باقی ہے اور اس کی کشش باقی ہے، جلا جلا کر اور رُلا رُلا کر مار، ان موذیوں کو مار ———"

(یکایک لطیفہ آواز دیتی ہے اور عطیہ چونک پڑتی ہے)

لطیفہ: "عطیہ! کیا کر رہی ہو وہاں، میر صاحب تشریف لائے ہیں۔"

گجر

ہ ! :- "تشریف لائیے اماں - تشریف لائیے دادا ۔"

(لطیفہ اور میر صاحب داخل ہوتے ہیں)

احب :- "میں دیکھتا ہوں کہ آج کل تم اپنے کمرے میں اکثر بند رہتی ہو اور ٹینس بھی کئی دن سے بند ہے۔"

ہ :- "جی ہاں ! میں شطرنج پر عالمانہ غور کر رہی ہوں۔ کچھ نئی چالیں کچھ نئے نقشے ڈھونڈ رہی ہوں ——"

احب :- "اللہ رے ذوق ! آج کل کی لڑکیاں بھی تماشا ہیں۔ شطرنج پر بھی عالمانہ غور و فکر ہونے لگی ! محض تفریح کے لئے لوگوں نے کھیل ایجاد کیا۔ اُن کو کیا خبر ہوگی کہ کسی زمانہ میں اس پر بھی عالمانہ غور و فکر کے حملے ہوا کریں گے۔ شطرنج نہ ہوئی یہ تو علم الافلاک یا ریاضی و ہندسہ کا اہم مسئلہ ہوا —— خیر، بیٹھو ہم بھی غور و فکر میں مبتلا ہیں اور تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

(عطیہ کی طرف دیکھ کر)

بات یہ ہے —— کہ —— دراصل معاملہ یہ ہے —— عطیہ کہ تمہاری شادی کا مسئلہ درپیش ہے۔ ڈاکٹر رضا کو تم جانتی ہو، بارہا ملاقات ہوئی ہوگی۔ وہ اس شہر میں ایک مشہور اور کامیاب ڈاکٹر ہیں اور تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں —— لیکن ہم لوگوں کو (لطیفہ کی طرف دیکھ کر) تردّد یہ ہے ان کی عمر ذرا زیادہ ہے، پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور ایک نوجوان لڑکی موجود ہے۔ جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی —— (ذرا رُک کر) اب تمہاری ماں تو کہتی ہیں کہ عمر کا تفاوت قابلِ اعتراض ہے اور میں کہتا ہوں کہ اول تو تفاوت کچھ زیادہ نہیں —— ڈاکٹر رضا کی عمر ۳۹ سال کی ہے۔ اور دوسرے تمہارے لئے اس قدر سمجھ دار، معقول اور خوش حال شوہر ہر طرح مناسب ہے، ہم لوگوں کی طرح وہ بھی آزاد خیال ہیں اور ایسی ہی بیوی چاہتے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

لیہ :- "دادا ! میں نے آپ کو باپ کے برابر سمجھا اور ہم جانتے ہیں کہ آپ سے زیادہ ہمارا کوئی ہمدرد نہیں میرے لئے جو تجویز آپ سوچیں گے وہ ہر طرح مناسب اور مفید ہوگی۔ میں ڈاکٹر صاحب سے اچھی طرح واقف ہوں اور یہ سمجھتی ہوں کہ ان کے ساتھ میری ازدواجی زندگی بہ آسائش اور بہ اطمینان گزر سکے گی۔"

رصاحب :- "اور تمہارے دل کا رجحان ۔"

طیہ :- "دل کے رجحان سے قطع نظر کیجئے۔ دراصل میرا رجحان نہ اس طرف نہ کسی طرف ہے اور نہ ہو سکتا ہے!"

طیفہ :- مگر بیٹی بغیر طبیعت کے رجحان کے تمہاری ازدواجی زندگی ایک ساز ہوگا بغیر نغمہ کے، موسیقی کا

تار ہوگا ٹوٹا ہوا ۔ تمہارے والد سے میری شادی باہمی رجحانات ہی کا نتیجہ تھی، ان کو بہت سی قربانیاں گوارا کرنی پڑیں۔ آج تک تم اسی قربانی کے نتائج کو بھگت رہی ہو، سماج نے تمہارے ابا کو اس طرح ستایا اور کچلا جس طرح فرعون اپنے غلاموں کی ننگی کمر پر چابک لگواتا تھا، مگر باوجود اس تمام ابتلا کے ہم اور وہ دنیا سے بے تعلق رہ کر خوش و خرم رہے اس لئے کہ ہمارے رجحانات ایک دوسرے کی جانب سے ــــــــ

عطیہ :- جی ہاں میں سمجھی ۔ لیکن جو چیز نہیں ہے وہ میں کہاں سے لاؤں ۔ اب میرے اندر جو کچھ جذبہ شوہر کی خدمت کرنے کا باقی رہی میرا سرمایہ ہے۔ آپ خدا کا نام لے کر پیام منظور کیجئے مجھے آپ کا انتخاب منظور ہے۔

میر صاحب :- مبارک خدا راست لائے! عطیہ! بیٹی تیرا فیصلہ دانشمندانہ، اپنے حال کو تو ہی بہتر سمجھ سکتی ہے، جھوٹے ہیں وہ مرد جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ عورت کے سرپرست ہیں اور اس کی بھلائی کو اس سے بھی بہتر سمجھ سکتے ہیں ــــ جھوٹے ہیں وہ سب ــــ

عطیہ :- وہ جو چاہیں سمجھیں اور جس طرح چاہیں اپنے کو آسمان پر بٹھائیں، مگر جب تک اس جنس میں آپ جیسے لوگ موجود ہیں دادا! دنیا تباہی سے بچی رہیگی ورنہ ــــ

میر صاحب :- ورنہ ــــ میں جانتا ہوں ایک دن آئیگا کہ دونوں کے درمیان اس قدر جنگ چھڑ گی کہ تمام دنیا دوزخ بن جائیگی ــــ شکر ہے کہ اس وقت ہم نہ ہونگے ــــ

لطیفہ :- ہمیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے!

میر صاحب :- اچھا تو میں جاتا ہوں، تاریخ مقرر کرنے کے لئے کہتا ہوں ــــ

عطیہ :- آداب دادا ۔

میر صاحب : وعلیکم السلام ۔

پانچواں منظر

(۶ ماہ بعد ۔ عطیہ کی شادی ڈاکٹر رضا سے ہو چکی ہے۔ نئی زندگی میں عطیہ خوش ہے ڈاکٹر رضا کی لڑکی ریحانہ بہت ہی نیک اور سعادت مند لڑکی ہے ۔ عطیہ کے ساتھ اس کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں، ہم عمری کی وجہ سے بہنوں یا دوستوں کی سی بے تکلفی پیدا

ہوگئی ہے۔ ناصر بھی اکثر شام یہاں آکر ٹینس کھیلا کرتا ہے۔ اس کے تعلقات ریحانہ سے بڑھتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رضا، عطیہ اور ریحانہ شام کو اپنے خوشنما مکان میں بیٹھے ہوئے چا ے پی رہے ہیں۔ نازو عطیہ کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔)

ریحانہ :- آپ نے بتایا نہیں باداجان! کل جو مضمون آپ پڑھ رہے تھے پردہ کے متعلق۔

ڈاکٹر رضا :- (مسکرا کر) وہ مضمون مولانا حضرت شاہ برکت اللہ القادری الچشتی البخاری، ثم ہندی البشاورمی۔ وغیرہ وغیرہ کا! اول تو مولانا کی اردو نویسی قیامت ہے۔ مبتدا اور خبر کی چول ہی نہیں بیٹھتی پہلے صفحہ پر مبتدا ہے اور دسویں پر خبر، کبھی خبر ہے تو مبتدا غائب اور مبتدا ہے تو خبر غائب، اگر کہیں کراماً کاتبین بھی اس قسم کی عربی میں ہم لوگوں کا اعمال نامہ لکھتے ہیں تو پھر مزے ہیں۔ قیامت میں اس کو نہ کوئی سمجھے گا نہ حساب کتاب ہوگا ——

سب سے چھوٹ جائیں گے ——

(ریحانہ اور عطیہ ہنستے ہیں)

ریحانہ :- لیکن یہ تو بتائیے باداجان! آخر یہ مولوی صاحبان جو پردہ، پردہ پکارے جاتے ہیں اور ہر سانس میں دس دس فتوے جاری کرتے ہیں تو آخر مقصود کیا ہے ان کا ——

ڈاکٹر رضا :- بھئی بات یہ ہے کہ ہم نے تو مذہبیات اور عقاید کے متعلق جو کچھ پڑھا لکھا، ولایت جاکر اور ڈاکٹری کرکے سب بھول گئے، پھر بھی جو کچھ یاد ہے وہ تمہیں بتادیں گے۔ سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہ کیجئو۔

(کسی شخص کے آنے کی آہٹ ہوئی، نازو دوڑ کر گئی اور واپس آئی)

نازو :- ناصر میاں آئے ہیں سرکار!

ڈاکٹر رضا :- بلالے ان کو۔ یہیں بلالے۔

(ناصر آتا ہے، سلام کرتا ہے)

ڈاکٹر رضا :- آؤ بھئی ناصر، تم لوگوں کے ٹینس کھیلنے کا وقت ہوگیا۔ ایک پیالی چا ے پی لو تو جاؤ۔

(ڈاکٹر رضا کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ ناصر کرسی کھینچ کر چا ے کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ ریحانہ چا ے بناتی ہے اور عطیہ کی طرف مخاطب ہوکر کہتی ہے)

ریحانہ :- باداجان کو بھی بس مولویوں کے نام سے چڑ ہے۔ میری والدہ کے چچا بہت بڑے مولوی صاحب تھے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تھے، جب کبھی وہ آجاتے تھے تو باداجان خیر یہ تے ہی گھر سے چل دیا کرتے تھے۔ کہتے

تھے، کون اپنا وقت ضائع کرے، وہ چائے کی پندرہ پیالیاں پئیں گے، بہت سا کھالیں گے
ایک ڈکار لیں گے اور پھر اپنی تین بیویوں کا جھگڑا بیان کرنا شروع کردیں گے یا اپنی کوئی کرام
لگیں گے ـــــــ میں اتنی دیر میں چار مریضوں کا معائنہ کروں گا اور ان کو نسخے لکھ کر دا

ناصر :- تو اب بخشئے ان مولویوں کو چلئے ٹینس شروع کریں -

(ریحانہ اور ناصر اٹھتے ہیں عطیہ کہتی ہے)

تم چلو میں ابھی آتی ہوں ، باورچی خانہ میں ذرا جھانکتی آؤں -

(ناصر اور ریحانہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہیں)

ناصر :- یہ لو یہ تو بارش شروع ہوگئی ، گیا ہمارا ٹینس ، لاحول ولا قوۃ -

(دونوں پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور عطیہ اٹھ کر چلی جاتی ہے)

ناصر :- آپ کچھ خاموش سی ہیں -

ریحانہ :- جی نہیں ناصر بھائی ، آج دن میں ذرا کام زیادہ کرتی رہی -

ناصر :- یہ آپ مجھے ناصر بھائی کیوں کہتی ہیں، میرا آپ کا کوئی رشتہ تو ہوتا نہیں -

ریحانہ :- دولھن آپا آپ کو بھائی کہتی ہیں، میں نے بھی کہنا شروع کردیا -

ناصر :- نہ کہا کیجئے -

ریحانہ :- کیوں ؟

ناصر :- نہ کہا کیجئے ؟

ریحانہ :- آخر کیوں -

ناصر :- بس نہ کہا کیجئے ، اس لفظ میں اور اس کے مفہوم میں وہ ترنم نہیں ہے جس کو مری روح ڈھونڈتی

ریحانہ :- جس لفظ میں ترنم ہو وہی بتادیجئے -

ناصر :- وہ لفظ ـــــــ کیا آپ کو ایسا کوئی لفظ معلوم نہیں ؟

ریحانہ :- (شرما کر خاموش رہ جاتی ہے -)

ناصر :- خاموش کیوں ہوگئیں آپ ؟

ریحانہ :- یہ سوچ رہی تھی کہ ترنم لفظوں میں کہاں ہوتا ہے۔ الفاظ کے اندر ترنم نہیں ہوتا نہ ترنم کے اندر
پیدا ہوا کرتے ہیں۔ جب روح میں ترنم ہوتا ہے تو زبان یہ سکے ڈھالتی ہے۔

ناصر :- کیا خوب کہا آپ نے میری زبان اگر کوئی ایسا سکہ ڈھالے تو آپ کو ناگوار نہ ہوگا -

ریحانہ :۔ ناگوار کیوں ہوتا ۔ ترنم آپ کا ، سکہ آپ کا ، میں کون کہ مجھے ناگوار ہو !

ناصر :۔ آپ کون ! ترنم تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے ۔

ریحانہ :۔ (چونک کر) میرا پیدا کیا ہوا ۔ میرا ——

ناصر :۔ جی ہاں ! آپ کا !

ریحانہ :۔ کیونکر ؟

ناصر :۔ جس طرح کوئل کی کوک سننے والوں کے دلوں میں ترنم پیدا کرتی ہے جس طرح حسین تیتری کے رنگین پر دیکھنے والوں کے قلب میں کیف اور ترنم پیدا کرتے ہیں ۔

ریحانہ :۔ آپ کچھ شاعر بھی ہیں کیا ناصر بھا —— ناصر صاحب !

ناصر :۔ شعر میں لکھتا نہیں نہ اس حیثیت سے شاعر ہوں ۔ مگر شعریت حاصل کرتا ہوں حسن سے، موسیقی سے، اور ایسی رنگین تیتریوں سے ، جیسی کہ اس وقت میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہے !

ریحانہ :۔ (بہت سنجیدہ بن کر) نہیں ناصر صاحب ! میں آپ کی اس کریمانہ التفات کی حریف نہیں ہوسکتی میں اُن اشاروں سے واقف بھی نہیں جو آپ کر رہے ہیں ۔

ناصر :۔ محبت کے اشاروں سے —— واقف نہیں تم ؟

ریحانہ :۔ نہ واقف ہوں نہ واقف ہونا چاہتی ہوں ! کچھ اور باتیں کیجئے ۔

ناصر :۔ اور وہ دو حرف جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں ، کتنی دفعہ میں نے کہنا چاہا اور نہ کہہ سکا —— وہ اقرارِ محبت جو میں ——

(ڈاکٹر رضا اور داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر رضا :۔ آج تو بھئی بارش نے ٹینس کھیلنے کی بالکل ہی ممانعت کر دی ۔ کیا مصیبت ہے اگر دن بھر مطب کی محنت کے بعد شام کو کھلی ہوا میں بھی نہ ٹہل سکیں ۔

(ناصر کچھ حرکت کرتا ہے گویا جانے کا ارادہ ہے)

عطیہ :۔ بیٹھو ناصر ! اب کھانا کھا کر جانا ۔ کہو اب تمہارے امتحان کا نتیجہ کب اٹھیگا ۔

ناصر :۔ ابھی تو دو مہینہ انتظار کرنا ہے ، ہماری یونیورسٹی کے نتیجے بہت ہی دیر میں شائع ہوتے ہیں ۔

عطیہ :۔ دیر آید درست آید ۔ جو نتیجہ قطعی اور محتتم ہوتا ہے وہ ہمیشہ دیر ہی میں نکلا کرتا ہے ۔ نتیجہ تو وہی فیصلہ کن ہوتا ہے جو انتظار کرائے ۔ چکی جس قدر آہستہ چلتی ہے اسی قدر زیادہ باریک پیستی ہے !

ناصر :۔ (ہنس کر) بہن عطیہ کے فلسفیانہ اشارے بھی پر لطف ہوتے ہیں ۔

عطیہ :۔ (ہنس کر) پرلطف ——— ایک حد تک - اس حد کے بعد میرا فلسفہ خوفناک طریقہ پرسنجیدہ ہوجاتا ہے
ڈاکٹر رضا۔ ارے بھائی اب اس وقت فلسفہ کو چھوڑو۔ ورنہ میں بھی اپنے مریضوں کا حال سنانا شروع کردونگا

(ریحانہ اُٹھ کر چلی جاتی ہے)

عطیہ :۔ جانے دیجئے، میری توبہ ہے، کہیں اس دل لگی میں زندگی کا اصلی فلسفہ نہ بھول جاؤں! جاؤں ذرا جاکر باورچی خانہ کی خبر تولوں ——— (مسکراکر) بہت شدید اور سنجیدہ ترین فلسفہ تو وہی ہے!

(عطیہ چلی جاتی ہے)

ڈاکٹر :۔ کہو بھئی ناصر آجکل تمہارے کالج کی انجمن محافظِ حقوقِ نسواں کا کیا حال ہے۔
ناصر :۔ جی! اب تو امتحان کے بعد سے یونیورسٹی کے سب ہی شعبے بند ہوگئے۔
ڈاکٹر :۔ ارے میاں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس انجمن بازی اور انجمن سازی کا نتیجہ کیا ہے، ہم لوگوں نے اپنی زندگی کو تصنعات اور نقالی سے اس قدر بھر لیا ہے کہ ہمارا تصور علیش فرسودہ اصطلاحوں اور اس قسم کے آرائشوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے!
انجمن محافظِ حقوق! سبحان اللہ! گویا حقوق کی محافظت بھی کسی ملک کی سرحد کا معاملہ ہے کہ جب ایک دستہ فوج کا یا ایک پوری پلٹن مع توپ خانہ سرحد پر مقرر نہ کرو دشمن کی مدافعت ہو ہی نہیں سکتی۔ عورتوں کے حقوق کے بڑے محافظ ہو تو پہلے اپنے گھروں میں محافظت کا حق ادا کرو۔ اس سے کیا فائدہ کہ انجمن کے ہر ممبر کا گھر تو بدستور عورتوں کے لئے قید خانہ بنا رہے اور گھر کے باہر ممبر صاحب حقوقِ نسواں کے نقارے بجاتے پھرتے ہیں۔
ناصر :۔ تو جناب بغیر اجتماعی کوششوں کے اصلاح ———
ڈاکٹر رضا:۔ اجتماعی کوششیں اور اصلاح! انفرادی کوششوں کا پتہ نہیں اور اجتماعی کوششوں کا ارادہ ہے۔ ارے میاں تم تعلیمیافتہ نوجوان ہو، ولایت جاکر اور بھی زیادہ تعلیمیافتہ اور مہذب ہوجاؤ گے، یہ تو بتاؤ کہ آج تک تم نے اپنے گھر میں، اپنے خاندان میں، اپنے رشتہ داروں میں بھی اصلاح کی ضرورت بھی نکالی۔ ؏ "تو درونِ درچہ کردی کہ بیرونِ خانہ آئی"
ناصر :۔ مگر ہمارے خاندان کے لوگ تو اس درجہ قدامت پسند ———
ڈاکٹر :۔ اجی وہ کتنے ہی قدامت پسند ہوں، یہ بتائیے کہ آپ نے ان کی قدامت پسندی کے خلاف کیا جہاد فرمایا! سوائے انجمن تحفظِ حقوقِ نسواں کے جلسوں میں کھڑے ہوکر تقریر کر دینے اور تالیاں

بجا کر رزولیوشن پاس کر دینے کے ــــــــ

صر :- جی یہ تو بجا ہے مگر ــــــــ

اکٹر :- جب یہ بجا ہے تو پھر آپ کے نقارہ میں سوائے آواز کے اور رہا کیا ۔

(عطیہ داخل ہوتی ہے)

طیہ :- کوئی بڑے زور کی بحث ہو رہی ہے یہاں۔

اکٹر :- بحث وحث کچھ بھی نہیں ، ذرا میاں ناصر کی مزاج پرسی کر رہا ہوں۔ یہ بڑے محافظِ حقوقِ نسواں بنے پھرتے ہیں کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں تو قدامت پسندوں کی وجہ سے میں کچھ نہ کر سکا مگر باہر عورتوں کے حالت کی اصلاح کرنے کا ارادہ ہے ــــــــ

طیہ :- شیر نے بکری سے کہا تھا آ میں تجھے غرانا سکھادوں ، بکری نے کہا بخشئے چچا ، مجھے ممیانا ہی زیادہ پسند ہے ، ذرا دور ہی رہیئے ــــــــ

اکٹر :- (ہنستے ہوئے) جی ہاں ! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ سے اپنے گھر کی اصلاح تو کی نہیں جاتی ۔ میدان میں علم بلند کرنے سے کیا فائدہ !

طیہ :- وہ حقوق جو ان حضرات معلمین کی سرپرستی میں عورتوں کو حاصل ہوں ، ان کی موجودہ غلامی سے بھی بدتر اور مکروہ تر ہیں ۔ سہ

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ براست ✧ رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

اور پہلے تو یہ حضرات اپنا حال درست کریں ، اپنے دھبے دھوئیں ، پھر ہم غریبوں پر کرم فرمانے کا ارادہ کریں ! اگر یہی ہمارے حقوق کے محافظ ہیں ــــــــ جیسے میاں ناصر ــــــــ تو ہم باز آئے ایسے حقوق سے ، ہم اس حق تلفی میں ہی خوش ہیں ، بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جیئیگا ! ــــــــ اپنی آنکھوں کے شہتیر پہلے نکالو ــــــــ میاں ناصر ! اپنے دل کی پھانس تو کسی دن ہم خود ہی نکالینگے ــــــــ انشاء اللہ !

ناصر :- تو اب آپ تو دو مل کر میرا خاتمہ ہی کر دیں گے ۔

ڈاکٹر :- بھاگ نکلے میاں ناصر ! انجمن تحفظِ حقوقِ نسواں زندہ باد !

(نازو داخل ہوتی ہے)

نازو :- سرکار خاصہ حاضر ہے اور ریحانہ بی فرماتی ہیں ان کے سر میں درد ہے اس وقت خاصہ تناول نہ فرمائیں گی ۔

عطیہ :- سر میں درد ہے، ذرا میں دیکھوں تو ریحانہ کی طبیعت کیوں خراب ہو گئی ——

(عطیہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر اور ناصر اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں)
گویا عطیہ کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

ناصر :- مجھے ایک ضروری بات —— بلکہ بہت اہم بات —— یعنی اپنی زندگی کے متعلق ب
بہت ہی —— بہت ہی —— میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت —— میرا مطل
یہ ہے کہ ——

ڈاکٹر :- میاں ناصر، عطیہ کی باتوں نے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں بوکھلا دیا ——

ناصر :- جی نہیں، مگر —— لیکن —— یعنی وہ ایک اور بات ہے ——

ڈاکٹر :- تو کہو، کہو نا، کیا بات ہے —— تم تو یعنی اور لیکن اور اگر میں پھنس گئے۔

ناصر :- مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ریحانہ —— مجھے اجازت ہو تو عرض کروں۔

ڈاکٹر :- ہاں، ہاں بھائی کہو، ضرور کہو، کہو بھی کہیں —— میں تمہاری مدد کروں —— کیا تم ر
کے متعلق اپنے جذبات سے مجھے مطلع کر رہے ہو۔

ناصر :- (جلدی سے) (گھبرا کر) جی ہاں، جی ہاں، میں تو عرض کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر :- تو بھئی ناصر سنو: فیصلہ قطعی ریحانہ کے ہاتھ میں ہے، معاملہ اس کا ہے، میرا نہیں ہے۔ ہم اس
اپنے تجربہ اور عقل کے مطابق مشورہ دے سکتے ہیں۔ بس۔ باقی وہ آپنی زندگی کے اہم ترین مسئلہ
متعلق بالکل مختار ہے —— البتہ تم اس کی ماں سے پہلے دو باتیں کر لو —— کھانے کے
ہی جی چاہے تو بیگم صاحب سے باتیں کر لیجو، —— اور بھئی مجھے تو ——

(عطیہ داخل ہوتی ہے)

عطیہ :- ریحانہ کچھ مضمحل ہے، کھانا تو وہ نہ کھائے گی۔ میں نے اس کے لئے تھوڑا قہوہ بھجوا دیا ہ
آئیے خاصہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ آؤ ناصر!

(سب کھانا کھانے جاتے ہیں)

(چھٹا منظر)

(عطیہ ایک آراستہ کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہے، ناصر سامنے کرسی پر بیٹھا ہے)

عطیہ :- مجھ سے کیا کہتے ہو، اگر یہ خیال ہے تو خدا مبارک کرے۔ اتنا تو میں کہتی ہوں کہ جس نوجوان

ریحانہ جیسی بیوی نصیب ہوگی اُس سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہ ہوگا ـــــ مگر اپنا معاملہ تم خود ہی اس کے سامنے پیش کرو، میں بھی کسی موقع سے دو حرف کہدونگی ـ تم ٹھہرے انجمن تحفظ حقوقِ نسواں کے ممبر، تم ہی ریحانہ کے حقوق کی عزت کر سکتے ہو، یہ حق اسی کا ہے کہ وہ ہاں کہے یا نہیں! رہے ہم، ماں اور باپ، تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہے کہ ہم مناسب مشورہ دیں ـ

ناصر :- مگر آپ کی سفارش ـــــ

عطیہ :- سفارش! عقل گئی ہے تمہاری! یہ معاملے سفارش سے طے ہوا کرتے ہیں یا طے ہونے چاہئیں ـ اظہارِ خیال سے تمہاری زبان قاصر تو نہیں ـــــ بلکہ میں تو جانتی ہوں بہت ہی دلکش اور دلفریب ہے ـ گھبراتے کیوں ہو، اپنے وکیل خود بنو، زبان طرّار، دماغ ہوشیار، انداز دل پسند، سب کچھ خدا نے تم کو دیا ہے ـ پھر اور کیا چاہیئے ـــــ

ناصر :- میں نے ذکر چھیڑا تھا مگر ـــــ

عطیہ :- مگر کیا، ریحانہ خود ہی آرہی ہے ـــــ میں تمہارے لئے میدان خالی کرتی ہوں ـــــ

(عطیہ مسکراتی ہوئی جاتی ہے ـ ریحانہ داخل ہوتی ہے)

ریحانہ :- اوہو ناصر صاحب، سنتی ہوں کہ کل تو آپ سے اور بادا جان سے بڑی مزیدار بحث ہوئی ـ

ناصر :- جی ہاں، بحث وحث کیا، ڈاکٹر صاحب نے میری تھوڑی سی گوشمالی فرمائی ـ

ریحانہ :- کان تو کچھ آپ کے سرخ نہیں معلوم ہوتے!

ناصر :- (ہنس کر) دولہن آپا کا اندازِ گفتگو کچھ آپ بھی اختیار کرتی جاتی ہیں ـ

ریحانہ :- جیسی ماں ویسی بیٹی! ـــــ ہونا بھی یہی چاہیئے ـــــ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں سنجیدہ بن جاوں تو لیجئے، میں نہایت سنجیدہ بن گئی ـ

(مذاقاً منہ بنا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

ریحانہ :- لیجئے اب دیکھئے میری سنجیدگی ـــــ آپ اب حقوقِ نسواں پر کچھ فرمائیں گے؟

ناصر :- (ناصر دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) خدا کے لئے! مرے ہوئے کو طنز اور استہزاء سے نہ مارو، میں اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے آیا ہوں، کردو فیصلہ! بتاؤ مجھے کہ کیا فیصلہ ہے، ہاں یا ـــــ

ریحانہ :- (نظر دوسری طرف کرکے) ناصر صاحب اگر راستہ ناہموار ہو تو گھوڑے کو دوڑائیں نہیں!

ناصر :- تو راستہ ناہموار ہے؟

ریحانہ :- بہت! آپ کے خیال و گمان سے بھی زیادہ

ناصر :۔ (گھٹنوں کے بل کرسی کے پاس بیٹھ جاتا ہے) میں مرجاؤں گا ریحانہ ، میں فنا ہوجاؤں گا۔
ریحانہ :۔ یہ آپ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرضِ حال کرنے کا خاص فرنگی طریقہ کیوں اختیار کیا ——
وہ بھی میرے لئے کہ میں کالی عورت ، غلام قوم کی عورت ، غیر مہذب عورت ہوں ! اس ذکر کو
فی الحال ملتوی کیجئے —— مجھے چند روز سوچنے دیجئے ،
ناصر :۔ اچھا امید کی ایک جھلک میرے لئے ——
ریحانہ :۔ ابھی نہیں ——
ناصر :۔ عنایت کا ایک حرف میرے لئے ۔
ریحانہ :۔ ابھی نہیں ۔
ناصر :۔ کرم کی ایک نظر میرے لئے ۔
ریحانہ :۔ ابھی نہیں ۔
(عطیہ داخل ہوتی ہے۔ دروازہ ہی سے آواز دیتی ہے ۔)
ریحانہ ! ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں ۔ (ناصر کو دیکھ کر) ارے میاں ناصر موجود ہیں ——
ریحانہ :۔ (بہت خوب کہہ کر چلی جاتی ہے۔)
ناصر :۔ جی ہاں میں موجود ہوں —— کس مشکل میں پھنسا دیا آپ نے —— !
عطیہ :۔ سبحان اللہ ۔ آپ ننھے بچے ہیں کہ میں نے اٹھا کر کانٹوں بھری جھاڑی میں پھینک دیا آپ کو !
ناصر :۔ تو پھر میرا حشر کیا ہونا ہے ، ریحانہ نے اپنا جواب ملتوی رکھا ہے ۔
عطیہ :۔ التوا کی گود میں امیدیں پرورش پایا کرتی ہیں ۔
ناصر :۔ مگر ——
عطیہ :۔ مگر وگر کچھ نہیں ، اگر وہ کہتی ہے کہ انتظار کرو ، تو کرو انتظار !
ناصر :۔ مگر انتظار میرے لئے روح فرسا ہے ۔
عطیہ :۔ (مسکرا کر) روح کو تحلیل ہونے دو ، جسقدر تحلیل ہوگی اسی قدر اس کی کثافت دور ہوگی ۔
ناصر :۔ یہ مذاق ہے ، یا طنز ہے ، یا استہزاء ہے ۔
عطیہ :۔ نہ مذاق ہے نہ طنز ہے نہ استہزا ہے ، صرف مشورہ ہے ، دوستانہ اور عزیزانہ !
ناصر : آپ اگر مشیر ہیں ، تو معین بھی ہیں ، کچھ امداد بھی کیجئے ، اس الجھے کو سلجھائیے ۔
عطیہ :۔ سنو میاں ناصر ! مرد اپنی محبت کی کاغذی کشتیاں بہتے پانی میں ڈالتا ہے ۔ بہت سی بہ

جاتی ہیں، بہی چلی جاتی ہیں، کتنی ہی غائب ہو جاتی ہیں، ایک دو کنارے گھاس اور کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتی ہیں، کوئی ایسی بھی ہوتی ہے جو کنارے ہی پر ڈوب جاتی ہے، جو ڈوب جائے وہی کشتی مضبوط ہے ———

ناصر :- (مسکرا کر) آپ کے معمے ! جان کا عذاب ہیں!

عطیہ :- پل صراط سے گزرے بغیر جنت میں کیونکر جاؤ گے ! ——— خیر اب تم گھر جاؤ، میں ایک دو دن میں خود ریحانہ کا منشا معلوم کر کے تم کو اطلاع دوں گی۔ بادلوں کی طرح بھاگتے پھرنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔

(ناصر جاتا ہے۔ عطیہ کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے۔)

انتقام کی منزل قریب آ رہی ہے، چراغ اپنا ہی خون پیتا ہے، وہ تاریکی کو کھا جاتا ہے مگر پھر کاجل کی صورت میں اس کو تھوکتا ہے ——— عمل کے بطن میں اس کے نتائج ہمیشہ زندہ رہتے ہیں!

(جاتی ہے)

منظر ساتواں

(ریحانہ اور ناصر کی شادی قرار پا گئی۔ نکاح بہت سادگی سے ہونے والا ہے۔ دولھا مع اپنے چند اہلِ خاندان کے نکاح کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ ناصر کے اہلِ خاندان جو سب بوڑھے لوگ ہیں اور جن میں چار یا پانچ تو وہی ہیں جو ابتدائی منظر میں دیکھے جا چکے ہیں نکاح کے جلد پڑھائے جانے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ دولھا مسند پر بیٹھا ہے۔ اس کے پیچھے کے حصے میں پردے پڑے ہوئے ہیں اور مکان کا زنانہ حصہ ہے۔ ڈاکٹر رضا آتے ہیں۔)

ایک بڑے میاں :- کیوں ڈاکٹر صاحب اب کیا دیر ہے۔

ڈاکٹر :- جی کچھ دیر نہیں، لڑکی کی منشا دریافت کی جا رہی ہے۔

بڑے میاں :- اب اس کی کیا ضرورت ہے، منشا تو بہر حال پہلے ہی معلوم ہے اور مسلمان دوشیزہ کی منشا ہی کیا۔

ڈاکٹر :- جی بجا ہے میر صاحب! منشا تو صرف میری اور آپ کی ہی ہونی چاہیئے!

دوسرے بڑے میاں :- جی ہاں! شرفا کا تو دستور یہی ہے!

ڈاکٹر :- اور در اصل جناب میر صاحب شرفا کے لئے تو خود نکاح بھی ایک دستور اور رواج ہے۔ واللہ

اس کی بھی چنداں حاجت تو نہ تھی !

دوسرے بڑے میاں :- کیا فرمایا آپ نے ڈاکٹر صاحب ؟ توبہ ، کیا آپ مذاق فرما رہے ہیں ۔

ڈاکٹر :- (ہنس کر) جی ہاں ! آج دن ہی مذاق کا ہے ، یہ موقع ہنسنے بولنے کا ہے ۔

بڑے میاں :- بجا ہے ، بجا ہے ، اچھا تو اب کیا دیر ہے نکاح میں ۔

ڈاکٹر صاحب :- جی وہ دیکھئے دلہن کی والدہ تشریف لا رہی ہیں ، معاف کیجئے وہ بے پردہ آ رہی ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہم
پردہ کے پابند نہیں ہیں ۔

بڑے میاں :- کیا فرمایا آپ نے دلھن کی وا ــــــ دلھن کی وا ــــــ ، مگر یہ تو جناب مناسب نہیں ، شریعت
کے بالکل خلاف ہے ، واللہ (جوش میں آکر) بالکل خلاف ہے یہ کہ نامحرم کے سامنے کوئی شریف عورت
آئے ۔ نہیں صاحب ، نہیں صاحب ، منع کیجئے ، ان کو ، منع کیجئے ان کو ــــــ

(عطیہ نہایت سادہ لباس میں ایک چادر لپیٹے ہوئے ، مگر منہ اور ہاتھ کھولے ہوئے داخل ہوتی ہے ۔)

عطیہ :- ضرورت نہیں کہ آپ حضرات کو ــــــ جو عنقریب ہمارے خاندان میں داخل ہونے والے تھے ــــــ
میں نے عرض کیا کہ ہونے والے تھے ــــــ

(سب حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں ۔ ناصر اپنا سہرا اٹھا دیتا ہے)

بڑے میاں :- یہ آپ کیا فرما ــــــ

عطیہ :- ٹھیریئے ، ٹھیریئے ، ذرا میری بات سنیئے ــــــ یہ پردہ نشین جو آپ سے بات کر رہی ہے
دلھن کا ایک پیام لے کر آئی ہے ــــــ

(سب ایک دوسرے کی طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتے ہیں)

بڑے میاں :- کیا معنی اس کے ، یعنی ہماری توہین ــــــ

عطیہ :- جی نہیں توہین کا کوئی موقع ہی نہیں ــــــ گفتگو معاملہ کی ہے ــــــ

بڑے میاں :- کیسی گفتگو ــــــ کیا ــــــ

عطیہ :- ایک عورت کو اپنی مقدس اور محترم ذات سے دو باتیں کر لینے دیجئے ۔ آپ اسی طرح میری بات
کاٹیں گے تو صبح تک میں دلہن کا پیام آپ کو نہ پہنچا سکوں گی ۔

بڑے میاں :- مگر ہم ــــــ

عطیہ :- "ہم" ایک بے معنی لفظ ہے ، ایک ڈھول کی بھری ہوئی گٹھڑی ہے ۔ یہ "ہم"
دولہن کسی ایسے دولھے سے نکاح کرنے کے لئے تیار نہیں جس کا نسب نامہ مشتبہ ہو ۔

ے میاں :۔ یعنی ؟

طبہ :۔ یعنی یہ کہ دلھن کو یہ اطلاع ملی ہے کہ ناصر صاحب کے تیسری پشت میں ان کے دادا کی والدہ کھری سیدانی نہ تھیں بلکہ ان کے باپ یعنی ناصر صاحب کے دادا کے نانا نومسلم تھے اور ان کی وہ داشتہ تھیں، اس لئے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ خون جو ناصر میاں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور آپ میں سے اکثر کی رگوں میں بھی ——— وہ اہلِ بیت کا خاص خون نہیں ہے ——— اس لئے

. . . .

ے میاں :۔ (بگڑ کر) ہم نہیں سن سکتے ——— یہ توہین آمیز اشارات، حسب و نسب کے متعلق۔

طبہ :۔ (بگڑ کر) آپ کی مجال نہیں کہ آپ اپنی اصلیت کو سننے سے انکار کر سکیں، ایک مجھ سی ذلیل عورت ——— جو آپ کے خیال میں ایک ذلیل ماں کی بیٹی ہے ——— قوت رکھتی ہے اور اقتدار رکھتی ہے کہ اس کڑوی گولی کو آپ کے حلق سے اتار دے ——— منہ نہ بنائیے۔ ——— بسوریئے نہیں ——— جن لوگوں کو آسمان کی طرف تھوکنے کا شوق ہوتا ہے۔ ان کے حلق میں تھوک ضرور پہنچتا ہے ———!! ——— ٹھیریئے۔

(سب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، کوئی اپنا عصا سنبھالتا ہے، کوئی عمامہ درست کرتا ہے، کوئی قبا کے دامن جھاڑتا ہے۔ سب بگڑے ہوئے ہیں ——— ناصر بدستور بیٹھے ہوئے ہیں ——— خاموش اور حیران)

طبہ :۔ کڑک کر! خاموش تم سب نے عورت کو اپنی ہوس کا کھلونا بنا لیا ہے اور جیسے اس کے بزرگ ہیں ویسا ہی ناصر ہے ——— جھوٹا، فریبی، دھوکہ باز ——— عورتوں کے ان جذبات سے جو مقدس ہیں اور ملکوتی ہیں وہ بھی اسی طرح کھیلتا ہے جس طرح اس کے باپ دادا، اس کی ماں اور دادی کے ساتھ کھیل چکے ہیں! ———

ے میاں :۔ (بگڑ کر) بس معاف کیجئے، ہم سننا نہیں چاہتے۔

طبہ :۔ شرافت اور نسب کے دعوے دارو! صرف اس لئے آج یہاں ڈاکٹر صاحب نے اور میں نے ——— تم سب کو آنے کی ترغیب دی تھی کہ ذلیل کر کے اس ذلیل عورت کے دروازہ سے اٹھایا جائے جس کو تم نے سالہا سال اس کے جائز حقوق سے محروم کیا ——— یہ وقت میرے انتقام کا ہے! ———

ایک بڑے میاں :۔ (دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر) میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ایسے بے دینوں کے

گھر پیام دینا ہی نہ چاہیئے، مگر ناصر نہ مانے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عطیہ :۔ جا تو رہے ہیں آپ واپس! لیکن آپ اپنی داستان کا ایک ٹکڑا تو سن لیجئے،
(اشارہ کرکے) یہ بزرگ جو سامنے بیٹھے ہیں، انہوں نے اپنی بیوی پر کتنے ظلم ڈھائے۔
(اشارہ کرکے) یہ جو معزز رئیس تشریف رکھتے ہیں انہوں نے اپنی بیوہ بیٹی کو محروم الارث کیا
(اشارہ کرکے) اور جناب نے جو سراپا شریعت بنے ہوئے ہیں اپنی ۱۴ سال کی لڑکی کا نکاح
برس کے بڈھے سے کردیا، محض دولت کی خاطر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اب محفل میں
براتی اٹھ کھڑے، کچھ اٹھ رہے ہیں) اور آپ فرمائیے (اشارہ کرکے) آپ جو پانچوں وقت
مسجد میں جاکر پڑھتے ہیں کئی بازاری عورتوں کو آپ نے بغیر نکاح کے اپنے گھر میں رکھا؟۔
غلاف کعبہ سے سلوائی ہوئی ان دھول بھری گٹھڑیوں کی دھول کو اڑا دینے والی ہوا!
جلد چلنے والی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر آخری بات بھی سن لیجئے۔ ذرا ایک منٹ
اور توقف فرمائیے۔

ایک بڑے میاں :۔ لاحول ولا قوۃ!

دوسرے بڑے میاں :۔ استغفر اللہ!

تیسرے بڑے میاں :۔ انا للہ!

عطیہ :۔ لاحول تم خود اپنے اوپر پڑھو، تم سے زیادہ اس کا مستحق کوئی نہیں۔ اور استغفر اللہ دل
سے کہو، محض زبان سے نہیں۔ شاید خدا تمہارے گناہ معاف کردے، اور انا للہ اپنی ایک
رخصت ہونے والی روحوں کے متعلق پڑھو۔ جو خدا کرے کہ جلد دنیا کی آلودگیوں کو سمیٹ کر
وطن واپس جائیں ــــــــ

بڑے میاں :۔ اب ہم نہیں ٹھہر سکتے ــــــــ یہ تمام بیہودہ باتیں سننے کے لئے۔

عطیہ :۔ غلہ جب پھٹکا جاتا ہے تو خالی دانوں کو ہوا اڑا کرلے جاتی ہے۔ جائیے، جس لڑکی کو آپ بیاہنے
آئے تھے وہ کہتی ہے اور اس کے ماں باپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کو تمہارے تعصب اور
قربان گاہ پر نہیں چڑھا سکتے ــــــــ

(ناصر کی طرف اشارہ کرکے)

اٹھو دولھا میاں! جاؤ اپنے گھر کو ــــــــ

ممکن تھا کہ یہی جواب جو اس وقت تم کو دیا گیا ہے، پہلے ہی دے دیا جاتا مگر ہم تمہاری ذ

اور رسوائی کی ذلت سے محروم رہ جاتے ـــــ جاؤ اپنے مکر اور غرور کی پونجی کسی اور بازار میں
فروخت کرنے لے جاؤ ـــــ
ہمارے گھر ، اس کا نرخ بہت گرا ہوا ہے ـــــ
بوڑھے براتی :۔ (ناصر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ـــــ بہت بگڑ کر ـــــ)
ایک :۔ اچھا دیکھا جائیگا ـــــ
دوسرا :۔ دیکھا جائے گا ـــــ
تیسرا :۔ دیکھا جائے گا ـــــ

(سب جاتے ہیں ـــــ پردہ گرتا ہے)

گجر

ہاجرہ مسرور

نوری خالہ

کردار :-

لفٹیننٹ عزیز :- بیس پچیس کی درمیانی عمر کا تندرست خوبصورت نوجوان، ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ جما جما کر بولتا ہے۔

شاہدہ :- نازک سی خوبصورت لڑکی جس کی شادی چند دن پہلے عزیز سے ہوتی ہے بڑے ناز اور بن بن کر بولتی ہے۔

ماموں رضا :- راکھ کے رنگ کے بالوں والے، پچاس، پچپن کی عمر کے آدمی۔ گہرے سوٹ اور عنابی ٹائی میں اپنی عمر سے کم نظر آتے ہیں، کچھ گھبرائے ہوئے سے۔ بات کرتے ہوئے ہاتھ اور سر سے اشارے کرتے جاتے ہیں۔

پہلا منظر

پردہ اٹھتا ہے تو ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آتا ہے۔ ننھا سا صوفہ سٹ اور دو آرام کرسیاں عام انداز سے لگی ہوئی ہیں۔ درمیان میں کشمیری لکڑی کے کام کی چھوٹی سی تپائی ہے جس پر لمبا سا گلدان مرجھائے ہوئے پھولوں سے سجا رکھا ہے۔ سامنے آتش دان ہے، جس کی کارنس پر پیتل اور چینی کے چند کھلونے ہیں، اور ان کھلونوں کے علاوہ درمیان میں کسی عورت کی بڑی سی تصویر ستھرے فریم میں لگی ہوئی رکھی ہے، تصویر ضرورت سے زیادہ انلارج کیے جانے کے باعث دھندلی نظر آتی ہے ــــ تصویر کے دونوں طرف لکڑی کے رنگین شمعدان میں ادھ جلی موم بتیاں لگی ہوئی ہیں۔ آتش دان کے دونوں پہلوؤں میں دو دروازے ہیں جن پر گہرے نیلے رنگ کے پردے لگے ہوئے ہیں ــــ پردہ اٹھنے کے چند سکنڈ بعد داہنے دروازے سے شاہدہ اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے کپڑوں میں سرخ رنگ کی بہتات ہے۔ وہ سنبھل سنبھل کر اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک رومال سے برابر کر رہی ہے ــــ اس کے پیچھے عزیز اندر آتا ہے۔ وہ اپنی وردی میں ہے جس کی کریز غائب

ہے۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ ہے، جسے وہ بار بار چوسنے کے انداز سے ہونٹوں کی طرف لے جاتا ہے۔

عزیز :۔ (کھنکار رومال جیب سے نکالتا ہے اور منہ رگڑ کر پونچھتے ہوئے) خوب پہنچے بھئی۔ آپ کی یادداشت کی داد دینا پڑتی ہے، آپ کو ایک دم یہاں کا پتہ خوب یاد آیا۔ ورنہ میری اسکیم تو چوپٹ ہو گئی تھی۔ (بڑھکر شاہدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) آپ بھی اپنے دل میں کہتی ہوں گی کہ عجیب بے تکا آدمی ہے اپنی نئی دلھن کو لے کر، یوں ہی منہ اٹھائے نیا گھر بسانے چل پڑا ـــــ کیوں، ایسی پیاری سی دلھن کو تانگے میں پھرا پھرا کر تھکا مارا، (شاہدہ کی ٹھوڑی پکڑ کر سر اونچا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن شاہدہ شرما کر الگ ہو جاتی ہے۔)

عزیز !۔ دراصل مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ مسعود صاحب قبلہ گھر بند کر کے ایسی سردی میں مری تشریف لے گئے ہونگے۔ (پاؤں پٹخ کر جوتوں کی گرد جھاڑتا ہے اور قالین سے گرد کا ایک بگولہ اٹھتا ہے)

عزیز !۔ (گھبرا کر) اوہ معاف کیجئے گا۔ تمام دھول اڑ گئی ـــــ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ فوجی لوگ ذرا بدتمیز ہوتے ہیں ـــــ ہوں؟ (شاہدہ کی طرف دیکھ میٹھے انداز میں مسکراتا ہے)

شاہدہ !۔ (گھبرا کر پلکیں جھپکاتی ہے اور پھر شرماتے ہوئے) اوں، میں، میں تو۔ میرا مطلب ہے میں نے اپنی طرف سے تھوڑی کہا تھا ـــــ میں نے کہا تھا لوگ کہتے ہیں۔

عزیز !۔ یعنی آپ کا مطلب ہے کہ لوگ کہتے ہیں، پھر آپ کا فوجیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

شاہدہ !۔ (ناز سے) واہ آپ بات خوب یاد رکھتے ہیں۔

عزیز !۔ (شاہدہ کے قریب آتے ہوئے) نہیں ویسے میرا حافظہ کافی کمزور ہے۔ لیکن آپ کی باتیں بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ کیوں ہماری شادی کو دس دن ہو گئے نا۔ دیکھئے مجھے شادی کی تاریخ تک یاد نہیں آ رہی۔

شاہدہ :۔ (کچھ پژمردہ ہو کر تعجب سے) اچھا، سچ سچ ـــــ ہاں شادی اتنی اہم بات تو نہیں کہ اس کی تاریخ یاد رکھی جائے۔ (پھیکی ہنسی ہنستی ہے)

عزیز !۔ اور کیا اب یہ تاریخوں وغیرہ کا حساب بھی یاد رکھنا جھنجھٹ ہے۔ مجھے تو بس آپ کے سوا کچھ یاد نہیں ـــــ سچ معلوم ہوتا ہے جیسے ـــــ

شاہدہ! جیسے؟

عزیز : جیسے آپ مجھے جنم جنم سے یاد ہیں، حالانکہ شاید ہماری شادی کو دس دن ہوئے ہیں۔ (شاہدہ بن کر ہنستی ہے)

عزیز ! اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ـــــ سچ کہتا ہوں مجھے آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت
ہے، حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب سے آج تک آپ کی پلکیں کتنی بار جھپکی ہیں ؟
(عزیز کمر پر ہاتھ باندھ کر شاہدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہے شاہدہ ایک لمحے
رہ کر پیچھے ہٹتی ہے)

شاہدہ ! واہ بخواہ مخواہ بناتے ہیں آپ ـــــ (کچھ سوچ کر) اچھا بتائیے میری پلکیں جب
آج تک کتنی بار جھپکی ہیں۔ چلئے آپ کی بات کا امتحان ہو جائے۔

عزیز ! (پوری سنجیدگی سے) جناب فی منٹ پندرہ دفعہ کی رفتار سے۔ اس حساب سے ایک گھنٹہ
نو سو مرتبہ اور اس حساب سے ایک دن میں اکیس ہزار چھ سو مرتبہ اور پھر اکیس ہزار چھ
دس سے ضرب دے کر بنے غالباً ـــــ آن غالباً ـــــ

شاہدہ ! (بے ساختہ ہنستی ہے) غلط، بالکل غلط ـــــ

عزیز ! ٹھیک بالکل ٹھیک ـــــ

(شاہدہ ہنسے جا رہی ہے۔ عزیز اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر
ہے، اور شاہدہ تیزی سے آتش دان کے قریب چلی جاتی ہے۔)

شاہدہ ! (جیسے اپنے آپ سے) تمام گرد ہی گرد تھی راستے میں ـــــ کتنی بار منہ دھویا، پھر بھوت
بھوت ـــــ تمام جسم پر معلوم ہوتا ہے دھول کی تہہ جم گئی ہے ـــــ جانے نوکر کب رضا
کو اطلاع دے کر آئے گا۔ پانی گرم ہو جاتا تو پہلے ہم لوگ نہا لیتے۔ ٹھیک ہے نا ؟
(شاہدہ آتشدان سے لگ کر شرماتے ہوئے عزیز کو دیکھتی ہے۔ لیکن عزیز بچوں کی طرح منہ
صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور سگریٹ سلگانے لگتا ہے۔)

شاہدہ ! دیکھئے ذرا، یہاں بھی ہر طرف خاک دھول ہی ہے۔ یہ نوکر بڑے مفت خورے ہوتے ہیں
(کارنس پر پھونک مار کر خاک اڑاتی ہے) اب بے چارے رضا ماموں جیسے لوگ بیٹھ کر گھر گرہستی تو
کر سکتے ! ـــــ

(شاہدہ آتشدان پر سے بڑی تصویر اٹھا کر سرخ پلو سے جھاڑتی ہے، اور دو ایک لمحے اسے
سے دیکھ کر ٹھنڈی لمبی سانس لیتی ہے۔)

شاہدہ ! یہ بے چاری ہوتیں تو اس گھر کا یہ حال کیوں ہوتا ؟

عزیز ! شکر ہے، میرا خیال آپ کو نہیں، اس گھر کا خیال تو ہے ـــــ دوسری کروا دیجئے۔ اپنے

جان کی شادی دن رات گھر کی صفائی کیا کریں گی ، نئی ممانی ـــــ

(عزیز بچوں کی طرح روٹھ کر ہونٹ نکالیتا ہے ، اور صوفے پر پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہوجاتا ہے۔)

اہدہ ! (ایک لمبی سانس لے کر) واہ بھلا رضا ماموں شادی کیسے کریں گے ؟

یز ! (بے تعلقی سے) جیسے پہلے کی ہوگی ، آسان ترکیب ہے ۔

اہدہ ! واہ پہلے بھی کہاں کی تھی شادی ؟

یز ! مجھے کیا معلوم کہاں کی تھی ! آپ بتا دیجئے ـــــ

اہدہ ! میرا مطلب ہے ماموں کی شادی ہوئی ہی نہیں ۔

زیز ! تو پھر یہ تصویر ؟

(چونک کر تصویر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شاہدہ تصویر اس کے ہاتھ میں دے دیتی ہے عزیز تصویر پر ایک نظر ڈالتا ہے ۔)

زیز !(سرسری طور پر) اچھی تصویر ہے ۔

اہدہ ! صرف اچھی ، جناب بے حد حسین تھیں ۔ ہماری نورجہاں خالہ ۔

زیز !(چونک کر) آں ، رضا صاحب کی بہن ـــــ عجیب انداز سے باتیں کرتی ہیں آپ ، یعنی آپ ابھی کہہ رہی تھیں کہ یہ تصویر والی خاتون یہاں ہوتیں تو گھر یوں بُری حالت میں نہ ہوتا ـــــ

اہدہ ! اور کیا ؟

زیز ! (طنز سے ہنس کر) جبھی تو کہتا ہوں کہ آپ کی باتیں بھولنا کسی کے بس کی بات نہیں ـــــ یعنی آپ کے ہاں رواج ہے کہ بہنیں تمام عمر بھائی کے گھر کی صفائیاں کرنے کو بیٹھی رہتی ہیں ۔ میرا خیال ہے گھر کی صفائی کا اتنا خیال شاید ہی کوئی بہن کرتی ہو ـــــ یہ تو بس آپ ہیں کہ مارے ان فکروں کے میرے پاس تک آکر نہیں بیٹھتیں ـــــ کیا بات کہ جناب آتشدان کی صفائی ہو رہی ہے ـــــ جہنم میں جائے خاک دھول ـــــ

اہدہ !(اُداس ہوکر) توبہ ! بس آپ کو رات دن اپنی ہی پڑی رہتی ہے ـــــ لے کے بیچاری نوری خالہ کو رضا ماموں کی بہن بنا ڈالا ۔

زیز !(ذرا چڑ کر) اب آپ کے حافظے کی تعریف کر دی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی خالہ کو آپ کے ماموں کی بہن نہیں بچی مان لوں ـــــ

اہدہ ! (ایک دم بُرا مان کر اور ضرورت سے زیادہ اداس ہوکر) آپ کو جانے کیا ہوجاتا ہے طبیعت

ہی بدل جاتی ہے، ایک ذرا، میرا مطلب ہے آپ کی خواہش کے خلاف ــــــ ایسا بھی کر
(شاہدہ رنجیدہ ہو کر تصویر رکھ دیتی ہے اور منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ عزیز سگریٹ ایش
میں بجھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اٹھتا ہے۔)

عزیز! ارے آپ تو ناراض ہو گئیں، دیکھوں ذرا میری گڑیا کے منہ پر غصہ کیسا لگتا ہے۔ (شاہدہ
چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی طرف کرتا ہے) اچھا تو پھر میں سننے کو تیار ہوں کہ آپ
خالہ آپ کے ماموں کی بہن نہیں ہوتیں بلکہ ــــــ

شاہدہ! (اسی کبیدہ خاطر انداز میں) نوری خالہ چچا نا دہن تھیں رضا ماموں کی ــــــ اور کچھ

عزیز! (خوشامد کے انداز سے) خوب اتنی سی بات تھی ــــــ پہلے ہی فقرے میں بتا دیا ہوتا، آپ
جانتی ہیں کہ ہم فوجی ذرا دماغ سے کام کم ہی لیتے ہیں ــــــ اوں، ٹھیک ہے ــــــ
(شاہدہ چپ رہتی ہے جیسے وہ ابھی تک ناراض ہو)

عزیز! آئیے صوفے پر مل کر بیٹھیں، شادی کے بعد گھر میں رسم ورواج کے اتنے ہنگامے تھے کہ وہاں د
آپ کی صورت تک نظر نہ آتی تھی، بس راتوں کو چاند کی طرح طلوع ہوا کرتی تھیں جب تو
بہو بیگم تھیں سب کی ــــــ مگر اب صرف میری شدو ہیں۔ آئیے صوفے پر بیٹھیں۔
(شاہدہ مسحور سی اس کے سہارے چلتی صوفے پر اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔)

عزیز! اور قریب آجائیے شدو رانی! ــــــ ایسے، (اپنے قریب شاہدہ کو سمیٹتا ہے) میں ہمیشہ
خواب دیکھتا تھا کہ ایک سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں چاند سی شدو کے ساتھ آزادی سے
صوفے پر بیٹھوں، ــــــ بس ایسے۔

(عزیز محبت سے اس کے سر پر اپنا گال رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اچانک بائیں دروازے کا
پردہ ہٹتا ہے اور ماموں رضا اندر آجاتے ہیں۔ عزیز اور شاہدہ ایک دوسرے سے یوں الگ
ہوتے ہیں جیسے کانٹے چبھ گئے ہوں۔ دونوں گھبرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

ماموں! (بغیر شرمندہ ہوئے) ارے بھئی حد کر دی عزیز میاں کی تم نے شاہدہ بی بی۔ ایک خط تو ڈال دیتیں
میں اسٹیشن پہنچتا۔

شاہدہ! (دوپٹہ سر پر ڈال کر شرماتے ہوئے) مگر ماموں جان بات یہ تھی کہ عزیز صاحب اپنے کسی دوست کے
ہاں رکنا چاہتے تھے، ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ لوگ مری گئے ہوئے ہیں۔

عزیز! (جھینپ کر) جی ہاں بڑی پریشانی ہوئی ــــ میں نے کہا ہوٹل چلیں، مگر یہ شاہدہ نے دماغ

دیا تو آپ کا پتہ یاد کر کے چھوڑا۔ یہ کہتی تھیں ماموں کے ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب نہیں ——
معاف کیجئے گا ہم لوگوں نے آکر —— (عزیز کھسیا کر دونوں ہاتھ ملتا ہے)

ماموں : چہ بھئی ! خواہ مخواہ غیریت کی باتیں —— جبھی تو کہتا ہوں کہ تم لوگوں نے مجھے اپنا سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اگر تم مجھے اپنا سمجھتے تو کسی دوست کے ہاں ٹھہرنے کی بات ذہن میں آتی ہی نہیں ؟ ٹھیک ہے نا ؟

عزیز : مگر آپ سے میرا مطلب ہے میری ملاقات نہیں تھی' اس لئے ——

ماموں : ہاں میں شادی میں نہیں آسکا ، مگر شاہدہ مجھے بہت عزیز ہے ، بس پھڑک کر رہ گیا ، بات یہ ہے عزیز میاں یہ شادی وادی کے ہنگامے ، میرے جیسے آدمی کے لئے فِٹ نہیں بیٹھتے۔ حالانکہ میں شدو کو دلہن بنے دیکھنا چاہتا تھا مگر یہ شادی وادی —— (لمبی سانس لیتے ہیں) اوہ مگر تم لوگ کھڑے کیوں ہو ، بیٹھو بھئی۔

(عزیز اور شاہدہ سعادت مند بچوں کی طرح صوفے کی طرف لپکتے ہیں۔ عزیز ایک کونے میں اور شاہدہ دوسرے کونے میں سمٹ جاتے ہیں۔ دوسرے لمحے ماموں دونوں کو پُرشفقت نظروں سے دیکھ کر دونوں کے بیچ میں سما جاتے ہیں۔)

ماموں : میں کہہ رہا تھا کہ بھئی یہ شادی وادی ——

(عزیز حیران نظروں سے شاہدہ کو دیکھتا ہے —— اور ماموں رک کر ہنس پڑتے ہیں)

ماموں : (اداس ہنسی ہنس کر) تم مجھے نہیں جانتے عزیز میاں ، خیر خیر ——
تم لوگ نہا دھو لو۔ تمہارے بال خاک دھول میں اَٹے ہوئے ہیں۔ (اونچی آواز سے)
ارے میاں شرفو ! بھائی حمام گرم کر دو —— اور ہاں تم لوگوں نے سامان کہاں رکھا ہے اپنا ؟

شاہدہ : جی آپ کے بیڈ روم میں ، آپ کو تکلیف تو ہوگی۔

ماموں : اوہ بھئی پھر وہی تکلف کی باتیں ، بھئی یہ مکان بڑا بے تکا ہے ، کئی تین کمرے ہیں مگر دل میں جگہ ہونا چاہیئے۔ نئی نسل اس بات کو تو کیا سمجھے گی۔ بہرحال میرا تو جی خوش ہو گیا تم لوگوں کو دیکھ کر۔ اطمینان سے رہو اپنا گھر سمجھ کر۔

عزیز : جی تھوڑے دن میں مجھے فیملی کوارٹر مل جائے گا۔ انشاءاللہ۔ بس بات یہ ہوئی کہ میں شادی کے سلسلے میں چھٹی پر تھا ، جیسے ہی ڈیوٹی پر پہنچا تبادلے کے آرڈر مل گئے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ یہ آپ کی بھانجی بیچاری بڑی کوفت میں مبتلا ہوگی کہ بغیر انتظام کئے ——

ماموں : (بات کاٹ کر) ارے بھئی تو شاہدہ کو اس کے میکے چھوڑ آتے جب پکا انتظام ہو جاتا تو پھر ——

—— چہ مگر تم نئی نسل کے لوگ مادی اقدار کے آگے ——

عزیز ! (ہڑبڑا کر) جی، جی ہاں۔ (شرم سے سرخ ہو کر سر کھجانے لگتا ہے)

ماموں ! عزیز میاں شرمانے کی بات نہیں میں پرانے ٹھاٹ کا آدمی نہیں کہ رشتے ناطے دیکھ کر بات کروں —— میں تو کھل کر بات کرتا ہوں، مجھ سے تم دوستانہ طریقے سے بات کر سکتے ہو۔ اطمینان سے رہو۔ (لمبی سانس لیکر) آج تم لوگوں کے آجانے سے گھر کتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے۔

(پردہ)

دوسرا منظر

(ماموں رضا کا بیڈ روم۔ کمرے کے بیچوں بیچ پلنگ بچھا ہے، جس کی چادر میلی ہے۔ اور تکیے کا آدھا غلاف اترا ہوا ہے۔ پلنگ کے پاس ایک تپائی ہے۔ جس پر چند کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں، اور ساتھ ہی نیلے شیڈ کا لمپ ہے تپائی سے تھوڑے فاصلے پر پرانے طرز کی ایک جہازی سائز کی آرام کرسی ہے۔ پلنگ کے سامنے زمین پر کشمیری نمدہ بچھا ہوا ہے۔ جو میلے پن کی وجہ سے خاکی رنگ کا نظر آ رہا ہے۔ اس کمرے میں سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ، ایک کھڑکی ہے۔ جس پر پشیالے رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو غسل خانے میں جاتا ہے۔ اور بائیں طرف کا دروازہ کھانے کے کمرے میں کھلتا ہے۔ اس وقت غسل خانے کا دروازہ بند ہے اور کھانے کے کمرے کا نیم وا۔ کمرے کے ایک کونے میں کپڑوں کی پرانی الماری کے قریب دو بستر اور چند سوٹ کیس وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں —— شاہدہ بائیں دروازے سے اندر آتی ہے اور دروازے کی چٹخنی لگا دیتی ہے۔ پلٹ کر اپنے سامان کی طرف آتی ہے اور ایک سوٹ کیس کھول کر اکڑوں زمین پر بیٹھ کر کچھ الٹ پلٹ کرتی ہے —— وہ ابھی تک اسی لباس میں ہے۔ جو پہلے منظر میں پہنے ہوئے تھی۔ غسل خانے کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور عزیز ڈریسنگ گون پہنے، سردی سے کنکناتا، تولیہ سے بال پونچھتا کمرے میں آتا ہے۔ شاہدہ اپنے کام میں منہمک ہے۔ عزیز کھانے کے کمرے کے دروازے تک جاتا ہے، ہاتھ سے چٹخنی ٹٹول کر واپس آتا ہے۔ اور ہنستے ہوئے شاہدہ کے قریب دبے قدموں جا کر اسے جوں کا توں گود میں اٹھانے لگتا ہے —— شاہدہ کشمکش کرتی ہے)

شاہدہ ! ہائیں ہائیں کچھ دیوانے ہوئے ہیں آپ —— بھئی اللہ چھوڑیئے۔ (اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہے)

عزیز ! اچھا میری دیوانگی کی اطلاع اس وقت ہوئی ہے آپ کو ——

شاہدہ ! اوں بھئی ہٹیئے ادھر چکر آگیا۔ خواہ مخواہ بچوں کی طرح !

عزیز ! شدو —— شدو رانی —— (اس کی طرف بڑھتا ہے) بور ہو گئے شاہدہ، کتنا لمبا سفر

کیوں سفر کیسا ٹھاٹ دار کٹتا ؟ کیوں۔ ــــــ اچانک چلنا ہوا ۔ ورنہ کوپے ریزرو ہو جاتا تو ــــــ

ہدہ ! ہائے اللہ آپ بھی بس ــــ حد ہے۔ کیسی باتیں سوچتے رہتے ہیں ۔ (شرماتی ہے)

یز ! ہاں جانے میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے ــــ بھوسہ بھر گیا ہے ۔ واقعی بڑی بد اخلاقی کی بات ہے ' یہ سوچنا کہ دو انسان آرام سے سفر کریں ــــ بس اب تو آپ کا فتویٰ اچھا ہوگا نا ؟

(شاہدہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھاتا ہے اور شاہدہ زبردستی سر نیچا کر لیتی ہے)

یز ! (بڑی گہری گمبھیر آواز میں) شدو ' میری چاندرانی ــــ (شاہدہ کے سر پر اپنا گال رگڑتا ہے)

ہدہ ! (ایک دم الگ ہو کر) ہٹیئے بس ' ایک دم گندی ہو رہی ہوں ۔ خود تو جلدی سے نہا دھو کر تازہ دم ہو گئے اور میرا یہ حال ہے کہ ابھی تک سر میں ریل سی چل رہی ہے ۔ اور ناک حلق میں اتنی خاک اٹی ہوئی ہے کہ جی متلایا جا رہا ہے ۔ مگر آپ کو میری حالت سے کیا غرض ' ٹھیک تو کہتے ہیں ماموں رحنا کہ نئی نسل والے مادی اقدار کے پیچھے ــــ

یز ! ۔ (ایک دم پلٹ کر ' کمر پر ہاتھ باندھ کر) ہوں ! تو یہ کہیئے کہ ــــ

(چپ ہو کر ایک دم ٹہلنے لگتا ہے)

ہدہ ! (غور سے اس کی طرف دیکھ کر) کیا کہوں ؟ کیوں بھئی ؟ روٹھ گئے وہ تو میں جانتی تھی۔

زیز ! ۔ (ایک دم ہنس کر) کہاں ' کہیں بھی نہیں ــــ اچھا اب آپ جلدی سے نہا لیں ۔ پھر سینما چلیں گے ۔ دو بجنے والے ہیں ، آدھے گھنٹے میں تیار ہو جائیے ۔ کل سے تو میری ڈیوٹی ہے ۔ اتنے دنوں بعد ڈیوٹی پر جانے سے جی گھبراتا ہے ۔ اس لئے آج ذرا عیش کر لیں ' سینما سے واپسی پر کہیں چائے پئیں گے ، پھر کچھ شاپنگ کریں گے ۔ اور پھر رات کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے ــــ ٹھیک ہے ۔ ہفتہ دس دن میں ہمیں کوارٹر مل جائے گا ' اس کے بعد تو آپ گھر والی بن جائیں گی اور گھر کی دھولیں جھاڑنے میں لگ جائیں گی ــــ

(ناز سے ہنس کر شاہدہ دوبارہ زمین پر بیٹھ کر کپڑے الٹنے پلٹنے لگتی ہے ــــ عزیز سیٹی بجا کر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے ــــ دفعتاً وہ رک کر تپائی کی کتابیں الٹنے پلٹنے لگتا ہے ۔)

زیز ۔ اوہ بڑی بڑی کتابیں جمع کی ہیں ماموں نے ۔ باپ رے یوگ ودیا ؟ (ایک کتاب اٹھا کر فوراً رکھ دیتا ہے ۔) اور یہ ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس ــــ ارے ۔ اور پھر یہ مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح ــــ اور یہ " افرا ڈائٹ " (لمبی سیٹی بجاتا ہے ۔ اور پھر ٹہلنے لگتا ہے ۔ شاہدہ شلوار میں کمربند ڈال رہی ہے ۔ اسے ایک لمحے تک غور سے دیکھنے کے بعد عزیز پلنگ پر پاؤں لٹکا کر

بیٹھ جاتا ہے)

عزیز !۔ شاہدہ یہ ماموں بھی خوب آدمی ہیں بیچارے ـــــــ

شاہدہ ! جی ہاں' بڑے مخلص' بڑے شریف آدمی ہیں۔ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کئی سال یورپ میں رہ آئے مگر طبیعت ذرا نہیں بدلی ' یہاں آکر کیمسٹ شاپ کھول لی۔ اور خاموشی سے زندگی گزار رہے ہیں۔ کہتے ہیں یورپ صرف جسم ہے اور ایشیا صرف روح ۔ وہ روح کی عظمت کے بہت قائل ہیں۔

عزیز ! کیا روحانیات کے قائل ہیں ـــــ یعنی روحیں وغیرہ بلانا جانتے ہیں ؟

شاہدہ ! ہٹیے مذاق نہ کیجیے ' آپ نے کیا انہیں شعبدہ باز سمجھا ہے ـــــ وہ تو بس روح کی عظمت اور پاکیزگی کے قائل ہیں ـــــ جیسے

عزیز ! (بات کاٹ کر) بھئی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ روح یعنی جان' یعنی زندگی ۔ پھر زندگی تو جسم سے ہے نا ـــــ

شاہدہ ! اونہہ ' بھئی ان معنوں میں ـــــ

عزیز ! (بے تابی سے) بھئی میں فوجی آدمی' میرے پلے یہ باتیں نہیں پڑتیں ـــــ ہاں یہ آپ کی نوری خالہ کا کیا قصہ ہے۔

(شاہدہ شلوار میں کمربند ڈالتے ہوئے عزیز کے پاس پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی ہے۔ بے دم کی ٹھنڈی سانسیں لیتی ہے)

شاہدہ ! نوری خالہ بڑی خوبصورت' بڑی شرمیلی تھیں ۔ رضا ماموں ان پر مرتے تھے۔ مگر نوری خالہ اتنی پاکباز تھیں کہ انھوں نے کبھی رضا ماموں کو اپنی انگلی تک نہ چھونے دی۔ ایک بار رضا ماموں نے انگلی پر لٹکے ہوئے نوری خالہ کے دوپٹے کو آنکھوں سے لگا لیا تھا تو نوری خالہ بہت روئیں۔ اور کہا کہ رضا تم نے محبت کی پاکیزگی پر خاک ڈال دی ـــــ اس کے بعد رضا ماموں ان کے عشق میں بالکل مجذوب سے ہو گئے ـــــ یہ قصے ہمارے خاندان کی لڑکیوں کو بڑی تفصیل سے یاد ہیں ـــــ (شاہدہ شلوار گود میں ڈال کر ـــــ کچھ سوچتی ہے اور پھر ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔)

عزیز ! ۔ ارے پھر تو نوری خالہ کو رضا ماموں پسند نہ ہوں گے ۔ جبھی تو وہ انھیں چھونا تک گوارا نہ کرتی تھیں۔

شاہدہ ! (ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر) ارے آپ کیا سمجھیں گے ان باتوں کو۔ آپ تو بس ـــــ ارے وہ کہتی تھیں کہ جو کہنا ہے میرے ابا سے کہو ۔ مگر رضا ماموں اور نوری خالہ کے اباؤں کی

میں بڑی دشمنی تھی۔ دونوں بھائی تھے مگر ایک دوسرے سے بیزار ـــــ آپ تو جانتے ہیں ہم پٹھانوں کو بات نہیں بھولتی ـــــ رضا ماموں دیوانے سے ہوگئے مگر رضا ماموں کے ابا کو معلوم ہوا تو بہت بگڑے کہ میرے دشمن کی بیٹی میرے گھر بہو بن کر نہیں آسکتی۔ رضا ماموں نوری خالہ کے ابا کے پیروں پر گرے، بہت گڑگڑائے۔ مگر انھوں نے جواب دیا کہ تیرے بجائے تیرا باپ آکر میرے پاؤں پکڑے تو پھر میں اس بارے میں سوچوں گا۔ پھر بھی وعدہ نہیں ـــــ یہ قصہ سارے خاندان بلکہ سارے شہر میں اڑ گیا رضا ماموں اتنے بیمار پڑے کہ دم لبوں پر آگیا۔

بز !۔ تو بھگالے جاتے نوری خالہ کو۔

بدہ !(بڑے دکھ سے) واہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں کبھی کاہے کو ایسی باتیں ہوئی تھیں۔ اور پھر نوری خالہ تو حوروں سے زیادہ پاک تھیں۔ بھلا وہ مر نہ جاتیں اس سے پہلے۔

بز !۔ اچھا پھر کیا ہوا۔

بدہ !۔ پھر نوری خالہ کی خاندان ہی میں شادی ہوگئی۔ اور بیچاری چپ چاپ اس سماج ـــــ

بز !۔(بات کاٹ کر) اچھا پھر ہوا کیا؟

ابدہ ! پھر سات سال بعد نوری خالہ کے خاوند کو دق ہوگئی اور وہ مر گئے ـــــ رضا ماموں نے پھر نوری خالہ کے ابا کے سامنے ماتھا رگڑا ـــ پھر انکار ہوگیا۔ لیکن اس بار نوری خالہ کی مرضی لی گئی۔ نوری خالہ عزت پر قربان ہونے والی تھیں۔ باپ سے کہلوا دیا، کہ جیسی باپ کی مرضی ـــــ رضا ماموں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے شکایت بھجوائی۔ نوری خالہ نے جواب بھجوایا کہ کیا تم ایسی لڑکی سے محبت کرسکتے ہو جو اپنے باپ کا غرور اور عزت خاک میں ملا دے ـــــ؟ نوری خالہ کے اس جواب کا رضا ماموں پر بہت اثر ہوا۔ اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ نوری خالہ پر مرنے لگے۔

بز ۔ چہ بھئی، شادی میں اپنی رضا مندی کون سا گناہ تھا۔ میں کہتا ہوں۔

شاہدہ !۔ اپنی بات جانے دیجئے۔ ہاں تو پھر چند سال بعد نوری خالہ کا ایک اور نکاح ہوگیا۔ سال نہیں گزرا تھا کہ ان کا یہ والا میاں ایک اور عورت سے نکاح کرکے نوری خالہ کا زیور بیچ کر جنوبی افریقہ بھاگ گیا۔ اور وہاں پہنچنے کے پانچ سال بعد اس نے نوری خالہ کو طلاق نامہ بھیج دیا ـــــ

(شاہدہ دکھ سے ایک دم چپ ہوجاتی ہے)

بز !۔ پھر اس کے بعد؟

شاہدہ !۔ اس دوران میں رضا ماموں پر سب نے بہت زور ڈالا کہ وہ کہیں شادی کرلیں۔ مگر رضا ماموں کنوارے

رہے ـــــ وہ کہتے نوری میری ہے میں اس کا انتظار کروں گا۔

عزیز ! ۔ اب اس کے بعد تو شادی ہو جانا چاہیئے تھی ۔

شاہدہ ! ۔ مگر نہیں ہوئی ۔ نوری خالہ کی بدنصیبیوں کے پیش نظر ان کے ابا اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ اگر رضا اب اپنے باپ کو لے کر آئے تو وہ نوری کو رضا سے بیاہ دیں گے ـــــ سارے خاندان نے اس سلسلے میں دوڑ بھاگ کی تھی ـــــ اس قصے میں کئی سال لگ گئے ـــــ لیکن رضا ماموں کے ابا نے کہا کہ میں اپنے بھائی سے دشمنی ختم کرنے کی غرض سے ان کے گھر کی بیٹی لینے کو تیار ہوں ۔ مگر نوری میری بہو نہیں بن سکتی ۔ بلکہ نوری کی سب سے بڑی لڑکی گل بانو ـــــ

عزیز ! آں ـــــ مگر کیوں ؟

شاہدہ ! ۔ نوری خالہ کے بال سفید ہو گئے تھے ۔ اس لئے ۔

عزیز ! مگر رضا ماموں کے بال بھی تو سفید ہو گئے ہوں گے ـــــ

شاہدہ ! ہاں ! مگر رضا ماموں ابھی تک کنوارے تھے اور نوری خالہ دو دفعہ کی بیاہی ۔ (شاہدہ کے ہونٹ کپکپا رہے ہیں آواز بھرّا جاتی ہے) گل بانو کے لئے رضا ماموں کا نام سن کر نوری خالہ نے گھر کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ۔ کچھ کہتے ہیں وہ پانی کی بالٹی نکالنے میں اتفاق سے گر گئیں ۔

عزیز ۔ افوہ ۔ پھر کیا ہوا ؟

شاہدہ ! ۔ (سسکی لے کر) وہی جو مرنے کے بعد ہوتا ہے ۔

(عزیز یوں سر ہلاتا ہے ۔ جیسے وہ بات ایک دم سمجھ گیا ہو ۔ شاہدہ غم سے سر جھکائے ہوئے ہے عزیز اُسے بازو میں لپیٹ کر تھپکتا ہے ۔)

شاہدہ ! اس کے بعد سے آج تک رضا ماموں نوری خالہ کے نام پر زندہ ہیں ۔ مگر انہوں نے کسی عورت کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا ۔ وہ کہتے ہیں نوری جیسی پاک روح مر نہیں سکتی ۔ وہ زندہ ہے اور میں اس کا انتظار کر رہا ہوں ۔

(شاہدہ دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے ۔ عزیز ہمدردی سے اس کا سر سہلاتا ہے اور آرام سے بستر پر لٹا دیتا ہے ۔)

شاہدہ ! (ایک دم جذباتی ہو کر) عزیز میرا دل دھڑک رہا ہے ۔ خدا ہماری محبت کو پروان چڑھائے ۔ میرے قریب آجاؤ ۔ اور قریب ۔ (عزیز جذباتی ہو کر جھکتا ہے ۔ پردہ آدھا گرتا ہے کہ دروازے پر زور کی دستک ہوتی ہے ۔ پردہ دوبارہ اٹھتا ہے ۔ عزیز گھبرا کر دروازہ کھولتا ہے ۔ شاہدہ آنسو

پونچھتی ہوئی غسلخانے میں چلی جاتی ہے۔ ماموں بڑے معصوم انداز سے اندر آتے ہیں اور آ کر آرام کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ عزیز شرمندہ سا ہے۔)

موں ! ۔ یہ تم یہاں کیوں بند ہو۔ باہر کھلو صاف ہوا لو ــــــ (اٹھ کر سامنے کی کھڑکی اور دروازہ کھول دیتے ہیں) صاف ہوا روح کی صفائی کے لئے بے حد ضروری ہوتی ہے۔

عزیز ! ۔ جی ذرا شاہدہ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ میں نے کہا ہم لوگ نہالیں تو شاید تکان اتر جائے ــــ آپ دکان پر سے کب تشریف لائے۔

ماموں ! ۔ ارے میاں دکان پر تو میں کہہ آیا کہ میں نہیں آؤں گا۔ دکان پر جانا تو دراصل تنہائی سے بچنے کا مشغلہ ہے۔ جب تک تم لوگ ہو میں دکان پر نہیں جاؤں گا۔

عزیز ! ۔ (گھبرا کر) جی نہیں جناب آپ ہماری وجہ سے اپنا نقصان نہ کریں۔ دراصل ہم تو یوں ہی شرمندہ ہیں۔ آپ اطمینان سے اپنے معمول کے مطابق ــــــ

ماموں ! ۔ (تیزی سے بات کاٹ کر) ہاں تکلف کی بات تو یہی ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اپنے گھر آئے ہوؤں کو اکیلا گھبرانے کے لئے نہیں چھوڑتے۔

عزیز ! ۔ (پریشان ہو کر) مگر ہم اکیلے تو نہیں ہیں۔ ہم بالکل نہیں گھبرائیں گے۔ پھر آپ کا نقصان ہوگا دکان پر نہ جانے سے۔

ماموں ! ۔ میرا نقصان کیا ہوگا۔ آدھ درجن ملازم ہوتے ہیں دکان پر ــــــ اور پھر میاں بے تکلفی سے پسچ کہہ دوں خود مجھے بھی تم لوگوں کے ساتھ رہنا پسند ہے ــــ ایک زمانے سے تنہا رہتے رہتے اکتا گیا ہوں۔

عزیز ! ۔ میں تو کہتا ہوں آپ تکلف ــــــ

(شاہدہ غسلخانے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹاتی ہے)

ماموں ! ۔ کیا بات ہے شدو بی۔

عزیز ! ۔ کپڑے بدلیں گی شاید۔

ماموں ! ۔ اچھا تو آؤ ڈرائینگ روم میں چل کر بیٹھیں۔

(ماموں دھیرے دھیرے دروازے تک جاتے ہیں۔ عزیز منہ پھیرے اپنا سامان ادھر ادھر کرنے لگتا ہے۔ گویا بہت ضروری کام یاد آ گیا ہو۔)

ماموں ! ۔ (دروازے میں غائب ہو کر) آجاؤ بھائی آرام سے بیٹھو آ کر۔

عزیز !۔ بہت اچھا جناب حاضر ہوا۔ ذرا کپڑے پہن لوں۔

(عزیز لپک کر دروازے میں چٹخنی لگا دیتا ہے۔ شاہدہ غسلخانے سے باہر آتی ہے۔ وہ گلابی رنگ ریشمی ڈریسنگ گون پہنے ہے اور سر پر تولیہ لپیٹے ہے۔)

عزیز !۔ آگئیں میری شندورانی ۔ (اس کے سر پر سے تولیہ کھینچ لیتا ہے۔ اور اس کی بھیگی ہوئی لٹیں ہاتھوں لے کر اپنے دونوں رخساروں پر بھینچتا ہے۔ شاہدہ مسحور ہو کر مسکراتی ہے۔)

عزیز !۔ ایک بات بتاؤں ۔

شاہدہ !۔ کیا بات ۔

عزیز !۔ بڑے راز کی بات ہے۔

شاہدہ !۔ اللہ جلدی سے بتا دیجئے۔ پکچر بھی جانا ہے۔

عزیز !۔ (اس کے بازو دبا کر) تم اس وقت سیپ سے نکلی ہوئی جل پری لگ رہی ہو۔

شاہدہ !۔ (اترا کر) ہوں، ہٹئے کبھی بھی نہیں ۔

(اچانک دروازہ بھڑ بھڑایا جاتا ہے ۔)

ماموں کی آواز !۔ ارے بھئی عزیز میاں آؤ بھی۔ میں تمہیں اپنا یورپ کا البم دکھاؤں۔

(عزیز کے ہاتھ گر جاتے ہیں، مگر وہ شاہدہ کو بازوؤں میں لینے کی ایک بار کوشش کرتا ہے شاہدہ اس طرح پریشان ہو کر پیچھے ہٹتی ہے۔ جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہو۔)

شاہدہ !۔ ہائے اللہ جلدی سے جائیے۔ کیا کہیں گے ماموں۔ انھیں کیا پتہ۔ مجھے تو شرم آتی ہے لیجئے کپڑے جلدی سے پہن لیجئے ۔

عزیز !۔ اچھا شندو، خوب دور دور رہ لو، سمجھوں گا تم سے۔ بڑی خراب ہو تم ۔ (پیار سے اس بال مٹھی میں لے کر چھوڑ دیتا ہے۔)

ماموں کی آواز !۔ آجاؤ عزیز میاں، ایسی بڑھیا چیز دکھاؤں تمہیں !

عزیز !۔ (غسلخانے کی طرف جاتے ہوئے) حاضر ہوا قبلہ۔ بس ایک منٹ میں۔

(پردہ)

تیسرا منظر

(وہی ڈرائینگ روم، اپنی پچھلی ترتیب کے مطابق۔ پردہ اٹھتا ہے تو ماموں رضا سائ

بڑے صوفے پر بیچوں بیچ نیم دراز ہیں۔ ٹانگیں کشمیری تپائی پر ہیں ـــــ پردہ اٹھنے کے فوری بعد ماموں "ارے آجاؤ بھائی" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ان کی گود میں سیاہ رنگ کا ایک فوٹو البم رکھا ہوا ہے۔ جسے وہ الٹ پلٹ رہے ہیں ـــــ دائیں دروازے سے عزیز ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا اندر آتا ہے۔ اس وقت وہ گرم چاکلیٹی سوٹ میں ملبوس ہے)

موں!۔ عزیز میاں، کیسے فوجی ہو بھئی۔ میں بوڑھا آدمی ہوں اور دکاندار، سونے پر سہاگہ۔ مگر گھر سے نکلنے کے لئے مشکل سے پانچ منٹ تیاری کے لیتا ہوں۔ اور تم ہو کہ کپڑے پہنتے ہیں۔

زیز!۔ جی: میں ہاں بس۔ ایسے ہی۔

موں۔ شاہدہ کہاں ہے۔ ارے بھئی شاہدہ۔

زیز!۔ جی وہ تیار ہو رہی ہیں۔ ہمیں پکچر جانا ہے اس وقت۔

موں!۔ پکچر؟ ارے بھئی ان پکچرز میں رکھا ہی کیا ہوتا ہے، مجھے تو نفرت ہے۔ یورپ میں دو ایک بار دوستوں کے اصرار پر گیا مجھے تو اختلاج ہو گیا گری ہوئی عشق بازیاں دیکھ کر۔ عزیز میاں بات دراصل یہ ہے کہ زمانہ آج جن اقدار کے پیچھے بھاگ رہا ہے، اس سے محنت کا اعلیٰ اور ارفع جذبہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ اور پھر یہ غیر ملکی کتابیں اور فلمیں ـــــ فلم تو صرف جسم ہی جسم ہیں۔

زیز!۔ جی۔ جی ہاں ٹھیک ہے۔

موں!۔ پھر فلم دیکھ کر اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔

زیز!۔ یوں ہی جناب بس دیکھ لیتا ہوں ـــــ پھر اس وقت تو شاہدہ جانا چاہتی ہے، بات یہ ہے کہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ ہمیں خود مختاری ملی ہے۔ ہم دونوں پہلی بار اکٹھا فلم دیکھنے جا رہے ہیں ـــــ (گھڑی دیکھ کر) اوہ کافی وقت ہو گیا ـــــ (یوں ظاہر کرتا ہے جیسے دوسرے لمحے اسے چل دینا ہے۔)

اموں! (حیران ہو کر) خوب! شاہدہ کے بارے میں تو سنا تھا کہ وہ فلموں سے بہت چڑتی ہے ـــــ (زور سے) شاہدہ، ارے شاہدہ بی بی ادھر تو آؤ ـــــ

(عزیز مذبذب کیفیت میں ادھر ادھر ٹہلتا ہے، شاہدہ خوب بنی سنوری ہاتھ میں سلمے ستاروں سے مزین سرخ بٹوہ لئے آتی ہے۔ عزیز اس کی طرف دیکھ کر بے تابی سے چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ماموں جلدی سے اٹھ کر شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں۔)

شاہدہ!۔ (عزیز کی طرف دیکھ کر) چلئے گا نہیں! تین بج رہے ہیں۔

ماموں!۔ چلی جانا میں روکوں گا نہیں، مگر پوچھتا ہوں تم فلموں کی قائل کب سے ہو گئیں؟

شاہدہ!۔ جی ہاں کنوارپنے میں فلم کا زیادہ شوق بہتر نہیں ہوتا۔ مگر اب تو —— (شرماتی ہے)

ماموں!۔ مگر فلم میں رکھا ہی کیا ہوتا ہے؟

شاہدہ!۔ مگر دیکھئے انسان کوئی تفریح تو کرے —— چلئے اس وقت تو آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔ (تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے) پھر پکچر نہیں ملے گی ——

ماموں!۔ خوب، میں دیکھوں پکچر۔ کمال ہے —— اچھا تم لوگ چائے تو پی لو۔

عزیز!۔ بس آپ تکلیف نہ کریں، ہم دونوں وہیں چائے پی لیں گے —— رات کھانے پر بھی ہمارا انتظار نہ کریں ——

(ماموں کچھ بُرا سا منہ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔)

ماموں۔ اچھا میں نوکر سے تانگے کے لئے کہہ دوں —— (ماموں بائیں دروازے سے جاتے ہیں)

عزیز!۔ (بچوں کی سی مسرت سے) خوب ضد کرلی آپ نے اس وقت، میں تو سمجھا تھا کہ پروگرام غرق ہوا۔ (منہ بنا کر) اور ہاں یہ آپ نے ماموں کو ساتھ چلنے کی دعوت کیوں دی تھی؟ میں جانتا ہوں یہ مجھ سے دور ہٹ کر بیٹھنے کی ترکیب نکالی تھی آپ نے۔ وہ تو کہو شکر ہے کہ وہ پکچر زیادہ پسند نہیں کرتے۔

شاہدہ!۔ (بٹوہ انگلی میں لٹکا کر جھلاتے ہوئے، لچک لچک کر) جی یہ بات مجھے معلوم تھی جبھی تو میں نے انھیں دعوت دیدی۔

عزیز!۔ ہوں! چالاک لڑکی! اچھا اسی بات پر —— (جلدی سے بڑھ کر شاہدہ کا ہاتھ چومتا ہے) پیسے کافی رکھ لئے ہیں؟ ہوسکتا ہے رش ہو، باکس کا ٹکٹ تو لے لیں گے۔ کیوں؟

شاہدہ!۔ (ناز سے بگڑ کر) پھر بے ایمانی کی باتیں —— جائیے ہم نہیں بولتے۔ (ہاتھ چھڑا لیتی ہے)

عزیز!۔ ارے —— پتہ نہیں کیسی باتیں سوچتی ہیں آپ —— یہ بیویوں والے ڈھنگ نہیں۔

شاہدہ!۔ بیوی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ —— واہ، ہر وقت میرا مذاق بنائے رکھتے ہیں نا

عزیز!۔ ہر وقت؟ —— میرا تو جی چاہتا ہے آنکھوں میں بٹھا لوں —— محبت ایسی اندھی ہوا

شاہدہ!۔ (ایک دم منہ اتر جاتا ہے اور سنجیدگی سے پلکیں جھپکا کر) اگر محبت صرف مذاق بنا لینے کا نام ہے تو رضا ماموں پھر ساری زندگی آپ کے خیال میں جھک مارتے رہے۔ سچی محبت تو محض نام پر زندگی بسر کروا دیتی ہے ——

ز !۔ (یکلخت سنجیدہ ہوکر) گمر شد، مرد اور عورت کی محبت میں ــــــ
ں !۔ (اچانک کمرے میں آتے ہوئے) تانگہ آگیا۔
(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں)
ں !۔ (کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے) چلو بھئی جلدی چلیں۔
ہدہ !۔ آپ دکان پہ جا رہے ہیں ؟ اچھا ہے ۔
ں !۔ (حیران ہوکر) دکان کیوں۔ جب تک تم لوگ ہو، دکان جانا بند۔
یز !۔ پھر؟
وں !۔ (شفقت سے ہنستے ہوئے) میں نے کہا شد و بٹیا نے ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ نہ گیا تو تم لوگ برا مانوگے نئے دولہا دلھن کی بات نہیں ٹالنا چاہیئے ــــــ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ بھائی میں ڈرتا ہوں کہ تم لوگ مجھے بالکل ڈاڑھی والا بوڑھا ماموں نہ سمجھ لو ــــــ (ﭼﮭﺎ جان قہقہہ لگاتے ہیں اور شاہدہ اور عزیز کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر دروازے میں غائب ہو جاتے ہیں۔)

(پردہ)

چوتھا منظر

(وہی ڈرائنگ روم اور وہی ترتیب۔ صرف اتنی تبدیلی ہے کہ کمرے کی تمام روشنیاں جل رہی ہیں۔ عزیز کمرے میں اکیلا صوفے پر ٹانگیں پھیلائے دراز ہے۔ اس کے جسم پر نائٹ سوٹ کے ساتھ ڈریسنگ گون ہے ــــــ وہ تھکا ہوا نظر آرہا ہے کئی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے کے بعد ہاتھ میں جلتی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں مروڑ دیتا ہے ــــــ چند لمحوں بعد شاہدہ سادے کپڑے پہنے اور گرم چادر اوڑھے آتی ہے، اور عزیز کے پیروں کے قریب صوفے پر ٹک جاتی ہے۔)

ہدہ !۔ پتہ نہیں ماموں جان سینما سے واپسی پر بازار میں کیوں اتر گئے ــــــ معلوم ہوتا ہے کھانے میں کچھ تکلف شامل کریں گے ــــــ (رک کر) ہمیں ہوٹل میں کھانے سے روکا، اس لئے سوچا ہوگا چلو گھر پر ہوٹل جیسا مزیدار ڈنر ہو ــــــ ماموں خواہ مخواہ ہم لوگوں کی اتنی خاطر کرتے ہیں بیچارے۔
(عزیز خاموش چھت کی طرف دیکھتا رہتا ہے)
ہدہ !۔ کیا بھوک لگ رہی ہے ؟ لگی تو ہوگی۔ سفر میں کھانا اچھی طرح کھایا بھی نہیں جاتا۔

عزیز !۔ نہیں تو ۔

شاہدہ !۔ پھر چپ کیوں ہیں ؟ کیا بہت تھک گئے ۔ چلئے تھوڑی دیر آرام کر لیجئے ـــــ ماموں کے بستر پر لیٹ جائیے ـــــ ماموں آجائیں تو جلدی سے کھانا کھا کر سونے کا انتظام کریں ۔

(عزیز خاموش رہتا ہے ۔ شاہدہ اسے غور سے دیکھتی ہے)

شاہدہ !۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ جگہ پسند نہیں آرہی ۔ بھئی بیچارے ماموں کہیں کے رئیس تو نہیں ۔ مگر دل کے بڑے ہیں ۔ جب سے ہم آئے ہیں کتنی اپنائیت سے پیش آرہے ہیں ۔

عزیز !۔ بے شک ـــــ لیکن میں کوئی اعتراض تو نہیں کر رہا ہوں ۔ ویسے ہی طبیعت ذرا سست ہے ـــــ کچھ بور تھی اس لئے ـــــ اور آپ خدا جانے کیا کچھ سوچنے لگیں ۔ دراصل آپ کے ماموں کی بڑی عنایت ہے کہ وہ ـــــ

شاہدہ !۔ (تیزی سے) آپ نے پھر عزیزیت کی باتیں شروع کر دیں ـــــ خیر ۔

عزیز !۔ (صوفے پر بیٹھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا ۔ دراصل اب تک تو اس کا موقع ہی نہ ملا ـــــ اب ہم ـــــ

شاہدہ !۔ تو کیجئے باتیں ، روک کون رہا ہے ؟

عزیز !۔ دیکھئے شہدرانی (اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے سنجیدگی سے) میں چاہتا تھا کہ ـــــ

ماموں !۔ (اندر آکر ہنستے ہوئے ، کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر) بتاؤ میں تم لوگوں کے لئے کیا لینے گیا تھا ـــــ ؟

شاہدہ !۔ (عزیز کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بچوں کی طرح) ماموں آپ میرے لئے ٹافی لائے ہونگے ۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو آپ ٹافی لایا کرتے تھے ۔

ماموں !۔ (بزرگ بنتے ہوئے) اچھا بھئی ندیدی لڑکی یہ لے اپنی ٹافی ـــــ (جیب سے چھوٹا ڈبہ نکال کر دیتے ہیں ۔ اور پھر جادوگروں کے انداز سے پوچھتے ہیں) اچھا اب بتاؤ اصل میں کیا لایا ہوں ! تھوڑا اتہ پتہ بتائے دیتا ہوں ، خوب چکنے ، بڑے رنگین ، ہاتھ میں آکر پھسلتے ہیں ـــــ ایک منٹ کے اندر بتاؤ ۔ ورنہ ہار جاؤ گے ۔

شاہدہ !۔ (خوش ہو کر عزیز کی طرف شرما شرما کر دیکھتے ہوئے) آں ۔ آں ' اچھا یہ بتائیے ہے کس کام کے لئے ۔ یعنی استعمال کیا ہے ؟ یہ معلوم ہو تو فوراً بوجھ لیں گے ۔

ماموں !۔ (بہت دلچسپی لیتے ہوئے) لو اتنا حوالہ دیتا ہوں ! بھئی کھیلنے کی چیز ہے ۔

عزیز!۔ (جل کر) بیٹے !

شاہدہ!۔ آئیں بیٹے کیا۔

عزیز!۔ شیشے کی گولیاں !

ماموں!۔ ہار گئے تم لوگ ! (جیب سے تاش کا پیکٹ نکال کر تپائی پر پھینکتے ہیں اور عزیز جمائی لیتا ہے)

ماموں!۔ (ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے عزیز کے پاس ٹھنس کر) بھئی برسوں ہو گئے تاش کھیلے ہوئے۔ بچپن میں کھیلتا تھا مگر آج سوچا تم لوگوں کے ساتھ مل کر کھیلوں، تم خوش ہو گے تو میں بھی ہوں گا۔

عزیز!۔ (سر پکڑ کر) مگر ماموں صاحب میں تاش کھیلنا بھول گیا ہوں۔ اور پھر مجھے دلچسپی بھی نہیں۔

شاہدہ!۔ (چونک کر اترے منہ سے عزیز کی طرف دیکھتے ہوئے) ماموں، انھیں آرام کرنے دیجئے، یہ تھک گئے ہیں کل کھیلیں گے سب۔ یا آئیے ہم آپ کھیلیں۔

ماموں!۔ واہ ری لڑکی! یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم اکیلے کھیلو گی؟ آج کل کے جوڑوں میں اتنی بھی مروت نہیں۔ ایک وہ لوگ تھے کہ جان دیدیتے تھے۔

(شاہدہ شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہے)

عزیز!۔ مگر ماموں، ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے ——— کھیلئے آپ دونوں۔ میں ذرا آرام کرونگا۔

ماموں!۔ واہ کبھی نہیں۔ تم بھی کھیلو۔ اٹھو کھانا لگے جب تک بازی جمے گی ——— چلو رمی ہو جائے۔

عزیز!۔ (بیزاری سے) مجھے رمی نہیں آتی۔

ماموں!۔ ایک منٹ میں آجائے گی۔ تاش پھینٹ کر بانٹنے لگتے ہیں۔ (عزیز مڑ کر آتشدان کو گھورتا ہے۔ اور پھر سستی سے پتے اٹھا لیتا ہے۔)

ماموں!۔ (پتے دیکھتے ہوئے) جب تک تم لوگ ہو، نہ تو میں دوکان پر جاؤں گا نہ کہیں۔ دن بھر مزے سے تاش کھیلا کریں گے ——— اس طرح تم لوگوں کا پردیس میں جی نہیں گھبرائے گا ——— میرا جی بھی خوش رہے گا ——— گھر کتنا اچھا لگنے لگا ہے تم لوگوں کے آنے سے ———

(پردہ)

چھٹا منظر

(وہی ڈرائینگ روم۔ روشنیاں بدستور جل رہی ہیں۔ خوابگاہ کا پردہ کھسکا ہوا ہے ——— اسی کمرے سے عزیز رومال سے ہاتھ منہ پونچھتا ہوا اندر آتا ہے۔ اس کے پیچھے شاہدہ تولیہ سے

ہاتھ پونچھتی آرہی ہے ـــــ عزیز سستی اور پیٹ بھرے پن سے صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے۔
کھانے کے کمرے سے برتن اُٹھانے کی آواز آرہی ہے۔)

شاہدہ !۔ (بجھی ہوئی آواز میں) چھوٹا سا گھر ہے۔ کوئی فالتو کمرہ نہیں ۔ میرا خیال ہے ہم یہیں قالین پر بستر کرلیں۔ کیوں کیا خیال ہے۔

عزیز !۔ (دانت کریدتے ہوئے سرد مہری سے) ہاں ٹھیک ہے۔

شاہدہ !۔ ماموں تو اصرار کر رہے ہیں کہ سب کے سب انھیں کے بیڈ روم میں سو رہیں ـــــ (ہنس کر) کتنے بھولے ہیں بیچارے ماموں۔ بالکل فرشتہ ۔ انھیں پتہ ہی نہیں کہ سر تاج من سلامت کا منہ پھولا ہوا ہے۔ (شوخی سے عزیز کے بال پکڑکر چھوڑ دیتی ہے۔)

عزیز !۔ (مسکراکر بگڑنے کی کوشش کرتے ہوئے۔) ہاں منہ پھولا ہوا ہے ـــــ کب سے دورہ کر رہی ہیں ـــــ میں تو سچ مچ ناراض ہوں، ـــــ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ یہاں پہنچ کر اور دور ہو جائیں گی تو سیدھا ہوٹل جاتا ـــــ

شاہدہ ! (بن کر) بڑے خود غرض ہیں آپ ،جی چاہتا کہ بس ـــــ (مٹھیاں بند کر کے کھول دیتی ہے)۔

عزیز !۔ کیا چاہتا ہے جی ، ذرا ہمیں بھی تو معلوم ہو ؟ (شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر محبت بھری نظروں سے دیکھتا

شاہدہ :(ہاتھ چھڑاکر) بھئی اللہ بڑے وہ ہیں آپ ـــ جائیے ہم سے نہ بولئے۔

عزیز !۔ بولیں گی کیسے نہیں ، ابھی سارے دروازے بند کر کے گلا دباؤں گا ، تو پھر جلدی سے ماموں کو مدد کے لئے پکارنا ـــــ (پیار سے اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر) یوں !

شاہدہ !۔ یہ پھر آپ نے قصائی پن سے مجھے دھمکایا ۔ پھر کہوں کہ فوجی بڑے ـــــ

عزیز !۔ (الگ ہوکر) اچھا تو آئیے ۔میل کرلیں ـــــ (ہاتھ پکڑ کر دباتا ہے) چلئے اب جلدی سے بستر یہاں لے آئیں ۔ دو دن سفر میں کٹے ۔ اور آج کا دن بھی بور ہوتے گزرا ۔ دراصل مجھے آپ سے بہت سی اہم باتیں کرنا ہیں ـــــ (ایک دم سنجیدہ ہوکر) اب ہم نئی زندگی شروع کر رہے ہیں ، ابھی تک تو میری امی نے آپ کو دلھن بیگم بنائے رکھا۔ اور اب میں اتنی جلدی سے آپ کو ساتھ لا کر گھروالی بنائے دے رہا ہوں ـــــ دن میں تو بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا ـــــ بے چارے آپ کے ماموں جان دکان نہیں جائیں گے نا ـــــ

(ٹھنڈی سانس لے کر) پھر جب میں ڈیوٹی سے واپس آؤں گا تو بے چارے آپ کے ماموں ہمارے ساتھ تاش کھیلیں گے ـــــ ہم باہر جائیں گے تو وہ بیچارے ہمارے بُرا ماننے کے خیال سے ہوسکے

ہے ہمارے ساتھ جائیں ——— بس اب تو جب تک ہمیں کوارٹر نہیں ملتا یوں ہی چلے گا۔ دعا کرو دو چار دن میں مل جائے۔

شاہدہ !۔ (آزردہ ہو کر) آپ تو یوں ٹھنڈی سانسیں لے رہے ہیں ! جیسے پھنس گئے ہوں۔ بے چارے ماموں محض ہماری خاطر تو اتنی قربانی کر رہے ہیں ——— اب انھیں کیا معلوم کہ آپ ——— خیر میں تو کہتی ہوں جب تک کوارٹر نہیں ملتا ہوٹل میں رہ لیں ! مگر بے چارے ماموں کا دل ٹوٹے گا۔ اب یہاں رکے ہیں تو چند دن بسر کر لیجئے ، ورنہ سارے خاندان میں ہماری بدتمیزی اور بدمزاجی کے چرچے ہوں گے ——— (منہ پھیر کر) مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میرے رشتہ داروں کو پسند نہیں کرتے تو ———

عزیز !۔ (پریشان ہو کر) چہ بھئی شدو رانی ! آپ خدا جانے بات کہاں کی کہاں لے جاتی ہیں ——— میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ کہ مجھے یہاں کسی اور قسم کی تکلیف ہے ——— (خوشامد سے) میں کیا کروں شدو ! اتنی پیاری لگتی ہیں آپ کہ بس جی چاہتا ہے رات دن صورت دیکھا کروں میں ہوں اور میری شدو ! تیسرا کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

شاہدہ !۔ (ناز سے نظریں ترچھی کر کے) اوں جھوٹ ——— (اُٹھ کر) آیئے بستر لے آئیں مجھے بھی بہت سی باتیں کرنا ہیں۔

عزیز !۔ آپ بستر گھسیٹ لائیے۔ اتنے میں میں یہ صوفے کرسیاں کنارے لگاؤں۔

(شاہدہ بیڈ روم کے دروازے میں چلی جاتی ہے اور عزیز گرمجوشی سے گنگنا گنگنا کر صوفے کرسیاں اور میز دیواروں سے لگاتا ہے ——— چند لمحوں بعد شاہدہ بستر بند گھسیٹتی اس دروازے میں نظر آتی ہے ، اس کے ساتھ ماموں ہیں جو بستر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں ——— عزیز چونک کر یہ منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔)

ماموں !۔ دیکھتے ہو میاں عزیز ! یہ ٹانگ برابر کی چھوکری مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے۔

عزیز !۔ شاہدہ کیا بات ہے ؟

شاہدہ !۔ ماموں کہتے ہیں تم لوگ زمین پر کیسے سو سکتے ہو ؟

ماموں !۔ اور کیا۔ میں یہ بات کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ تم لوگ میرے گھر آ کر زمین پر سوؤ ؟

عزیز !۔ مگر ماموں صاحب ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی ———

ماموں !۔ یعنی بھئی کمال کرتے ہو ، تم لوگ زمین پر سوؤ گے اور میں پلنگ پر ؟ میں نے شرفو سے کہا ہے کہ وہ پڑوس والوں سے دو پلنگ مانگ لائے ——— تم لوگ پلنگوں پر سوؤ گے۔

شاہدہ۔ نہیں ماموں آپ خواہ مخواہ تکلیف کر رہے ہیں، اس ننھے سے کمرے میں اتنا سامان پہلے ہی ہے، اس میں دو پلنگ کیسے آئیں گے؟

ماموں۔ ارے بھئی تو میں کب کہتا ہوں کہ پلنگ اس کمرے میں ضرور بچھاؤ۔ وہیں میرے کمرے میں آجائیں گے دونوں پلنگ۔

(ماموں فیصلہ کن انداز سے ہولڈ آل گھسیٹ کر دروازے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ شاہدہ اور عزیز ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاہدہ عزیز کے قریب آکر بے بسی سے کھڑی ہو جاتی ہے۔)

عزیز:۔ شاہدہ ——— (سوکھی سوکھی نظروں سے اُسے دیکھتا ہے۔)

شاہدہ:۔ (عزم سے) نہیں ہم یہیں سوئیں گے۔ قالین پر۔ شاہدہ تیزی سے خوابگاہ والے دروازے میں چلی جاتی ہے۔ عزیز حیران کھڑا ہے۔ خوابگاہ میں ماموں اور شاہدہ کی تیز تیز آوازیں سُنی جا سکتی ہیں۔ اور اس کے بعد شاہدہ بستر بند گھسیٹتی ہوئی اور ہنستی ہوئی ڈرائینگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ بستر عزیز کے سامنے بڑے فتحمندانہ انداز سے ڈال کر ہاتھ جھاڑتی ہے۔)

شاہدہ۔ (اونچی آواز سے) میں کہتی ہوں ماموں خواہ مخواہ ہم سے غیروں جیسا تکلف کرتے ہیں۔ بھلا قالین پر گدا بچھا کر سونے میں کونسی تکلیف ہوگی؟ بھلا ہم ماموں کے کمرے میں سو کر انہیں کیوں ڈسٹرب کریں۔

عزیز:۔ (اونچی آواز میں) اور کیا بلکہ پلنگ سے زیادہ زمین پر مجھے تو آرام ملتا ہے۔ میں تو اپنے گھر میں بھی کبھی کبھی خوشی سے زمین پر سوتا ہوں ——— پھر ماموں کی برسوں کی تنہائی کی عادت، ہماری وجہ سے وہ اپنا طرز زندگی کیوں بدلیں ——— کیوں شاہدہ؟

(پیار سے شاہدہ کے گال پر چپت لگا کر بستر کھولتا ہے)

شاہدہ:۔ بالکل ٹھیک ہے۔ جب سے ہم آئے ہیں ماموں ہمارے لئے کتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

(شاہدہ گدے اٹھا کر جھاڑتی ہے، اور پھر دونوں مل کر گدے تلے اوپر بچھاتے ہیں ——— عزیز کمرے کے کمرے میں کھلنے والا دروازہ بند کرتا ہے اور شاہدہ گرم چادر اتار کر صوفے پر پھینکتی ہے۔ عزیز دھم سے بستر پر لمبا لیٹ جاتا ہے، شاہدہ خوابگاہ والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور دروازہ بند کرنے لگتی ہے کہ اچانک ماموں کندھے پر اپنا بستر اٹھائے اندر گھس آتے ہیں۔)

شاہدہ:۔ (تقریباً چیخ کر) ارے ——— ماموں؟

(عزیز بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے)

ماموں !- (بستر عزیز کے بستر کے قریب ڈال کر) بھئی تم لوگ زمین پر سوؤ گے تو میں پلنگ پر نہیں سو سکتا
میں بھی زمین پر سوؤں گا۔ ملا ہے میرے گھر میں برسوں بعد کوئی آئے اور زمین پر لیٹے ؟ ــــــ
(ماموں بڑے دکھی انداز میں اپنا بستر عزیز کے قریب بچھانے لگتے ہیں۔ عزیز اچک کر
الگ کھڑا ہو جاتا ہے۔ شاہدہ چپ چاپ دروازے کے قریب کھڑی ہے)

ماموں !- ارے بھئی عزیز میاں تم کھڑے کیوں ہو گئے۔ لیٹو، میں بھی کوئی بوڑھا ڈاڑھی والا ماموں ہوں،
میں تو اپنے چھوٹوں سے برابری کا سلوک پسند کرتا ہوں۔ میرا لحاظ نہ کرو، بے تکلفی سے لیٹو میاں ــــ
اور شاہدہ تم کھڑی کیوں ہو، تمہارا بستر کہاں ہے۔
(شاہدہ اور عزیز شرمندہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ــــ شاہدہ مردہ چال سے
آ کر گھٹنوں کے بل جھک کر اپنا گدا الگ کر لیتی ہے ــــ چند لمحے کے سکوت کے
بعد تینوں بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ ترتیب یوں ہے، بیچ میں عزیز، عزیز کے بائیں
طرف شاہدہ اور دائیں طرف ماموں ــــ)

ماموں !- گھر کتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے آج۔ جب تک تم لوگ ہو روزانہ سب مل کر اسی طرح زمین پر لیٹا کریں گے
واقعی زمین پر پلنگ سے زیادہ آرام ملتا ہے۔
(پردہ تیزی سے گرتا ہے)

ساتواں منظر

(پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پر اندھیرے ہے بارہ کا گجر ہوتا ہے ــــ اچانک تیز روشنی کی
ایک کرن نمودار ہوتی ہے اور تینوں کرداروں کے چہرے روشن ہو جاتے ہیں۔ صرف عزیز لیٹا ہوا
جاگ رہا ہے، اور سر کھجا رہا ہے ــــ ایک لمحے بعد روشنی مینٹل پیس پر رکھی ہوئی بڑی سی
تصویر پر مرکوز ہو کر غائب ہو جاتی ہے ــــ چند لمحوں کے لئے اندھیرا ہو جاتا ہے اور پھر)

عزیز !- (چیخ کر) بھوت ! بھوت ــــ !
اور اسی کے بعد ماموں اور شاہدہ کی ملی جلی چیخیں۔ اچانک روشنی ہوتی ہے۔ تو ماموں
سوئچ کے پاس کھڑے کانپتے نظر آتے ہیں۔ شاہدہ خوف سے اپنے گالوں پر ہاتھ رکھے
کھڑی ہے، عزیز بستر پر بیٹھا جھوم رہا ہے۔)

عزیز !- (دھیمی آواز میں بھوت ــــ بھوت، شدید بھوت ہے یہاں۔

(شاہدہ ڈر کر ادھر ادھر دیکھتی ہے -)

ماموں !۔ (قریب آکر ڈرتے ہوئے) کہاں تھا بھوت ؟

شاہدہ !۔ کیسا بھوت تھا ؟

عزیز !۔ (بدستور) بھوت - بھوت - شدّد

شاہدہ !۔ (گھبرا کر تقریباً روتے ہوئے) ہائے اللہ عزیز صاحب کیا ہوگیا آپ کو۔

عزیز !۔ (ڈری ہوئی آواز میں) بہت بڑا بھوت ، نوری خالہ کی تصویر کا بھوت۔ ہمارے سرہانے کھڑا تھا ـــــ کہتا تھا ، تم دونوں کو کھاؤں گا ـــــ خیاؤں خیاؤں بولتا تھا ـــــ ایک دم سفید شدد ، بھوت ہے یہاں ، بھاگو یہاں سے -

(ماموں گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں ، اور پھر خوفزدہ ہو کر جلدی سے دونوں کے قریب آجاتے ہیں)

ماموں !۔ کیا کہہ رہے ہو ، نوری کی پاک روح کا بھوت ؟

عزیز !۔ شددا ایک دم سفید بھوت ، خیاؤں خیاؤں کرتا تھا - اس نے کہا تم دونوں کو بھی پاک کریں گے ـــــ یہاں بھوت ہے -

(دفعتاً عزیز اچک کر تکیہ اور کمبل اٹھا کر خوابگاہ کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے ، اس کے پیچھے شاہدہ ہے - دونوں خوابگاہ کے دروازے میں گھس کر دروازہ بند کرتے ہیں کہ اسی لمحے ماموں بھوت بھوت چلاتے اسی دروازے کو اپنے جسم کی پوری طاقت سے دھکا دیکر کھولتے ہیں اور اندر غائب ہو جاتے ہیں - اس کے فوراً بعد اسٹیج پر ایک دم اندھیرا ہو جاتا ہے - اور پردہ گر جاتا ہے -)

جواب طلب امور کیلئے دو آنے کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں

پرکاش پنڈت

داغ بیل

کردار

۱ ۔ بنک کا مینجر
۲ ۔ درگا داس .... چپراسی
۳ ۔ چوکیدار
۴ ۔ اکاؤنٹنٹ
۵ ۔ ترلوکی ناتھ (بی۔ اے) ..... امیدوار
۶ ۔ مولانا .... "
۷ ۔ رام دھین تیواری .... "
۸ ۔ ایک عورت .... "
۹ ۔ سیٹھ چدو رام .... ایک لکھ پتی سیٹھ

O O O

(بینک گراؤنڈ میں لوگوں کے باتیں کرنے کا شور کبھی تیز ہو جاتا ہے کبھی مدھم پڑ جاتا ہے)

(ٹیبل بیل بجنے کی آواز)

(وقفہ)

(زور سے ٹیبل بیل بجنے کی آواز)

مینجر :۔ (چلا کر) درگا داس ! ابے او درگا داس !!

(ٹیبل بیل)

درگا داس :۔ جی صاحب !

مینجر :۔ جی صاحب کے بچے ! کہاں جا کر مر رہتے ہو۔ یہ باہر کون لوگ شور مچا رہے ہیں۔ بینک ہے

یا مچھلی مارکیٹ !

درگاداس : جی وہ !

مینجر : جی وہ کیا ! کیا اپنے لوگوں میں سے کوئی ہے ؟

درگاداس :- جی اپنے لوگوں میں سے سبھی ہیں !

مینجر : سبھی ہیں ! یعنی سب کے سب کام وام چھوڑ کر شور مچا رہے ہیں !

درگا داس : جی نہیں صاحب ! شور نہیں مچا رہے .

مینجر : شور نہیں مچا رہے تو اور کیا گل کھلا رہے ہیں ؟

درگا : شور مچانے والوں کو خاموش کر رہے ہیں صاحب !

مینجر : کیا کہا - خاموش کر رہے ہیں ! تم سے پچاس مرتبہ کہہ چکا ہوں درگاداس کہ یوں بے سر پیر کی مت ہانکا کرو - صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کون لوگ ہیں جو بینک کو کبڈی کا اکھاڑہ سمجھ کر بلا تکلف شور مچا رہے ہیں اور جنہیں خاموش کرانے کے لئے پورے کا پورا بینک کام دھام چھوڑ کر خود بھی مچلنے لگا ہے . (رازدارانہ لہجے میں) درگاداس !

درگا : جی صاحب !

مینجر : یہ لوگ بینک میں روپیہ جمع کرانے تو نہیں آئے ؟

درگا : جی نہیں صاحب !

مینجر : تو کیا بینک سے روپیہ نکلوانے آئے ہیں ؟

درگا : جی نہیں صاحب !

مینجر : جی نہیں صاحب ! جی نہیں صاحب ! تو پھر کاہے کے لئے آئے ہیں ؟

درگا : انٹرویو کے لئے آئے ہیں صاحب !

مینجر : انٹرویو کے لئے ! کون سے انٹرویو کے لئے ؟

درگا : صاحب کل جو آپ نے اخبار میں . . . .

مینجر : اوہ ! اچھا تو یہ لوگ انٹرویو کے لئے آئے ہیں -

درگا : جی صاحب !

مینجر : درگاداس !

درگا : جی صاحب !

منیجر : باہر جاکر ان لوگوں سے کہدو، مجھے ان کے کام کی ضرورت نہیں۔ میں کسی سے انٹرویو نہیں کروں گا۔
درگا : (تعجب سے) جی صاحب ؟
منیجر : جی ہاں صاحب! مجھے ان کے کام کی ضرورت نہیں۔ جو کام بینک کے موجودہ ملازمین بخوبی سر انجام دے سکتے ہیں اور بڑی دیانتداری کے ساتھ اس وقت بھی سر انجام دے رہے ہیں اس کے لئے مجھے کسی نئے اور ناتجربہ کار ملازم کی ضرورت نہیں۔
درگا : جی میں سمجھا نہیں صاحب !
منیجر : تمہارے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں میں خود ہی اس کا انتظام کرتا ہوں۔ تم اکاؤنٹنٹ صاحب کو بھیجو۔
درگا : جی صاحب !

(ایک دم بیک گراؤنڈ کا شور ابھر کر مدھم پڑ جاتا ہے)

اکاؤنٹنٹ : آپ نے مجھے یاد فرمایا۔
منیجر : (طنز سے) جی ہاں بندہ پرور۔ میں نے ہی آپ کو زحمت دی ہے۔ تشریف رکھیئے۔
اکاؤنٹنٹ : جی !
منیجر : کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں اکاؤنٹنٹ صاحب کہ باہر کس تقریب میں شور ہو رہا ہے۔
اکاؤنٹنٹ : جی وہ لوگ انٹرویو کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔
منیجر : انٹرویو کا وقت کیا دیا تھا ؟
اکاؤنٹنٹ : جی بارہ بجے دوپہر۔
منیجر : اور اس وقت کیا بجا ہے ؟
اکاؤنٹنٹ : جی یہ ساڑھے دس . . . .
منیجر : ساڑھے دس! اور میں متواتر نصف گھنٹے سے یہ شور سن رہا ہوں۔ اکاؤنٹنٹ صاحب !
اکاؤنٹنٹ : جی !
منیجر : کیا آپ نے ایڈورٹیز منٹ میں اپنی طرف سے اس شرط کا اضافہ تو نہیں فرما دیا تھا کہ انٹرویو دینے سے پہلے دو گھنٹے تک امیدوار بینک کے تمام ملازمین کا انٹرویو لیں گے۔
اکاؤنٹنٹ : جی نہیں تو . . . .
منیجر : تو پھر یہ شور کیوں ہو رہا ہے ؟
اکاؤنٹنٹ : جی میں ابھی بند کرواتا ہوں۔

حجس

مینجر : نہیں بند کروانے کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے بند کروانے کی ضرورت نہیں آخ
گھنٹے سے آپ بند ہی تو کروا رہے ہیں ــــــ چوکیدار کہاں ہے ؟

اکاؤنٹنٹ : جی باہر ہے۔

مینجر : باہر سے آپ کی مراد بینک سے باہر ہے یا شہر سے باہر۔

اکاؤنٹنٹ : جی گیٹ سے باہر !

مینجر : گیٹ سے باہر وہ کیا کر رہا ہے ؟ کیا شور مچانے والوں کی حفاظت کر رہا ہے۔

اکاؤنٹنٹ : جی وہ . . . .

مینجر : اکاؤنٹنٹ صاحب !

اکاؤنٹنٹ : جی !

مینجر : مجھے نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اس کم سے آپ اپنے آپ کو ملازمت سے برخ
سمجھئے۔

اکاؤنٹنٹ : (تعجب سے) جی ؟

مینجر : جی ہاں ! مجھے ایسے اکاؤنٹنٹ کی ضرورت نہیں جو اپنے حساب کتاب کی اعلیٰ قابلیت کے ذریا
خاصے چلتے ہوئے بینک کا دیوالیہ پیٹ کر رکھ دے۔

اکاؤنٹنٹ : دیوالہ ؟

مینجر : ہاں ہاں دیوالہ !

اکاؤنٹنٹ : لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے صاحب جو لوگ بینک میں اپنا روپیہ جمع کراتے نہیں آتے۔

مینجر : اور جو آتے ہیں وہ آپ کی منحوس صورت دیکھ کر الٹے قدم واپس لوٹ جاتے ہیں ! اکاؤنٹنٹ صاح

اکاؤنٹنٹ : جی !

مینجر : مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا، اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ آپ ہی کی جگہ کے لئے میں نے
لوگوں کو انٹرویو کے لئے بلایا ہے۔

اکاؤنٹنٹ : اوہ ! میں تو سمجھتا تھا کہ . . . .

مینجر : آپ جو کچھ بھی سمجھتے ہیں یا آئندہ سمجھیں گے۔ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میں جو مناسب سمجھتا
وہ میں نے آپ سے کہہ دیا۔ اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔

اکاؤنٹنٹ : بہت بہتر !

(شور ابھر کر مدھم ہوجاتا ہے)

(ٹیبل بیل)

: (زور سے) درگا داس ، ابے او درگا داس !!

: جی صاحب !

: ذرا چوکیدار کو میرے پاس بھیجو ۔

: جی صاحب !

(فوجی انداز سے بوٹ ٹکرانے کی آواز)

: حجور !

: چوکیدار !

: جی حجور !

: تمہاری پیٹی کہاں ہے ؟

: گھر پہ حجور !

: گھر پر کیا انڈے دے رہی ہے ۔ بندوق یہاں تمہارے ہاتھ میں ہے اور کارتوسوں کی پیٹی گھر پر ڈال رکھی ہے تم نے ! چوکیدار !

: حجور !

: اگر کوئی واردات ہو جائے تو کون اس کا ذمہ دار ہوگا ؟

: کیسی واردات حجور ؟

: (منہ چڑا کر) کیسی واردات ! بینک کے چوکیدار ہو اور اتنا تک نہیں جانتے کہ بینک میں کیسی واردات ہو سکتی ہے ۔

: جانتا ہوں حجور !

: کیا جانتے ہو ، خاک نہیں جانتے ۔

: جانتا ہوں حجور ۔ چوری ہو سکتی ہے حجور ! جعل سازی ہو سکتی ہے حجور ! ڈاکہ پڑ سکتا ہے حجور ! مس مریجم سے خجانچی جی کو اندھا کر کے خجانہ لوٹا جا سکتا ہے حجور ۔

: اور حجور کو ہر مہینے اسی لئے ساٹھ روپے دیئے جاتے ہیں کہ گیٹ سے باہر تمباکو چاٹ چاٹ کر خزانچی جی پر مس مریزم کا عمل ملاحظہ فرمائیں ۔

تجر

چوکیدار : جی نہیں حجور !
منیجر : کیا نہیں حجور !
چوکیدار : ساٹھ روپیہ نہیں ملتا حجور !
منیجر : تو اور کتنا ملتا ہے ؟
چوکیدار : ایک پیسہ نہیں ملتا حجور !
منیجر : پیسہ نہیں ملتا ! کب سے پیسہ نہیں ملتا ۔
چوکیدار : تین مہینے سے حجور !
منیجر : بس تین مہینے سے ! صرف تین مہینے سے پیسہ نہیں ملا تو تم نے کارتوسوں کی پیٹی گھر پر لوہے کے بکس میں بند کرنا شروع کر دی ـــــ اپنے سو ڈیڑھ سو روپے کی خاطر پورا بینک لٹوانا چاہتے ہو ـــــ چوکیدار !
چوکیدار : حجور !
منیجر : مجھے ایسے چوکیدار کی ضرورت نہیں جسے بینک پر حملہ ہونے کی صورت میں کارتوسوں کے لئے چاندنی چوک سے صفدر جنگ بھاگنا پڑے ۔
چوکیدار : صفدر جنگ میں کارتوس کہاں ہیں حجور !
منیجر : ابھی تم کہہ رہے تھے کہ کارتوسوں کی پیٹی گھر پر ہے ۔ کیا تمہارا گھر صفدر جنگ میں نہیں ؟
چوکیدار : گھر تو حجور صفدر جنگ میں ہی ہے ۔
منیجر : تو پھر کیا تنخواہ کے پیسے وصول کرنے کے لئے تم نے بینک کے کارتوس تک بیچ ڈالے ہیں ؟
چوکیدار : جی نہیں حجور کارتوس میرے پاس ہیں ہی نہیں ۔
منیجر : ہیں ہی نہیں ! کیا بکتے ہو ! کیا تمہیں کارتوس لے کر نہیں دیئے گئے ؟
چوکیدار : جی نہیں حجور !
منیجر : کیوں نہیں لے کر دیئے گئے ؟
چوکیدار : میں کیا جانوں حجور ۔ کھجانچی جی بولا حجور کہ کھجانے میں پھوٹا کوڑی تو ہے نہیں حجور کارتوسوں کی کیا جرورت ہے ۔
منیجر : خزانچی جی نے کہا ؟
چوکیدار : جی حجور !

جبر

ر : ہوں ! ٹھیک ہے ! چوکیدار !

یدار : جی حجور !

ر : میں سمجھتا تھا کہ صرف اکاؤنٹنٹ ہی کو بدلنا پڑیگا۔ آج معلوم ہوا کہ بینک کو فیل کرانے میں اکاؤنٹنٹ ہی کا نہیں خزانچی کا بھی ہاتھ ہے ـــــــ چوکیدار !

یدار : جی حجور !

ر : خزانچی جی نے تم سے کچھ اور بھی کہا تھا ؟

یدار : مجھ سے تو نہیں حجور ! درگا داس سے کل کہہ رہا تھا ، بڑا صاحب بنا پھرتا ہے ٹکہ پاس نہیں اور کھول بیٹھا ہے یہ بڑا بینک ۔

جر : ہوں ! اور درگا داس نے آگے سے کیا جواب دیا

یدار : درگا داس بولا حجور ۔ دو مہینے سے اس کی گھر والی بیمار ہے حجور ! اگر اس مہینے بھی اس کا تنخواہ نہ ملا تو وہ بینک کی لیجریں ردی میں بیچ دے گا حجور !

جر : (غصے سے) بینک کی لیجریں ردی میں بیچ دے گا ! گستاخ ! نمک حرام ! دو ٹکے کے آدمی کی یہ جرأت ۔ بابا کا مال سمجھ رکھا ہے جو بینک کی لیجریں ردی میں بیچ دے گا ـــــــ چوکیدار !

کیدار : جی حجور !

نجر : تم درگا داس پر کڑی نظر رکھو ۔

کیدار : جی حجور !

بنجر : اور اگر بینک کا ایک پن تک بینک سے باہر گیا تو درگا داس کا تو جو حشر میں کروں گا وہ کروں گا ہی تم اس سے پہلے جیل کی ہوا کھاؤ گے ۔

وکیدار : میں تو حجور کا گلام ہوں حجور ۔ تم ہم کو کارتوس منگا دو حجور پھر دیکھو حجور کس کا مجال ہے جو پاکٹ کی تلاشی دیئے بغیر بینک کے اندر اور بینک کے باہر قدم رکھ سکے ۔

بنجر : شاباش ، شاباش !! لیکن دیکھو ، ابھی بینک کے کسی آدمی کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیئے ورنہ . . . .

چوکیدار : تم بےفکر رہو حجور ! جات کا رجپوت ہوں حجور بنیا نہیں ہوں !

منجر : ٹھیک ہے تم اپنی جگہ چوکنے رہو باقی میں سب ٹھیک کر لوں گا !

چوکیدار : جی حجور !

(فوجی انداز سے بوٹ ٹکرانے کی آواز)

منیجر : اندر دیکھو،
چوکیدار : حجور!
منیجر : ذرا درگا داس کو بھیجدو۔
چوکیدار : جی حجور!

(فوجی انداز سے بوٹ ٹکرانے اور پھر چلنے کی آواز)
(شور ابھر کر مدھم ہوجاتا ہے)

درگا داس: جی صاحب!
منیجر : درگا داس!
درگا داس: جی صاحب!
منیجر : انٹرویو کے لئے جو لوگ آئے ہیں۔تم نے ان کے نام اور پتے لئے۔
درگا : جی لئے صاحب! یہ رہے صاحب! کل بارہ ہیں صاحب!
منیجر : ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سب کا انٹرویو ہوگا۔آج ہی، اسی وقت، تم باری باری سے سب کو اندر بھیجو۔
درگا : جی صاحب!
منیجر : سنو، سب سے پہلے ترلوکی ناتھ بی اے کو بھیجو۔
درگا : جی صاحب۔

(وقفہ)

ترلوکی : آداب عرض کرتا ہوں جناب۔
منیجر : آداب بیٹھئے!
ترلوکی : شکریہ!
منیجر : دیکھئے! ہمارے یہاں صرف اکاؤنٹنٹ ہی کی نہیں۔خزانچی، سٹینو، لیجرکیپر، گوڈاؤن کیپر، کلرک، چپراسی ہر طرح کی آسامیاں خالی ہیں۔آپ اپنے آپ کو کس آسامی کے زیادہ قابل سمجھتے ہیں؟
ترلوکی : یوں تو جناب چپراسی کے علاوہ خاکسار خود کو تمام آسامیوں کے قابل سمجھتا ہے اور بوقتِ ضرورت آپ کی جگہ بھی کام کر سکتا ہے۔لیکن سردست اگر اکونٹنٹ کی پوسٹ عنایت ہوجائے تو.........

تجربہ

ر : ضرور، ضرور . . . . . آپ کو بینکنگ کا تجربہ تو ضرور ہوگا ۔

ل : جی ہاں ! سات سال کا تجربہ ہے جناب !

ر : خوب ، بہت خوب ۔ اس سے پہلے آپ کس بینک میں تھے ۔

ل : پھگواڑہ انٹرنیشنل بینک میں تھا جناب !

ر : اسے آپ نے کیوں چھوڑ دیا ۔ کیا تنخواہ کم ملتی تھی ؟

ل : کم نہیں جناب ملتی ہی نہیں تھی ۔

ر : ہوں ، اس سے پہلے کس بینک میں تھے ؟

ل : اس سے پہلے بینک میں نہیں جناب میں جالندھر بلین ایکسچینج میں تھا ۔

ر : تو اسے کیوں چھوڑ دیا ۔ کیا وہاں سے بھی تنخواہ نہیں ملتی تھی ۔

ل : تنخواہ ہی نہیں وہاں تو بونس بھی ملتا تھا جناب لیکن کمپنی دیوالیہ ہوگئی ۔

ر : ہوں ! اس کے علاوہ آپ نے کہاں کہاں کام کیا ہے ؟

ل : یہ پوچھئے جناب کہ کہاں کہاں نہیں کیا ؟

ر : ہوں ! کافی تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں آپ !

ل : آپ کی دعا ہے ۔

ر : لیکن جہاں جہاں بھی آپ نے کام کیا ان بینکوں یا کمپنیوں کے دیوالے نکلنے کے علاوہ آپ کے وہاں سے چلے آنے کی کوئی اور وجہ بھی تھی ؟

ل : اور کیا وجہ ہو سکتی ہے جناب !

ر : خوب ! بہت ہی خوب ! ترلوکی ناتھ جی !

ل : جناب !

ر : آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ۔

ل : (تعجب سے) جی !

ر : جی ہاں ، آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ۔

ل : میں خزانچی کا کام بھی کر سکتا ہوں جناب !

ر : جی ہاں ، کیوں نہیں ، اس صورت میں آپ کو بینک کا دیوالہ نکالنے میں زیادہ آسانی ہو سکتی ہے ۔

ل : جی !

منیجر : آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ۔

ترلوکی : آداب عرض !

منیجر : آداب ۔

(ٹیبل بیل)

منیجر : درگا داس !

درگا : جی صاحب !

منیجر : دوسرے امیدوار کو بھیجو ۔

درگا : جی صاحب !

(وقفہ)

مولانا : (مریضانہ آواز) اسلام وعلیکم بیٹے. . . . . . ہوں . . . . . ہوں ۔

منیجر : آیئے ، آیئے ، تشریف رکھیئے . .

مولانا : میں نے اخبار میں پڑھا. . . . . ہوں . . . . . ہوں ۔

منیجر : جی ہاں ۔ ہمارے یہاں آسامیاں تو کوئی ایک خالی ہیں لیکن آپ . . . . شاید . . . . . آپ کی عمر

مولانا : میں بیٹے ! دیکھنے میں . . . . ہوں . . . . . ہوں . . . . بوڑھا ضرور نظر آتا ہوں ۔
لیکن کام میرا دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے ۔ ہوں . . . . . ہوں . . . . ہوں . . . . کتنے روپوں کی آسامی

منیجر : آسامی تو کچھ زیادہ روپوں کی نہیں ہے مولانا ۔ کل ملا کر ڈیڑھ دو سو کے قریب بیٹھیں گے ۔ لیکن آپ

مولانا : کچھ مضائقہ نہیں ۔ کچھ مضائقہ نہیں ، اکیلی جان ہے میری ۔ میرے لئے کافی ہیں ——— ہوں
. . . . . ہوں . . . . . . ہوں ۔ ناخلف اولاد کا رونا ہے بیٹے ورنہ میری عمر کیا اب کام کرنے کی تھی

منیجر : یہی تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں مولانا کہ آپ کی عمر . . . . . .

مولانا : یوں میری عمر کچھ زیادہ بھی نہیں ۔ صرف پانچ کم نوے برس کا ہوں ۔ یہ تو کم بخت فکر کے درد نے مار دیا
تم جانو بیٹے میری عمر کے لوگ آج بھی گھڑ سواری کرتے ہیں ۔ ہوں . . . . ہوں . . . . . . ۔

منیجر : لیکن آپ کے ہاتھ . . . .

مولانا : ہاں ہاتھوں میں ذرا رعشہ ضرور ہے . . . . تم جانو بیٹے اس عمر میں اولاد اگر دغا دے جائے
. . . . ہوں . . . . . . ہوں ۔

منیجر : اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ کی آنکھوں سے بھی کچھ کم ہی . . . .

مولانا : آنکھوں میں کوئی تکلیف نہیں ہے بیٹے ...... وہ تو چند سال قبل اک ذرا میری بتیسی ہل گئی تھی اور تم جانو بیٹے ...... ہوں ...... ہوں .... جب بتیسی ہل جائے تو اس کا اثر بینائی پر بھی پڑتا ہے .... ہوں ...... ہوں ......

منجر : اچھی بات ہے مولانا۔ آپ کو ڈاک کے ذریعہ اطلاع دے دی جائے گی۔

مولانا : ڈاک کے ذریعہ اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے بیٹے! ہوں ...... ہوں ..... جب تمہارے یہاں آسامی ہے اور مجھے کام کرنا ہی ہے تو پھر ان تکلفات سے کیا فائدہ۔ زمانہ فضول خرچی کا نہیں۔ ڈاک میں ناحق تین پیسے ضائع ہونگے .... ہوں ..... ہوں .... اور پھر سمجھدار لوگ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے ..... اپنے چپراسی سے کہہ لے جاکر مجھے کرسی پر بٹھا دے بیکار میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل!

(ٹیبل بیل)

منجر : درگاداس!

درگا : جی صاحب!

منجر : دیکھو! باہر دھوپ میں مولانا کے لیے ایک کرسی ڈال دو اور بڑے آرام سے انہیں لے جاکر وہاں بٹھا دو۔ بزرگ آدمی ہیں زیادہ چل پھر نہیں سکتے۔

درگا : جی صاحب!

منجر : اور دیکھو، لنچ ٹائم کے وقت انہیں ان کے گھر پہنچا آنا۔

مولانا : گھر پہنچا آنا! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا بیٹے۔

منجر : مطلب یہ ہے مولانا کہ یہ بینک ہے۔

مولانا : تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یتیم خانہ سمجھ کر یہاں آیا تھا۔

منجر : میں تو یہی سمجھتا ہوں مولانا۔

مولانا : تمہاری عقل کا پھیر ہے۔ تم کل کے لونڈے کھرے کھوٹے کی پہچان کیا جانو ــــــ بولو، سو روپے دوگے؟

منجر : جی نہیں مولانا۔

مولانا : اسّی پر فیصلہ کرتے ہو؟

منجر : عرض کیا نا مولانا کہ ....

مولانا : اچھا آخری بات! پچاس سے کم میں نہیں لونگا۔

منیجر : درگا داس!

درگا : جی صاحب!

منیجر : تم اپنا کام کرو ۔ مولانا کو بحفاظت..........

درگا : جی صاحب : چلئے مولانا.........

مولانا : اماں یہ کیا بدتمیزی ہے ـــــ میں پوچھتا ہوں یہ کہاں کا اخلاق ہے........

(آواز دور ہوتی جاتی ہے)

میری گردن میں کیوں ہاتھ دیتے ہو....... چھوڑ دو مجھے ورنہ میں ہاتھ چھوڑ بیٹھوں گا۔

منیجر : (اطمینان کا سانس لے کر) اُفوہ ! کن کن لوگوں سے پالا پڑتا ہے ۔

(ٹیبل بیل)

منیجر : درگا داس !

درگا : جی صاحب!

منیجر : رام دھین تیوارٹی کو بلاؤ ۔

درگا : جی صاحب!

(وقفہ)

رام دھین : نمسکار !

منیجر : نمسکار ۔ آیئے ، بیٹھیے :

رام دھین : دھنیا واد !

منیجر : رام دھین تیوارٹی جی آپ کا نام

رام دھین : (تعجب سے) جی ؟

منیجر : آپ کا نام ؟

رام دھین : ابھی ابھی آپ کی زبان پر تھا چاہئے ۔

منیجر : میں آپ سے آپ کا نام پوچھ رہا ہوں ۔

رام دھین : نویدن کیا نا کہ ابھی ابھی آپ کی زبان پر تھا ۔

منیجر : پھر وہی ۔ بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہیں آپ ۔ میں آپ سے آپ کا نام پوچھ رہا ہوں اور آپ

آگے سے مسخرہ پن کر رہے ہیں۔
رام دھین: مسخرہ پن تو آپ کر رہے ہیں مہاشے۔
(زور سے ٹیبل بیل)
منیجر : درگا داس۔ ابے او درگا داس!
درگا : جی صاحب!
منیجر : اس بدزبان کو تم نے کیوں میرے کمرے میں گھسنے دیا؟
رام دھین: یہ آپ اپنی پرشنسا کر رہے ہیں شاید؟
منیجر : دیکھا! دیکھا درگا داس دیکھا تم نے۔
درگا : جی ہاں دیکھا!
منیجر : کیا دیکھا؟ تم نے خاک نہیں دیکھا۔
درگا : جی صاحب!
منیجر : اس شخص کو دھکے دے کر میرے کمرے سے باہر نکال دو۔
رام دھین :۔ اس شخص کو ہی نہیں میں آپ کو بھی چیلنج کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہاتھ لگائیے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے؟
منیجر : کیا ہوتا ہے؟
رام دھین: وہی جو ہونا چاہیئے!
منیجر : کیا ہونا چاہیئے؟
رام دھین: جو ہوگا؟
منیجر : شٹ اپ!
رام دھین: یو شٹ اپ۔
منیجر : گیٹ آوٹ۔
رام دھین: یو گیٹ آوٹ۔
منیجر : آئی سے گیٹ آوٹ ——— درگا داس!
(دھینگا مشتی کی آواز)
منیجر : بدتمیز، بدزبان، بددماغ۔
(وقفہ)

منجر

(ٹیبل بیل)

منیجر : درگا داس!

درگا : جی صاحب!

منیجر : وہ احمق کا بچہ ابھی تک گیا ہے یا نہیں؟

درگا : جی گیا صاحب!

منیجر : ابھی اور کتنے امیدوار ہیں۔

درگا : ابھی تو تین بھگتے ہیں صاحب! اُنچاس ابھی باقی ہیں۔

منیجر : (ٹھنڈی سانس لے کر) اُنچاس ابھی باقی ہیں۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ میں آج پورا معاملہ ادھر یا ادھر کرکے رہوں گا۔ مجھے تم ایسے نمک حراموں کی قطعی ضرورت نہیں۔

درگا : کیا فرمایا صاحب؟

منیجر : ہاں ہاں مجھے تم ایسے نمک حراموں کی ضرورت نہیں۔ جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے شرم نہیں آتی!

درگا : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا صاحب!

منیجر : تم نے آج تک میری کسی بات کا مطلب سمجھا بھی ہے درگا داس! لیکن اب مجھے تم لوگوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے تم لوگوں کی مدد کی لیکن اب پانی سر سے گزر چکا

درگا : جی میں آپ کا مطلب ....

منیجر : مطلب بالکل صاف ہے درگا داس کہ اس بیکم سے مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ میں آج ہی تمہاری جگہ دوسرا آدمی رکھنے والا ہوں۔

درگا : لیکن میرا کوئی قصور صاحب!

منیجر : نہیں نہیں، حضور کیوں کوئی قصور فرمانے لگے۔ قصور تو سب میرا ہے جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے ہوں۔ لیکن ایک بات تمہیں بتا دوں گا درگا داس!

درگا : جی صاحب!

منیجر : تمہارے لئے ردی میں بینک کی لیجرس بیچنا اتنا آسان نہیں جتنا میرے لئے تمہیں کھڑے کھڑے پولیس کے حوالے کرنا۔

درگا : (خوف زدہ ہو کر) پولیس کے حوالے .... میں کچھ سمجھا نہیں صاحب۔

منیجر : جی ہاں وہ تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سمجھنے کی کوئی بات نہیں نہ آج تک تم سمجھی ہے نہ آئندہ سمجھو گے ــــــ کیا تم نے خزانچی جی سے یہ نہیں کہا کہ تم بینک کی لیجریں ردی میں بیچ دوگے۔

درگا : (خاموش)

منیجر : بولو ، بولتے کیوں نہیں ؟

درگا : نہیں صاحب ، میں نے تو نہیں کہا ۔

منیجر : تو کس نے کہا تھا ؟

درگا : (خاموش)

منیجر : میں پوچھتا ہوں کس نے کہا تھا کہ بینک کی لیجریں ردی میں . . . . . .

درگا : بابو رگھو نندن نے کہا تھا صاحب !

منیجر : بابو رگھو نندن نے ! سچ کہتے ہو کہ بابو رگھو نندن نے ہی بینک کی لیجریں ردی میں بیچنے کو کہا تھا۔

درگا : جی صاحب !

منیجر : ٹھیک ہے ــــــ بابو رگھو نندن کو بلاؤ ۔

درگا : جی صاحب !

منیجر : ٹھہرو !

درگا : جی صاحب !

منیجر : رگھو نندن کو بلانے کی ضرورت نہیں ۔ اب میرے پاس بینک کے کسی ملازم کو بلانے کی ضرورت نہیں ۔ میں خود براہ راست ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا ۔ اور باری باری سب کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا ، مجھے بخشیئے ۔ مجھ پر اور میری آنے والی نسلوں پر احسان فرمائیے اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آیئے ۔

درگا : میرے لئے کیا حکم ہے صاحب ؟

منیجر : تمہارے لئے ! میرا خیال ہے تمہیں یکم تک انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ــــــ تم آج ہی سے چھٹی کر سکتے ہو ؟

درگا : بہت اچھا صاحب ! کل سے نہیں آؤں گا ۔ میرا حساب کتاب کر دیجئے ۔

منیجر : حساب کتاب ! کون سا حساب کتاب ۔

درگا : تین مہینے کی تنخواہ کا حساب کتاب ۔

منیجر : اوہو ، تو یہ بات ہے۔ حضور کو تین مہینے کی تنخواہ چاہیئے اور حضور فرماتے تھے کہ حضور نے نہیں ، با
رگھونندن نے بینک کی لیجرس ردی میں بیچنے کو کہا تھا۔

درگا : جی نہیں میں نے ہی کہا تھا۔

منیجر : شاباش ! تم سے یہی امید تھی —— درگا داس ! تم سے بالکل یہی امید تھی —— خیر ، رگھونن
نے کیا کہا تھا۔

درگا : بابو رگھونندن نے جو بھی کہا ہو —— آپ میری تین مہینے کی تنخواہ ....

منیجر : پھر بھی کچھ تو پتہ چلے کہ آخر بابو رگھونندن اپنی تین مہینے کی تنخواہ وصول کرنے کے لئے کون سام
استعمال فرمانے والے ہیں —— کیا کہا تھا بابو رگھونندن نے ....

درگا : بابو رگھونندن نے کہا تھا —— بہت ہو چکا ، بہت گڑگڑا لئے —— اب اگر گھی ر
انگلیوں سے نہیں نکلے گا تو ....

منیجر : تو وہ ٹیڑھی انگلیوں سے نکالیں گے۔ بیچ چوراہے میں میری بے عزتی کریں گے اور اگر ضرور
پڑی اور ان کے خیال میں ضرورت پڑے گی تو وہ میرے کپڑے تک اتروا لیں گے ——
یہی کہا تھا نا !

درگا : جی صاحب !

منیجر : جی صاحب ! جی صاحب ! ! مذاق سمجھ رکھا ہے۔ بابا کا راج ہے نا —— نمک حرام ! پاجی
گستاخ !!!

درگا : گالی دینے کی ضرورت نہیں صاحب !

منیجر : وہ تو میں جانتا ہوں بزرگوار کہ گالی دینے کی نہیں آپ کو تنخواہ دینے کی ضرورت ہے اور حضور
تنخواہ ملے گی۔

درگا : کب ملے گی ؟

منیجر : جب ہوگی۔

درگا : کب ہوگی ؟

منیجر : جب بھی ہوگی تمہیں تمہاری تنخواہ مل جائیگی۔

(باہر کا شور ایک دم ابھرتا ہے)

عورت : نمستے منیجر صاحب۔

منیجر : نمستے ـــــ آئیے بیٹھئے ـــــ درگا داس تم ذرا باہر........
عورت : شکریہ۔
منیجر : فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟
عورت : آپ کے بینک میں ڈریسنگ روم ہے نا؟
منیجر : (تعجب سے) ڈریسنگ روم ! جی، جی ہاں ! وہ باہر دائیں ہاتھ ـــــ نکڑ میں ـــــ کیا چپراسی کو بلواؤں۔
عورت : نہیں، اس وقت تو ضرورت نہیں ـــــ اور زنانہ غسل خانہ؟
منیجر : زنانہ غسل خانہ ! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا محترمہ۔
عورت : مطلب بالکل صاف ہے منیجر صاحب کہ ڈریسنگ روم اور زنانہ غسل خانہ کے بغیر شاید میں آپ کے یہاں ملازمت نہ کر سکوں؟
منیجر : اوہ ! تو آپ ملازمت کے سلسلہ میں آئی ہیں۔
عورت : جی ہاں ! میرا ارادہ آئندہ چل کر سیاست میں حصہ لینے کا ہے۔ اس سے پہلے میں ہر چیز کا عملی تجربہ کرنا چاہتی ہوں ـــــ ہاں تو زنانہ غسل خانہ نہیں ہے آپ کے یہاں؟
منیجر : دیکھیے محترمہ ! اول تو مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ یہ بینک ہے کوئی تجربہ گاہ نہیں۔ دوسری بات جو میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ زنانہ تو زنانہ اس بینک میں مردانہ غسلخانہ بھی نہیں ہے۔
عورت : تعجب !
منیجر : اور آخری اور بنیادی بات یہ ہے محترمہ کہ ہمارے یہاں عورتوں کو ملازم رکھنے کا دستور نہیں۔
عورت : دستور نہیں ! اس بیسویں صدی میں جبکہ دنیا کے تمام دستور بدل چکے ہیں یا بدل رہے ہیں آپ کے یہاں عورتوں کو ملازم رکھنے کا دستور نہیں۔ آپ کو یہ دستور بدلنا ہوگا۔ عورت کو اس کے جائز حقوق دینے ہونگے۔ وہ زمانہ لد گیا جب عورتیں گھروں میں چولھے جھونکتی تھیں اور بچے جنتی تھیں اور..............
منیجر : تو اب کیا انہوں نے بچے جننے کا پروگرام ترک کر دیا ہے؟ دیکھیے محترمہ زیادہ بحث کی ضرورت نہیں مجھے ابھی درجنوں امیدواروں سے انٹرویو کرنا ہے۔
عورت : اور مجھے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں امیدوار نہیں ہوں۔ میں اس ملازمت کے قابل نہیں جس کا آپ

نے اشتہار دیا ہے۔ میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ سیاست میں قدم رکھتے ہی پہلا کام جو میں کروں گی
. . . .

منیجر : دیکھئے محترمہ! اُس وقت تو آپ جو کریں گی وہ آپ کریں گی ہی لیکن اس وقت مجھ پر اتنی مہربانی کیجئے
کہ . . . .

عورت : کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع نہ کروں۔

منیجر : جی!

عورت : اور میں نے جو اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ اس کا آپ کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوا؟

منیجر : آپ ملازمت کے ارادے سے آئی ہیں محترمہ یا دلوں پر اثر انداز ہونے کے لئے۔

عورت : دونوں کے لئے۔

منیجر : تو آپ کی خدمتِ اقدس میں عرض ہے کہ سر دست دونوں باتیں ناممکن ہیں۔

عورت : کیوں ناممکن ہیں۔ اس ایٹمی زمانے میں کون ایسی بات ہے جو ممکن نہیں آخر ایک عورت اور مرد
میں کیا فرق ہے کہ . . . .

منیجر : اگر آپ مزید لیکچر نہ دینے کا وعدہ فرمائیں تو میں عرض کروں . . . .

عورت : فرمائیے!

منیجر : ایک عورت اور مرد میں وہی فرق ہے محترمہ جو زنانہ غسل خانہ اور مردانہ غسل خانہ میں۔

عورت : نان سنس!

(تیز تیز چلنے کی آواز)

منیجر : اوہ! یہ انٹرویو ہو رہا ہے یا امریکن فری اسٹائیل کشتیاں۔ کیسے کیسے خر دماغوں سے واسطہ پڑا ہے

سیٹھ : جے رام جی کو منیجر شاب۔

منیجر : جے رام جی کی ——— فرمائیے آپ کس پینترے سے وار فرمانا پسند کریں گے۔

سیٹھ : اجی ہمار کو کا پھرمانا شوں۔ پھرمانا تو تو کو ہے۔ پھرماؤ کا شود دیتے ہو شیکڑے پر۔

منیجر : سود! کیسا سود! دیکھئے جناب میں پہلے سے بہت پریشان ہوں۔ زیادہ بک بک جھک جھک نہیں
کر سکتا۔ آپ کو جو فرمانا ہو صاف صاف اور دو منٹ کے اندر اندر فرما دیجئے ——— آپ کا نام؟

سیٹھ : ہمار نام شیٹھ جورو رام!

منیجر : اچھا تو جورو رام جی آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

سیٹھ : کاٹھیاواڑ شوں ۔

منیجر : کاٹھیاواڑ سے ـــــ اتنی دور سے آپ ایک معمولی سی......

سیٹھ : بزنش بزنش ہے منیجر ـــــ کاٹھیاواڑ شوں دلی توکا ہمار چین جاپان بھی جا شکوں ۔

منیجر : بزنس ! کیسا بزنس ! میں آپ سے پھر عرض کروں گا جناب کہ آپ پہیلیاں نہ بجھوائیے ۔ صاف صاف بتلائیے کیا چاہتے ہیں آپ ۔

سیٹھ : ہمار چار روپی شیکڑہ شود چاہیں ۔

منیجر : چار روپے سینکڑہ سود ! لیکن کس بات کا سود ـــــ اوہ ! کیا آپ بینک میں روپیہ جمع کرانے تشریف لائے ہیں ؟

سیٹھ : اور کا ہمار نکلوانے آئے شوں ۔ منیجر ، ہمار کوئی لمبو چوڑو بزنش نائیں جو ادھر بینک میں روپی ڈالو ادھر نکالو ! بش جو ڈگیو شو پڑگیو ۔ ہمار کو تو شود سے گرج ہو ـــــ بولو دلواؤ ہو چار روپی شیکڑہ ۔

منیجر : آپ کو کتنا روپیہ جمع کرانا ہے سیٹھ جی ؟

سیٹھ : اشل کا بات بعد ماں ہوگا ۔ شود کی بات کرو ۔

منیجر : لیکن سود کی بات تو اصل پر ہوتی ہے سیٹھ جی ۔ آپ اصل بتلائیے ۔

سیٹھ : ہمارے یاں اشل کی بات بعد ماں ہو ۔ بولو دلواؤ ہو چار روپے شیکڑہ :

منیجر : پورے چار رکھئے سیٹھ جی ! یوں دستور ہمارے یہاں ساڑھے تین فیصدی کا ہے ۔

سیٹھ : ایک بات بولوں ۔

منیجر : کہیئے !

سیٹھ : نہ تمہارے کنے گھاٹو نہ ہمارے کنے گھاٹو ۔ تین روپی چودہ آنہ شیکڑو ۔

منیجر : چلئے ٹھیک ہے ۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ کتنا روپیہ جمع کرا رہے ہیں آپ ؟

سیٹھ : آں ، یہ ہوئی نا بات .... ایہہ .... یہ لو ۔

منیجر : (ہونٹوں ہی ہونٹوں میں) ساٹھ ہزار کا ڈرافٹ !

سیٹھ : اور .... ایہہ ۔

منیجر : (ہونٹوں ہی ہونٹوں میں) نوّے ہزار کا ڈرافٹ :

(ٹیبل بیل)

درگا داس ! درگا داس جی !!

درگا : جی صاحب !

منیجر : سیٹھ جی کے لئے لیمن لاؤ !

سیٹھ : نائیں ہم لیمن نائیں چھوؤ ۔

منیجر : تو کوکا کولا سیٹھ جی ۔

سیٹھ : نائیں ہم کوکا کولا بھی نائیں چھوؤ ۔

منیجر : تو جو آپ کہیئے . . . .

سیٹھ : ایہہ . . . . یہ . . . .

منیجر : (ہونٹوں ہی ہونٹوں میں) پچاس ہزار کا ڈرافٹ ——— سیٹھ جی بتایئے نا کیا پئیں گے آپ ؟

سیٹھ : ایہہ . . . . یہ . . . . . .

منیجر : (ہونٹوں ہی ہونٹوں میں) تیس ہزار کا ڈرافٹ ——— درگا داس !

درگا : جی صاحب !

منیجر : اکاؤنٹنٹ صاحب کو بلاؤ ۔ جلدی سے اکاؤنٹنٹ صاحب کو بلاؤ ۔

درگا : جی صاحب !

سیٹھ : ایہہ . . . . یہ . . . .

منیجر : (ہونٹوں ہی ہونٹوں میں) ایک لاکھ بیس ہزار کا ڈرافٹ !

اکاؤنٹنٹ : جی فرمایئے !

منیجر : یہ ہمارے اکاؤنٹنٹ صاحب ہیں سیٹھ جی !

سیٹھ : جے رام جی کو !

اکاؤنٹنٹ : جے رام جی کی !

منیجر : پورا بینک انہی کے سہارے چل رہا ہے سیٹھ جی ۔ حساب کتاب میں تو جواب نہیں آپ کا ۔

سیٹھ : اچھو ۔ اچھو ۔

منیجر : اور سیٹھ جی یہ ایسا ویسا نہیں ۔ لندن سے اکاؤنٹ سیکھ کر آئے ہیں آپ ! اور آپ ہیں سیٹھ جو د
کاٹھیاواڑ کے کروڑپتی سیٹھ !

سیٹھ : کروڑپتی کا شرد منیجر ۔ ہمار تو ایک آدمی ستوں منیجر !

منیجر : جی سیٹھ صاحب !

گجر

سیٹھ : بینک کو کوئی اور شاخا بھی ہے ؟

منیجر : جی سیٹھ جی ۔ دنیا کے کونے کونے میں بینک کی شاخیں ہیں۔ ایک ڈربن میں نہیں تھی سیٹھ جی سو ہمارے اکاؤنٹنٹ صاحب پرسوں ہوائی جہاز کے ذریعہ اس کا افتتاح کرنے جا رہے ہیں ۔

سیٹھ : اچھو، اچھو !

منیجر : اور سیٹھ جی ۔ امپیریل بینک کے بعد یہ آپ ہی کا بینک ہے جس کے خزانچی روپے کو سونگھ کر گن سکتے ہیں۔ ایسی قدرت پائی ہے سیٹھ جی کہ کیا عرض کروں ۔

سیٹھ : اچھو، اچھو !

منیجر : اور تو اور ہمارے بینک کے چپراسیوں تک کو بینک کے ہر کام میں پوری پوری مہارت حاصل ہے۔

سیٹھ : اچھو، اچھو ! ـــــ کل کتا روپی ہوا منیجر ۔

منیجر : یہ لیجئے اکاؤنٹنٹ صاحب .... بتائیے سیٹھ جی کو ۔

اکاؤنٹنٹ : جی، یہ، ایک دو، یہ کل تین لاکھ پچاس ہزار !

سیٹھ : بش ! آج اتّو ہی ۔

منیجر : کوئی بات نہیں سیٹھ جی کوئی بات نہیں ۔

سیٹھ : ہمار شو دہر سال ہمار گھر پہنچ جاشوں ۔

منیجر : آپ فکر نہ کریں سیٹھ جی ۔ اب تو یہ آپ ہی کا بینک ہے۔ آپ کی بدولت ....

(باہر شورا بھر کر مدھم ہو جاتا ہے)

دیکھئے اکاؤنٹنٹ صاحب ! باہر جو ہجوم روپیہ جمع کرانے آیا ہے، اس قدر شور کیوں مچا رہا ہے ـــــ کیا انھیں کوئی دوسرا بینک نہیں ملتا ۔

اکاؤنٹنٹ : جی میں ابھی بند کراتا ہوں ۔

منیجر : اور سنئے .... سیٹھ جی کی پاس بک بنوا دیجئے ۔

اکاؤنٹنٹ : جی !

منیجر : اور سیٹھ جی کے ـــــ بتایا نہیں سیٹھ جی آپ نے کیا پئیں گے آپ ـــــ چائے پیجئے گا ؟

سیٹھ : نائیں ہمار چائے کو نائیں چھوؤ ۔

منیجر : تو پھر کیا منگوایا جائے آپ کے لئے ۔

سیٹھ : ہمار کو ایک چرٹ منگا دو بش !

کھجر

(ٹیلی بیل)

درگا داس ! درگا داس جی !

درگا : جی صاحب !

منیجر : دیکھو ! باہر سے ہمارا نام لے کر کیوبن سے سگریٹوں کا ایک ڈبہ لاؤ ۔

سیٹھ : نائیں نہار سگریٹ کو نائیں چھوؤ ۔

منیجر : تو سنو : ایک ڈبہ سگار لے آؤ ، تازہ مال ہو بالکل تازہ !

سیٹھ : نائیں : نائیں !! بیڑی لاؤ ، اشلی تمباکو کی بیڑی ۔

درگا : جی وہ تو میرے پاس بھی ہے ۔

سیٹھ : تو لاؤ ۔

درگا : لیجئے !

(دیا سلائی جلانے اور پھر کش لینے کی آواز)

سیٹھ : ہا —— ہا —— اچھو ، اچھو ، منیجر ! اچھو جے رام جی کو !

منیجر : جے رام جی کی سیٹھ جی ۔

(وقفہ)

منیجر : درگا داس ! درگا : جی صاحب !

منیجر : ایک بیڑی مجھے بھی پلاؤ ! درگا : جی ؟

منیجر : ہاں ہاں ایک بیڑی مجھے بھی پلاؤ ! درگا : جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا !

منیجر : اماں بیڑی پلاؤ ، مطلب بعد میں سمجھتے رہنا ۔ درگا : جی !

منیجر : اور سنو ! درگا : جی صاحب !

منیجر : باہر جتنے امیدوار انٹرویو کے لئے بیٹھے ، کھڑے ، ٹہلتے ہوئے ہیں ان سب سے جا کر کہہ دو انہیں پھر کسی وقت بلایا جائے گا ۔ صاحب کو اس وقت فرصت نہیں ۔

درگا : جی ؟

منیجر : جی ہاں درگا داس جی !

(فیڈ آوٹ)

OOO

قاضی عبد الغفار

قدیم علی گڑھ کی یاد

جب حال کی اس بدحالی سے تنگ آتا ہوں گھبراتا ہوں
ماضی کی سہانی یادوں میں ناچار رفتا ہو جاتا ہوں

وہ اور ہی عالم ہوتا تھا جب ساتھی سب یاں آتے تھے
اور محفل بھائی چارے کی اس طرح یہاں گرماتے تھے

کچھ بیتے دور کے افسانے سنتے تھے اور سناتے تھے
پیغام پرانی یادوں کا وہ لاتے اور لے جاتے تھے

وہ گیسو شاہد کالج کے کچھ اس طرح بل کھاتے تھے
کچھ اور تھے رنگ محبت کے کچھ اور ہی رشتے ناتے تھے

کچھ راگ بھی تھا کچھ رنگ بھی تھا اور ڈھولک تھی اور چنگ بھی تھا
وہ بوڑھے جوان بن جاتے تھے میخانہ میں جب آتے تھے

یاں گنگا جمنا ملتی تھی اور پریم کا رنگ نکھرتا تھا
کچھ گیت بھی گائے جاتے تھے اور پھاگ بھی کھیلے جاتے تھے

جو خون کہ ٹھنڈا ہوتا تھا وہ خون بھی کچھ گرماتا تھا
احساسِ کہولت مٹ جاتا اس دیس میں جب آجاتے تھے

گو مصرعہ کی دم گرتی ہو اور شعر کا سانچہ بھونڈا ہو
پر محفلِ جہل مرکب میں کچھ شعر بھی ہم فرماتے تھے

عجز

اب کون علی گڑھ آتا ہے جو جاتا ہے وہ جاتا ہے
سب بھول گئے ہم یاد نہیں کب آتے تھے کب جاتے تھے
بریانی اب بھی پکتی ہے اور ٹکڑے اب بھی کھاتے ہیں
ہیہات وہ لذتِ کام و دہن جس لذت سے ہم کھاتے تھے

وہ دورِ بہاراں بیت گیا روداد جوانی ختم ہوئی
اگلوں کو زمانہ کیا دیگا اپنی تو کہانی ختم ہوئی

سردار جعفری

تین قطعے

تہذیب

وہ مشرق ہو کہ مغرب ایک ہے تہذیب انسانی
کہ جس کے ہاتھ نے فطرت کی زلفوں کو سنوارا ہے
اسی شائستگی سے حسن انساں خود بھی نکھرا ہے
قدم میں پھول پیشانی پہ سورج کا ستارا ہے

سمتوں کا فریب

عقابِ آہنی[1] کا آج رخ پھر سوئے لندن ہے
صدا کا تار دامن فاصلوں کا سلتا جاتا ہے
پتہ چلتا نہیں کچھ حد کہاں قایم ہے سمتوں کی
جو مغرب تھا وہ ہر لمحے میں مشرق بنتا جاتا ہے

تخلیق

ہمیں اقبال کی فکر رسا نے یہ بتایا ہے
کہ ہر انساں اک چھوٹے سے پیمانے پہ خالق ہے
غلط ہے وہ جہاں جو مختلف ہے اس کے خوابوں سے
وہ دنیا ٹھیک ہے اس کے ارادوں کے مطابق ہے

صف عقاب آہنی :- ہوائی جہاز

پروینؔ شاہدی

رقصِ حیات

(اپنے بھائی اور پھر بہن کی شادی کی خبریں پاکر)

جب بزم ارتقا میں جلی شمعِ زندگی   تھی روشنی میں شانِ حجابِ عروس کی
گونجی فضائے شوق میں شعلوں کی راگنی   جو بڑھ کے دوسری نئی تانوں میں ڈھل گئی
ہر لو نئی لوؤں کو جگاتی چلی گئی
زنجیر روشنی کی بناتی چلی گئی

تمثیلِ خلدِ آدم و حوا بنی حیات   افسانۂ لطافتِ دنیا بنی حیات
تاریخِ عشق و حسنِ خود آرا بنی حیات   تخلیق کا لطیف سہارا بنی حیات
فطرت بجائے جاتی ہے سازِ التفات کا
رکتا نہیں ہے رقصِ تسلسل حیات کا

تاریخِ کائنات میں بدلا کئے نظام   ہر دور تازہ آیا نیا اک لئے پیام
کچھ کچھ بڑھا بھی حسن و محبت کا احترام   اب تک مگر یہاں ہے مسرت جنونِ خام
رہتی ہے سہمی سہمی امنگیں شباب کی
صورت نہاں ہے زندگیٔ کامیاب کی

خطے اسی جہاں میں ایسے بھی ہیں مگر   رقصاں ہے جن کے ساز پہ اب عظمتِ بشر
جو جھومتے ہیں حسن و محبت کے نام پر   ہے جادۂ شباب جہاں جنت سفر
گاتے جہاں ہیں لوگ ترانے نئے نئے
بنتے جہاں ہیں رود فسانے نئے نئے

تیرے یہاں بھی پرافشاں ہیں ولولے   رگ رگ میں بن کے خون خراماں ہیں ولولے
سازِ بہارِ نو پہ غزل خواں ہیں ولولے   معمارِ تازگیٔ گلستاں ہیں ولولے
سرخی بتا رہی ہے رخِ کائنات کی
جنت یہاں بھی بن کے رہے گی حیات کی

انعامِ لہ آرزوئے برادر نشاطِ جاں!!   تسکینِ روح! عیشِ تمنائے خانداں!
شادی تمہاری مژدۂ تعمیرِ گلستاں   خوابِ بہارِ تازہ کی تعبیر کامراں
وجد آفریں ترانۂ سازِ خیال ہے
ایسے میں ضبطِ جوشِ مسرت محال ہے

لہ شاعر کا چھوٹا بھائی

مجبو

ہے جادۂ حیات مسرت لئے ہوئے — ہے ہر قدم شباب کا جنت لئے ہوئے
ردن اٹھاؤ عزمِ محبت لئے ہوئے — ہمت کرو نشاطِ رفاقت لئے ہوئے

منزل بھی اس جہاں میں ہے رہگذر بھی ہے
بڑھتے چلو کہ کوئی رفیقِ سفر بھی ہے

م دونوں سازِ وقت پہ گاتے ہوئے چلو — دنیا کو نغمہ زار بناتے ہوئے چلو
کانٹوں کو راستے سے ہٹاتے ہوئے چلو — ہاں ہر قدم پہ پھول کھلاتے ہوئے چلو

بھر دو نئی امنگوں سے آنچل حیات کا
تم دونوں پر بھی فرض ہے کچھ کائنات کا

لبریٰ[1] ! مری عزیز بہن! دل کی روشنی!! — ماں جائے کا غرور! بھرے گھر کی لاڈلی!
ترا رہی ہے روح کہ ہو تم دلہن بنی — دل میں مچل رہی ہے مسرت کی راگنی

کب دور ہوں بہارِ طرب آفریں سے میں
سہرے کے پھول سونگھ رہا ہوں یہیں سے میں

ہے زندگی کے راستے پر یہ سفر نیا — تم جا رہی ہو آج بسانے کو گھر نیا
جلوے نئے ہیں وقت کے ذوقِ نظر نیا — سسرال پر پڑے گا تمہارا اثر نیا

بے تاب جذبِ شوق ہے اظہار کے لئے
لے جاؤ رونقیں در و دیوار کے لئے

تمیزِ زندگی کے طریقے نکالنا — مے خانۂ حیات میں ساغر اچھالنا
سانچے میں صبحِ نو کے زمانے کو ڈھالنا — دل کو سنبھالتے ہوئے آنچل سنبھالنا

ہر ذرہ ہے نشاطِ تمنا لئے ہوئے
آگے بڑھو خوشی کا پھریرا لئے ہوئے

[1] شاعر کی چھوٹی بہن — (بکسا اسپیشل جیل سنہ ۵۰ء)

کمال احمد صدیقی

بہار کے دن

ہر ایک شاخ ہے دلہن، نکھار کے دن ہیں
مہک رہے ہیں شگوفے بہار کے دن ہیں

یہ برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں، یہ دھوپ
روش روش پہ سنہری پھوار کے دن ہیں

سمن بروں سے پھر آباد ہو گیا ہر باغ
"نشاط" کے ہیں یہی شالامار کے دن ہیں

دہک رہے ہیں اناروں کے پھول جنگل میں
چمن کے دن ہیں یہی لالہ زار کے دن ہیں

یہ "اہربل" کی فضاؤں کا نقشہ جاوید
خدا گواہ یہی آبشار کے دن ہیں

بڑی سہانی ہیں راتیں، یہ چاندنی راتیں
بڑے حسین ہیں یہ دن، بہار کے دن ہیں

حیات دوڑ رہی ہے ہر اک رگ و پے میں
دھڑک رہا ہے ہر اک دل، یہ پیار کے دن ہیں

ہر ایک صبح خوشی کا پیام لاتی ہے
مرے لئے تو مگر انتظار کے دن ہیں

سلام مچھلی شہری

"طفلِ نوزائیدہ کو ہنسنے دو ۔!"

طفلِ نوزائیدہ کو ہنسنے دو
ایک بیساختہ ہنسی کیلئے
جانے کب سے ترس رہا ہوں میں

اپنی زہر آفریں نگاہوں سے
جانتا ہوں کہ اک خوشی کیلئے
اس کے ہونٹوں کو ڈس رہا ہوں میں

نو دمیدہ شگوفہ کیا جانے
باغ کی اِس فضا میں کھل جانا
کتنی ہمت کی بات ہوتی ہے

صبح کی اِس کرن کو کیا معلوم
دامنِ رنگ و بو سے مل جانا
اک قیامت کی بات ہوتی ہے!

گُلِ تازہ کو مسکرانے دو
شاید اس کا تبسمِ معصوم
میری آنکھوں کو روشنی دیدے

میں کہ مایوسِ نغمہ ہائے حیات
شاید اس کا ترنمِ معصوم
مجھکو پھر ایک زندگی دیدے ۔۔!!

ڈاکٹر مسعود حسین

نقوشِ نیم کش

مری دعا بھی وہی میرا مدعا بھی وہی
مجھے بتاؤ کہ ایسے میں ہے خدا بھی وہی

اک عمر میں بھی نہ آئینِ عشق بدلا یہاں
وہی ہے جرمِ محبت بھی اور سزا بھی وہی

کہاں خیال کو فرصت کہ ساز باز کرے
کسی کے ناز اٹھائے کسی سے ناز کرے

بڑھے گا شوق ابھی آرزو کو پھیرے کر
چلیں گے یار تری جستجو کو پھیرے کر

ہم ایک داؤں پہ رکھ دیں گے سب متاعِ خرد
کریں گے رقص وہ جام و سبو کو پھیرے کر؟

کبھی کبھی تو محبت سے ساز باز کرو
کسی کے ناز اٹھاؤ کسی سے ناز کرو

ہم کیا کریں جو دل میں محبت نہیں رہی
شاید اسی نگہ میں قیامت نہیں رہی

پہلی سی ان میں بات کہاں ہے، بدل چکے
اب تو مزاج ہیں، وہ طبیعت نہیں رہی

یہ زخمِ دل کی ہنسی آپ کو بھی بھائی خوب
مگر شگفتگی دیوانے نے نبھائی خوب!

نریش کمار شاد

ایک شادی — ایک کہانی

منگیتر:-

ں جانتا ہوں ترے دل کے آبگینے میں — نئی نویلی اُمنگیں جھلک رہی ہوں گی
نس نفس میں گلستاں مہک رہے ہونگے — نظر نظر میں شرابیں جھلک رہی ہوں گی

ے جمال کی دوشیزگی کے سائے میں — تبسموں کے دیئے جھلملا رہے ہوں گے
ئے خیال۔ نئے ولولے۔ نئے جذبے — تصورات کو جھولا جُھلا رہے ہوں گے

ر یہ کیسے بتائے کوئی تجھے کہ ابھی — میں تیرے خواب کی تعبیر بن نہیں سکتا
ہا شعور جسے تلخیوں نے پالا ہے — نشاط و کیف کی تصویر بن نہیں سکتا

بھی تو میری ستم کوش زندگی کے لئے — صعوبتیں ہیں، حکومت کے قید خانے ہیں
دم قدم پہ ہیں پہرے مری مسرت پر — روش روش پہ مری موت کے بہانے ہیں

زر رہا ہوں میں ان آتشیں مراحل سے — جہاں حسین جیالوں کے پنکھ جلتے ہیں
ہیں غلیظ وباؤں کا دور دورہ ہے — کہیں گھناؤنے فاقوں کے ناگ پلتے ہیں

ہاں کا درد محبت کہاں کا شوقِ جمال — بغاوتوں کے شرارے ہیں میرے سینے میں
بھر رہا ہے جو ظلمت کے تند طوفاں سے — سوار ہوں میں اسی نور کے سفینے میں

ٹھیک ہے کہ انہیں ظلمتوں کے گھیرے سے — بکھر کے پھوٹنے والی ہے تابناک سحر
یں اپنے عزم و عمل سے شکستہ دل تو نہیں — سفینہ پار تو اترے گا بالضرور مگر

بھی کہاں ہے مرے ذہن میں وہ رنگینی — جو تیرے حسن کی رعنائیاں نکھار سکے
راش کر ترے خوابوں کی شوخ تعبیریں — تری سجیلی امنگوں کا دل ابھار سکے

ماں :-

ماں! تری پیار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کی چمک   ایک سنگین حقیقت ہے کوئی راز نہیں
ایک گمبھیر خموشی ہے ترے دل پہ محیط   کوئی آواز نہیں کوئی بھی آواز نہیں

تھرتھراتی ہے تری درد بھری سانسوں میں   بلبلاتی ہوئی مجروح امنگوں کی پکار
رنگ و نکہت سے تہی ہے تری دنیا جس میں   کبھی پھوٹا نہ اُجالا کبھی آئی نہ بہار

یہی کچلا ہوا احساس ہے جس کی تلخی   سکھ کے سرچشمۂ مسرت میں ڈھلنے کے لئے
میری شادی کی ضیا پاش تمنا بن کر   تیرے سینے میں جلاتی ہے مسرت کے دیئے

میں بجھا کر یہ دیئے کیسے تجھے سمجھاؤں   میری شادی بھی ترے غم کو نہ راس آئے گی
پھر بھی اُٹھے گا بدستور ترے دل کا دھواں   تیرگی پھر بھی مرے ذہن پہ منڈلائے گی

پھر بھی آلام کے بازو کسی ناگن کی طرح   اپنے حالات کی گردن میں حمائل ہوں گے
وہی بے کیف شب و روز کا رونا ہوگا   وہی الجھے ہوئے جاں سوز مسائل ہوں گے

تجھ میں اور تیری مسرت میں ہیں جب تک حائل   اس ستم کار تمدن کے پرانے پردے
غیر ممکن ہے کوئی چاند سے چہرے کی دلہن   اپنے ماحول کی ظلمت میں اُجالا کر دے

سہاگ رات :-

گجر

جب بھی دیکھا ہے مری چشمِ تخیل نے تجھے — تیرے چہرے پہ اداسی کے نشاں دیکھے ہیں
تو جنھیں آج چھپاتی ہے مری نظروں سے — یہی آنسو تری آنکھوں میں رواں دیکھے ہیں

درحقیقت مجھے پہلے ہی یقیں تھا کہ تجھے — میرے حالات کبھی راس نہیں آئیں گے
تیرے دوشیزہ و زرکار حنیا لوں کے کنول — میرے ادراک کو چھو لیں گے تو جل جائیں گے

یہ بھی معلوم تھا جب میرے الم خانے میں — تیرے گاتے ہوئے خوابوں کا فسوں ٹوٹے گا
تیری آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے چھالے کی طرح — ایک ارمان بھرے دل کا لہو پھوٹے گا

قابلِ رحم ہے وہ تیرا تصوّر جس نے — ایک صحرا سے بہاروں کی توقع کی تھی
سرخ ذرات کی جھلسی ہوئی تابانی سے — جگمگاتے ہوئے تاروں کی توقع کی تھی

یہ توقع ترے ہونٹوں کا تبسم تھی مگر — اس کی تکمیل کی تصویر یہی آنسو ہیں
تو نے مرمر کے تراشا تھا جسے آنکھوں میں — اس حسیں خواب کی تعبیر یہی آنسو ہیں

یہی آنسو ہیں ترے جشنِ عروسی کا سنگار — جن کے پردے میں ترے پیار کا دل روتا ہے
اس تمدن میں تصور کی اڑانوں کا مآل — اکثر اوقات مری جان یہی ہوتا ہے

اپنے ماں باپ کی شفقت بھی ہے کس جور سے کم — جس نے توڑے ہیں تری شوخ امنگوں کے ایاغ
اور مجھے سونپ کے یہ تیری سلگتی آنکھیں — میرے احساس کی تربت پہ جلا ہیں چراغ

اُلجھن :-

یوں تو خاموش ہوں لیکن تری زلفوں کی طرح　　آج میرے بھی خیالات پریشان سے ہیں
دل کی مایوس تمناؤں کے گھٹا ٹوپ بھی　　اپنی بے سود اڑانوں پہ پشیمان سے ہیں

میں نے سوچا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا　　تیرے ماحول کی ظلمت سے نکالوں گا تجھے
تیری سانسوں میں ملا کر مہ و انجم کے دیئے　　اپنے ہر خواب کی تعبیر میں ڈھالوں گا تجھے

میں نے سوچا تھا مری سوچ کے شعلے لیکن　　سنگدل وقت کے آئین کو پگھلا نہ سکے
آرزوؤں سے علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا　　ولولے کاکلِ حالات کو سلجھا نہ سکے

پھر بھی تو دیکھ کہ برباد تمنا ہو کر　　اک مرا دل ہے کہ آمادۂ فریاد نہیں
جیسے احساس کی دولت سے بھی عاری ہوں میں　　جیسے بیداد بھی میرے لئے بیداد نہیں

اور تو ایک ہارے جواری کی طرح　　اپنے سینے میں کئی زخم لئے بیٹھی ہے
شوخ آنکھوں میں بلکتے ہوئے سپنے لے کر　　عنبریں بال پریشان کئے بیٹھی ہے

کاش تو اتنا سمجھتی کہ تری روح کا غم　　اپنی مایوس جوانی کی تلافی تو نہیں
زندگی کا یہ کڑا دور سہ لینے کے لئے　　اپنے آلام پہ رو لینا ہی کافی تو نہیں

حمایت علی شاعر

تھک چکے پاؤں بس اب اے دلِ ناداں چل بھی
چل کہ اب رات کا نشہ بھی ہے مائل بہ خمار
قمقمے اونگھ رہے ہیں کہ بہت جاگ چکے
چند تارے ہیں فلک پر تو ہیں وہ بھی بیزار
وہ بھی تیرے لئے نیند اپنی بہت تیاگ چکے

چاند پہرے کے سپاہی کی طرح استادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو جائے تو وہ بھی چل دے
رہگذر ایک طوائف کی طرح وا ماندہ
ایسے بیٹھی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے

ایک اک ذرہ کی آنکھوں میں ہے نیند آئی ہوئی
تو بھی گھر چل کے ذرا دیر کو اے دل سو لے
کوئی ایسا نہیں اس وقت جو تیری خاطر
چند لمحوں کے لئے ہی سہی ۔ آنکھیں کھولے

ہجر

اتنا خاموش ہے ماحول کہ چلتے ہوئے اب
اپنی آوازِ کفِ پا بھی گزرتی ہے گراں
تیری دھڑکن مری سانسوں کی ضمانت ہی سہی
تیری چپ چاپ سی دھڑکن بھی ہے وحشت ساماں

کب تلک اس ہجر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی مل بھی سکی ہے غمِ دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل، ترا عنوانِ حیات
اور تجھے جینا ہے اے کشتۂ دوراں کل بھی

اختر انصاری اکبر آبادی

رباعیات

میخانے میں بے حساب پیتے پیتے
گذرا ہے مرا شباب پیتے پیتے
جب ہوش میں آتا ہوں تو آتا ہے خیال
تھک جاؤں نہ میں شراب پیتے پیتے

بیکار ہیں دل کے داغ بجھنے والے
شعلے ہیں درونِ باغ بجھنے والے
اللہ جو توفیقِ چمن بندی دے
روشن نہ کرو چراغ بجھنے والے

تسکینِ دل و نظر تو ہو جائے گی
ہاں زینتِ بام و در تو ہو جائے گی
اس رات جلے یا نہ جلے کوئی چراغ
اے روحِ سحر، سحر تو ہو جائے گی

لے جائے پناہ دیکھ لینے والے
دنیا کی نگاہ دیکھ لینے والے
میخانے پہ بجلیاں نہ ٹوٹیں شاید
میخانے کی راہ دیکھ لینے والے

سردار الہام

تجدید

رات جب بیت گئی صبح ہویدا ہو گی
اک تجلی اسی ظلمات سے پیدا ہو گی

یہ دھندلکے، یہ اندھیرا، یہ ہمہ گیر خلاو
یہ گراں بار خموشی، یہ پراسرار فضا
وا ہے آغوشِ فنا
حوصلے خاک بسر آرزوئیں نوحہ کناں
تیرگی جیسے شہیدوں کی چتاؤں کا دھواں
عبرتِ مرگ عیاں
دہر اک بے در و دیوار سا زندانِ کہن
زندگی میت بے مایہ دبے گور و کفن
وحشتِ دشت و دمن
پھر بھی پندارِ جنوں کیش عناں گیر تو ہے
ایک ایقان ہی صورت گرِ تقدیر تو ہے
ذوقِ تدبیر تو ہے
جو تمنا کا پیامی ہے، بہاروں کا نقیب
کارواں آکے لٹا ہے اسی منزل کے قریب
منزلِ قرب "حبیب"
رات جب بیت گئی صبح ہویدا ہو گی
اک تجلی اسی ظلمات سے پیدا ہو گی

عزیز قیسی

شبِ ماہ

آج پھر خستگی دامنِ تار کی
اپنے سر کتنے الزام لے آئی ہے
میری آشفتگی میری وحشت سری
چاکِ داماں پہ دشنام لے آئی ہے
تیرگی چشمِ نمناک کی آج پھر
زردیٔ رنگتِ شام لے آئی ہے
زر گزیدہ تمنا کی بے مائیگی
ہر نفس زہر کا جام لے آئی ہے
یہ شبِ ماہ میرا وطن ہے جہاں
خامشی پھر وہ پیغام لے آئی ہے

جس کو سنکر میں گم کردہ کارواں
پا چکا تھا تمنائے دل کا نشاں

دور تک موتیا کی مہک رقص میں
شب کے جوڑے کا گجرا بکھر سا گیا
دامنِ سبزۂ پھولوں کی اک کہکشاں
ذرہ ذرہ تجلی سے بھر سا گیا

غم میں ڈوبا افق وصل کیف میں
سونے چاندی کی لو سے نکھر سا گیا
بعد مدت فضا کا یہ قصرِ حسیں
جشن کی آس میں پھر سنور سا گیا

چاند - ایک نغمۂ پر اثر کی طرح
عرصۂ آسماں میں ابھر سا گیا
درد ٹھنڈے اجالے میں لپٹا ہوا
دل کی پہنائیوں میں اتر سا گیا

ذرّے خورشید ہیں چرخِ انوار کے
مونس و آشنا ہیں غمِ یار کے

بیکراں چاندنی - بے ردا چاندنی
دورِ تجدیدِ غم کا جہاں بن گئی
لمحہ لمحہ افق سے برستی ہوئی
اک برستی ہوئی کہکشاں بن گئی
ایسے پھیلی فضا کے شبستاں میں
نکہتِ گیسوئے دلبراں بن گئی

اتنی گمبھیر اتنی بیکل اور جبل
جیسے تنہائی کی ہمراز داں بن گئی
جیسے اسرار آگاہ سی اک نظر
جیسے خاموشیوں کی زباں بن گئی
تازہ ہوتا ہوا خواب بننے لگی
یاد آتی ہوئی داستاں بن گئی

ہمرہی جیسے بچھڑے ہوئے راہ کے
مدتوں بعد پھر دفعتہً مل گئے

کیسے سمجھاؤں کہ اس سمن زار میں
ان کہے بول سنتا ہوں لمحات کے
خامشی کی پرت ٹوٹتی ہی نہیں
سل گئے ہونٹ شوریدہ جذبات کے
سازِ دل کے سلگتے ہوئے تار میں
کتنے دامن الجھتے ہیں نغمات کے
ان سنی دور و نزدیک کی شورشیں
راز کھلنے لگے سوچتی رات کے

یاد کے چل پڑے کارواں ذہن میں
حادثے ہو رہے ہیں جواں ذہن میں

پھر گئیں مرگ جذبات کی ساعتیں
آنکھ میں ہیں جنازے سے اٹھتے ہوئے

ہجر

ہمسفر ہاتھ پیوستہ باہم دگر
وقت کی تیرہ راہوں میں چھٹتے ہوئے
ہجر کی ساعتیں شور کرتی ہوئی
وصل کے زمزمے دل میں گھٹتے ہوئے
محفلیں راگ کی سرد ہوتی ہوئیں
شوق کے شعلہ گر گیت لٹتے ہوئے

عارضوں کے کنول جھلملاتے ہوئے
آنسوؤں کے دیئے ٹمٹماتے ہوئے

اے حسین چاندنی اے مری ہمسفر
کس کو بتلاؤں جاکر یہ داغ جگر
کس سے پوچھوں کہ کیوں اتنی پابند ہے
اس جہاں میں محبت کی اک اک نظر

باندھ کر عمر بھر رشتہ ہائے وفا
چھوٹ جاتے ہیں اس راہ کے ہمسفر

بارہا کرکے صد وعدہ انگبیں
زہر دیتے ہیں اکثر جہاں کے مکیں

اے مری دادگر اے مری ہم زباں
اے مری ہم نفس اے مری ہم نشیں

م سخنی چاندنی ہم وطنی چاندنی
یں تری رہگزر کا مسافر نہیں
رچہ میں آج اک اجنبی ہی سہی
یں ترے شہر کا ہوں پرانا مکیں
تنی راتیں گزاریں ترے دیس میں
رے پہلو سے نزدیک دل سے قریں

ب مدت ہوئی ساتھ روٹے ہوئے
بے گیسو میں موتی پروے ہوئے

وں بعد لوٹا ہوں اس شہر میں
متاعِ وفا دولت غم لئے
ا دنیا کے ساگر سے تشنہ دہن
لک ہونٹوں پہ انعامِ شبنم لئے
رہ زخم کی طرح ہنستا ہوا
ہم رتبہ دیدہ نم لئے
م کی طرح لوٹا ہوا ایک دل
ت کی طرح تقدیر برہم لیئے

ال بعد گو تجھ سے ہے سامنا
تبسم کی قیمت میں ماتم لیئے

اتنے غم لے کے آیا ہوں پردیس سے
زخم ہنستے ہیں ناسور کی ٹیس سے

آج واقف ہوا دل کہ ہر اک نفس
اک تبسم ہے اشکوں سے دھویا ہوا
اک نغمے کی قیمت، سر بزم غم
ایک سر ہچکیوں میں سمویا ہوا
ہول امید کا، دل کو معلوم ہے
دل کہ ہے ہر تمنا پہ رویا ہوا

آج اپنے جلے پر پشیماں نہیں
اپنی ویرانیوں سے پریشاں نہیں

دل کو باوصف صد حسرت سرخوشی
عظمت و شانِ اسکندری مل گئی

یوں بہ عنوان فن جبر حالات میں
مری آواز کو سرکشی مل گئی
ذہن کو موڑ پر جہل و ادراک کے
بے بدل دولت آگہی مل گئی
پا بہ زنجیر افلاس کے دور میں
وہ تو اچھا ہوا خود سری مل گئی

ورنہ یہ درد کچھ اس قدر کم نہ تھا
زندہ رہنے کے قابل یہ غم نہ تھا

قاضی سلیم

ابدی لمحے

سرسراتے ہوئے پردوں سے گزر آیا تھا
ابھی کچھ دیر ہوئی گرم ہوا جھونکا
جسنے ہم دونوں کو اکبارگی چونکایا تھا

تھا میں نزدیک ترے، تجھ سے کوئی مطلب بھی نہ تھا
ایک لمکار میں جانے میں کہاں جا پہونچا
وہ کوئی اور ہی دنیا تھی، یہ دنیا تو نہ تھی

ایسا محسوس ہوا جیسے بہت دن پہلے
مجھ کو اب یاد نہیں کتنا زمانہ گزرا
ہو بہو ایسے ہی حالات سے ہم گزرے تھے

یہی موسم کی تمازت تھی یہی رنگِ فضا
یہی ملبوس، یہی پھول، یہی تصویریں
یہی ماحول یہی ترتیب سے پھیلی اشیاء

تیرے گھونگھٹ میں دمکتا ہوا خورشید
ہاں اسی طرح کی، ایسی ہی معطر سانسیں
شوقِ بیتاب یہی، ضبط کی تاکید یہی

جسم تحلیل ہوئے جاتے تھے خوابوں کی طرح
بارِ جذباتِ فراواں سے اک سودہ تھکر
لب سے الفاظ نکلتے تھے ربابوں کی طرح

یہی پردے تھے کہ پھر ایسے ہی پردے ہونگے
جن کی ہر جنبشِ مشکوک پہ سہمے ہوئے دل
جانے کب پہلے اسی طرح سے دھڑکے ہونگے

بے سبب خوف یہی جس کا نہیں کوئی جواز
پڑھ نہ پائے کوئی ابرو کی شکستہ تحریر
التفاتِ نگہِ ناز کا بے ربط انداز!

ہجر

ہے لئے ٹوٹا تھا نگاہوں کا فسوں
ب ایک تبسم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ے آیا وہی تنہائی کا خوابیدہ فسوں

پھر آیا ہے گردش میں وہی جامِ حیات
سوچ رہا ہوں کہ جانے کیوں کر
ت کے حسیں لمحوں کو ملتا ہے ثبات

ہو جاتے ہیں یہ قیدِ زماں سے آزاد
گزرا ہوا کس طرح پلٹ آتا ہے
ل کیسے بنا کرتی ہے اک پچھلی سی یاد

ابھی تو ہے تاریک سمندر کہ جہاں
م ٹوٹ کے لمحات گرا کرتے ہیں
ادر موج ابھرتی ہوئی گزری صدیاں

اپنی آغوش میں لیتی ہیں چھپا لیتی ہیں
وقت کی کتنی گرانبار تہوں کے نیچے
ابدی موت کی وادی میں سلا دیتی ہیں

یہ اگر سچ ہے تو پھر آج یہ کیا عالم تھا
یہی سب کچھ تھا مگر وقت وہ امروز نہ تھا
جسکا ادراک حقیقت سے ذرا ہی کم تھا

ایسا محسوس ہوا تھا کہ بہت دن پہلے
آج کچھ یاد نہیں کتنا زمانہ گزرا،
ہو بہو ایسے ہی حالات سے ہم گزرے تھے!

نظم

زبیر رضوی

خوش ہو اے زہرہ جبیں کعبۂ دل، روئے حسیں
تیری محفل سے میں چپ چاپ چلا آیا ہوں
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے نگیں
دولتِ صبر و سکوں تجھ پہ لٹا آیا ہوں

خوش ہو اے میری سلگتی ہوئی راتوں کی جلیس
تیرے انداز و تبسم کو کوئی پا نہ سکا
دیدہ و دل میں تیرے درد کوئی پل نہ سکا
تیری نیندوں کے شبستاں میں کوئی جا نہ سکا

اپنے نغموں کی زباں اپنے گلو کا خوناب
اپنی راتوں کا سکوں، اپنے جنوں کے مہتاب
تیری خوشبوں کے لئے پھول لٹائے کیا کیا
تیرے دامن کے لئے رنگ چرائے کیا کیا

فجر

تجھ کو پانے کی تمنا میں زِ فیضِ دل و جاں
تلخیِ گردشِ دوراں کو پکارا میں نے
تیرے بخشے ہوئے ہر درد کو قرآں سمجھا
یوں شبِ غم کی لطافت کو نکھارا میں نے

کتنی آنکھیں میری جانب نگراں تھیں لیکن
تیرا در تیرا جہاں چھوڑ کے میں جا نہ سکا
کتنی باہیں میری آغوشِ جواں تک آئیں
پر میرے شوق کی مستی کو کوئی پا نہ سکا

کتنے ہونٹوں کی مہک میرے لبوں تک آئی
کتنی زلفوں کی ہوا میری شبوں تک آئی
میرا احساسِ جنوں پھر بھی ترا ہو کے رہا
دلِ صد پارۂ خوں پھر بھی ترا ہو کے رہا

ہاں، مگر تیرے تغافل میں کمی آ نہ سکی
تیرے بدلے ہوئے انداز سے معلوم ہوا
تو مرے خواب کی تعبیر نہیں بن سکتی
جنبشِ چشمِ فسوں ساز سے معلوم ہوا

مُحب

غم نہیں اپنی تباہی کا زبوں حالی کا
خوش ہوں میں تیری بہاروں کو خزاں چھو نہ سکی
تیری جنت میں شراروں کا گذر ہو نہ سکا
تیری مسجد کے میناروں کو اذاں چھو نہ سکی

میری ناکام امنگوں کا جواب آ نہ سکا
تیری مغرور نگاہوں کو حجاب آ نہ سکا
میں ہوں اب میری سلگتی ہوئی تنہائی ہے
خواہشِ لذتِ آزار کو نیند آئی ہے

ایک خلش آج مگر دل کے قریں ہوتی ہے
تری راتیں بھی کبھی وقفِ الم ہو جائیں
تیری جنت میں شراروں کا گذر ہو جائے
راحتیں تیری بھی اے کاش کہ کم ہو جائیں

خوش ہو اے زہرہ جبیں کعبۂ دل روئے حسین
تیری محفل سے میں چپ چاپ چلا آیا ہوں
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے نگیں
دولتِ صبر و سکوں تجھ پہ لٹا آیا ہوں

اب نہ محفل میں تیری خانہ خراب آئے گا
اب نہ مجروح امنگوں پہ شباب آئے گا
اب نہ ہونٹوں پہ کوئی حرفِ سوال آئے گا
اب نہ اے زہرہ جبیں تیرا خیال آئے گا

انور معظم

نغمۂ دل

مری حیاتِ گریزاں کے آتشیں لمحو!
مرے قریب سے ہو کر نہ یوں گذر جاؤ!
ابھی نگاہ میں جلوؤں کی آنچ باقی ہے
مری نگاہ سنور نے تلک ٹھہر جاؤ!
نہ جانے کیا ہے نظر آج مسکرانی ہے
تم ایک پل کے لیے ہی سہی نکھر جاؤ!
یہ فصل بھی نہ رہے آگ اور پانی میں
قریب آؤ، مری روح میں اتر جاؤ!

سکوں کے سائے گھڑی دو گھڑی قرار تو لوں
میں اپنی فکر کی زلفیں ذرا سنوار تو لوں

سمجھ تو لوں کہ حیاتِ جہاں کے گلشن سے
گذر رہا ہوں باندازِ گل تہی دامن
کسے رفیق کہوں، کس کو راز داں سمجھوں
نہ ہم قدم ہوں صبا کا نہ ہم جلیسِ چمن

تجمل

مسرتوں کی خوشی ہے نہ آنسوؤں کا ملال
لٹا لٹا سا تبسم رکی رکی دھڑکن
یہی ہے دورِ بہاراں یہی ہے موسم گل
اسی میں چاک ہوئے ہیں جنوں کے پیراہن
گلوں کا حسن، چمن کا سنگھار کہتے ہیں
اسی کو اہلِ گلستاں بہار کہتے ہیں
دلِ انتظار کی کس کس ادا کے ناز سہے
ہر اک امید ہے ظالم، ہر اک گماں قاتل
گلوں سے حرمتِ گلشن کی بات کون کرے
بجھی بجھی سی ہے شبنم، کلی کلی بسمل
کچھ اتنے داغ اٹھائے ہیں محبتِ غم میں
کہ اب خوشی بھی نہیں اعتماد کے قابل
نہ جانے کونسی منزل پہ کارواں پہنچے
نہ رہزنی ہی مکمل نہ رہبری کامل

قریب عارض و گیسو، براہِ کوچہ دل
ٹھہر ٹھہر کے بڑھے ہیں نگاہ کے محمل

مجھے خبر ہے حیا جب گریز کرتی ہے
وفا سے ضبط کا دامن بھی چھوٹ جاتا ہے
جو دل کے پھول پہ گرتی ہے یاد کی شبنم
تو دھڑکنوں کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے

گجر

چلے جو درد کی ساعت، کبھی ہوائے کرم
تو بن کے پھول ہر اک زخم مسکراتا ہے
ہر ایک سانس میں کھنچ آتی ہے امید کی رو
دیا حیات کا اشکوں میں جھلملاتا ہے

صبا سے شکوۂ فصل بہار کیا کیجے
ہے وضعِ غم پہ نہیں اعتبار کیا کیجے

قریبِ کعبۂ دل دیرِ آرزو ہے تو کیا
خلوصِ سجدہ باندازۂ وقار تو ہے
بہ اہتمامِ تصور زِ فیضِ حسنِ نظر
غم آشکار تو ہے، جلوہ بیقرار تو ہے
کسی امید کی آہٹ سہی درِ دل پر
کسی کا میری نگاہوں کو انتظار تو ہے
خیالِ یار سے یہ چشم اشکبار سہی
لبوں پہ ایک تبسم بنامِ یار تو ہے

شعور شعلۂ کامل نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات درد کا حاصل نہیں کچھ اور بھی ہے

وہ آگ جس میں چمن کا شباب جلتا ہے
اسی سے گرمئ خونِ رگِ بہار بھی ہے

ﷺ

اداسیوں کا تسلسل سکوں فروز سہی
اداسیوں پہ مگر دل کو اختیار بھی ہے
حنائے غم سے ہے پابند زندگی پھر بھی
لبوں پہ خندۂ بے باک کا وقار بھی ہے
یہ اجنبی سا تبسم لب آشنا ہی نہیں
اسیرِ غم کو تبسم پہ اعتبار بھی ہے

یہی جہاں ہے جہاں کچھ سکوں ملے تو ملے
اسی بہار میں دل کی کلی کھلے تو کھلے

ذرا نگاہِ خمار آشنا اُٹھا، ساقی!
اسی سے گردشِ پیمانہ، گرمیٔ محفل
کوئی فسانۂ رنگیں ہی چھیڑ، ہمراہی!
کہ جاں گداز ہے احساسِ دوریٔ منزل
سنا! وہ نغمۂ طوفاں ہی کیوں نہ ہو مطرب!
کہ استوار نہیں ربطِ کشتی و ساحل
کبھی صبا سے بہاروں کی گفتگو ہی سہی
چمن میں ذکرِ حیاتِ خزاں سے کیا حاصل

میں خونِ دل سے بہاروں میں رنگ بھر دوں گا
گلِ انبساط کے دستِ نظر سے چن لوں گا

فجر

مری حیاتِ گریزاں کے آتشیں لمحو!
یہ سچ ہے آنکھ میں آنسو اُتر بھی سکتے ہیں
مگر وہ غم جو لہو بن کے آنکھ سے نہ ڈھلیں
وہ غم بنامِ تبسّم نکھر بھی سکتے ہیں
جو خواب حسرتِ تعبیر میں پریشاں ہیں
وہ حسن خیزِ نظر سے سنور بھی سکتے ہیں
گزرنے والے زمان و مکاں کی منزل سے
ہر امتحانِ جہاں سے گزر بھی سکتے ہیں

اُمیدِ تازہ پہ بہکے قدم سنبھلتے ہیں
اسی چراغ سے دل کے چراغ جلتے ہیں

سوادِ زیست کسی طرح طے نہیں ہوتا
سوال بن کے ہر اک نقشِ پا اُبھرتا ہے
قدم قدم پہ اُمیدوں کے پھول کھلتے ہیں
صدائے شوق پہ منزل کا دل دھڑکتا ہے
لبوں پہ عزم کے آتی ہے مسکراہٹ سی
ہر ایک موڑ پہ سورج نیا نکلتا ہے

نمودِ صبح کی باتیں قرارِ جاں نہ سہی
نمودِ صبح کی باتوں سے دل بہلتا ہے

پریم وار برٹنی

بنجاروں کے دیس میں

اونگھتی رات کے ٹھٹھرے ہوئے سناٹے میں
ایک گھڑیال کی آواز اچانک لہرائی
گاؤں سے دور بہت دور کسی ٹیلے پر
ہچکیاں لینے لگی دھیمے سُروں میں شہنائی

گوریاں گاؤں کی ہاتھوں میں لئے گھی کے چراغ
ایک ٹوٹے ہوئے مندر کی طرف جانے لگیں
پردۂ غیب سے آنے لگی چیخوں کی صدا
وحشتیں رات کی آغوش میں بل کھانے لگیں

ڈفلیاں بجنے لگیں، پائلیں بیدار ہوئیں
آسماں گونج اٹھا ساز کی جھنکاروں سے
جھومتا ناچتا گاتا ہوا اک جم غفیر!
مشعلیں لیکے نکل آیا سیہ غاروں سے

مشعلیں دیکھ کے تھرائی شبِ تیرہ و تار
تلملانے لگے آکاش کے ننھے تارے
دور مغرب میں اچانک کہیں بادل گرجا
تھم گیا رقصِ طرب۔ سہم گئے بنجارے

عجر

کسی روٹھی ہوی دیوی کو منانے کے لئے
ایک دوشیزہ کو پہنایا گیا سرخ لباس
مل کے چلائے سبھی لوگ کہ "جے ماتا کی"
اور لہرانے لگا چاروں طرف خوف وہراس
دیکھ کر خوف سے سہمی ہو دوشیزہ کو
آگ برسانے لگی غصے سے چشم تہذیب
ہنس پڑے موت کی خونخوار چتا کے شعلے
دیوتاؤں کے بے قام مجسموں کے قریب
از سر نو کسی حاکم کا اشارہ پا کر!
جھانجریں چیخ اٹھیں رقص کا آغاز ہوا
آگ کے گرد چمکنے لگے خونی خنجر
وقت پر کھولے ہوئے مائل پرواز ہوا
بجھ گئے کانپ کے مندر کے ضیا پاش چراغ
تن گئے اجلی فضاؤں پہ اندھیروں کے کفن
رحم آیا نہ ذرا روٹھی ہوئی دیوی کو
جل مری موت کی بھٹی میں کنواری دلہن

پردۂ غیب میں چھپ کے کوئی بجلی کڑکی
سرخ شعلوں سے بھڑک اٹھی غضبناک چتا
کانپ اٹھے ارض وسما شورِ حوادث سے، مگر
اونگھتے ہی رہے تہخانے میں پتھر کے خدا

مظہر امام

.....اپنی محبت کیلئے

یاد تو ہوگی تجھے وہ مری سانسوں کی لپک — تیرے رخسار کے شعلوں کو ہوا دی
میری آغوش میں سہمی ہوئی عفت تری — شوق کی ہمت معصوم بڑھا دی ج
یاد تو ہوگا مرے ہونٹوں کا لمسِ بے تاب — تری رگ رگ کو مئے برق پلا دی
تری آنکھوں میں وہ سمٹا ہوا مبہم سا حجاب — لب گستاخ کی تقدیر جگا دی جس
مصحفِ رخ پہ ترے مہر درخشاں کا فروغ — شمع انفاس کی لو اور بڑھا دی ج
ہم کناری کی وہ مشاطگی راز و نیاز — تیری نوخیز جوانی کو جلا دی جس
تیری خفگی کا تصنع، مری شوخی کا خلوص — تیرے گلرنگ تبسم کو صدا دی

یاد تو ہوگا تجھے اپنی نگاہوں کا طلسم — ہوش کو پائے محبت پہ جھکایا
تیری بکھری ہوئی زلفوں کا وہ بے باک انداز — انگلیوں کو مری مضراب بنا
یاد تو ہوگی مرے حلقۂ بازو کی ترنگ — شکنوں سے ترا ملبوس سجایا
تیری پیشانی پہ وہ کاہکشاں کی تنویر — ملتہب میرے تخیل کو بنایا
تیری گردن سے مری باہوں کا لپٹا ہوا ہار — لالہ و گل کو میرے دل میں کھلا
چھیڑتے وقت مرے ہاتھوں کی مخمور نسیم — غنچۂ تن کو ترے پھول بنایا
وصل کے بعد تری پاک نگاہوں کی حیا — کاکل و رخ کا فسوں اور جگا

مختلف وقت میں یہ کیفیتیں گزری ہیں — جن سے روشن ہے مری بزم تمنا
یہی یادیں تو مری زیست کا سرمایہ ہیں — لکھو کے سرمایۂ ہستی، کوئی کس
تو اگر بھول گئی ہے وہ گلابی لمحے — وقت کے دامنِ صد چاک کو پھر

پھر ذرا قصۂ پارینہ کو تازہ کر لے
میری خاطر نہ سہی اپنی محبت کیلئے

نعمت انور

چاندنی رات

شب نے اپنی زلفوں کو
ے عارض پہ یوں بکھیر دیا
ہ آہستہ کوئی پیکرِ حسن
ے گیسو فضا میں لہرائے
اس کے گھنے سے سائے میں
لوں کیف سے بھرا ماحول
گی اپنے ہوش کھو بیٹھے
خودی، گویا نیند آ جائے!

حسنِ مہتاب چاندنی بن کر
روئے گیتی پہ کیف برسائے
کیف آگین سکوت میں انساں
زندگی کے تمام فکروں سے
بے خبر محوِ خواب ہو جائے
وقت رنگینیوں میں محوِ خرام
جانبِ صبحِ شب کو لے آئے!

بکے ماتھے پہ چاند رقص کناں
ہ اک نو عروس کا ٹیکہ
کے ماتھے پہ جگمگانے لگے!
ر زلفِ سیاہ کا سایہ،
شنی اور بھی بڑھانے لگے!

سوامی مادھرادی

جیون کی کھوج میں

اک سوچ میں الجھا رہتا ہوں — پر سوچ نہیں کچھ پاتا ہوں
میں ڈھونڈ رہا ہوں جیون کو — پر کھوج نہیں کچھ پاتا ہوں

ہے کھوج مجھے اُس جیون کی
جو نربل کو بل دیتا ہوں
جو کُٹِل کٹیلے کانٹوں پر
نر بھئے ہو کر چل دیتا ہو
ہر گھاٹ پہ ہیں بٹ مار یہاں — ہر گھٹ پر دھوکا کھاتا ہوں
میں ڈھونڈ رہا ہوں جیون کو — پر کھوج نہیں کچھ پاتا ہوں

یاں پد موں پُرش مہان ملے
اور سنتوں کے سنتان ملے
ہر گیانی سے اتِ گیان ملے
پر سب کے سب انجان ملے
جس روپ مجھے بھگوان ملیں — وہ روپ نہیں لکھ پاتا ہوں
میں ڈھونڈ رہا ہوں جیوں کو — پر کھوج نہیں کچھ پاتا ہوں

میں جیون کی اس بازی میں
کچھ کھو دیتا، کچھ پاتا ہوں

گجر

پَر اب تک مجھے پتہ نہیں
میں کیا ہارا کیا جیتا ہوں ؟
جو جیتا تھا سو ہار گیا　　اب ہار میں ہارا جاتا ہوں
یں ڈھونڈ رہا ہوں جیون کو　　پر کھوج نہیں کچھ پاتا ہوں
کچھ اپنے ملے، کچھ غیر ملے
کچھ پھول ہارے تیر ملے
کچھ تیرے حرم اور دیر ملے
پر سب کے بھیتر بیر ملے
نت بھیدوں میں اَنت بھید ہیں یاں　　بن بھید نہیں کچھ پاتا ہوں
یں ڈھونڈ رہا ہوں جیون کو　　پر کھوج نہیں کچھ پاتا ہوں

مجر

سرور ڈنڈا

[سرور ڈنڈا حیدرآباد کے مشہور اور ترقی پسند عوامی شاعر ہیں۔ قدیم دکھنی میں شعر کہتے ہیں جو ذرا سی تبدیلیوں کے ساتھ اب تک حیدرآبادی عوام کی بولی ہے۔ ڈنڈا کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوامی زبان، عوام کے محاروں، تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ ساتھ نئے خیالات بھی ملتے ہیں۔

مزاح کی چاشنی، اور طنز کے تیکھے پن نے ان کے کلام کو جہاں دکھنی زبان کے ایک حسین مرقع کی صورت بخشی ہے وہاں انھیں حیدرآباد کے عوام کا مقبول ترین شاعر بھی بنادیا ہے

"ادارہ"]

سکڑ گئی کیکو[۱] ان کی کھال جرا[۲] پوچھوں نکو[۳] پوچھوں
رہن کتنے پو[۴] رکھیں شال جرا[۵] پوچھوں نکو پوچھوں
ہیرے سب کھاتے پیتے دوستاں ہور[۶] آشناؤں کی
کیوں پتلی پڑ گئی ہے دال[۷] جرا پوچھوں نکو پوچھوں

۱ کاہے کو ۲ ذرا ۳ نہیں ۴ پر ۵ ذرا ۶ ہور ۷ دال پتلا پڑنا

تجر

روپیّوں کے کلغت پو جوا کرتے اینٹھتے تھے کل

کیوں گھوڑاں[8] پو ہیں اُنکے لال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

نہ وہ ارّاش کلّوں[9] پو نہ وہ آنکھیاں میں ہے کاجل

کدھر گئی وہ ہرن کی چال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

نیچ[10] بولتے تھے ایک دن بھاگ اپنے جگگائیں گے

مگر کیوں ہوندا[11] نکلا فال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

گورے سرکار سے لیکو[12] نحوست[13] آج لگ[14] تا یم

کیوں ڈھولاں سبکے ہیں بے تال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

اجالوں کے زمانہ میں گھراں کے ہیں نہ گھاٹاں کے

نہ عبدل خوش نہ نبی لال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

سڑے گلیاں میں رہنے ہارے[15] محلاں میں پنہچتے[16] اچ

بدل گئی کیکو انکی چال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

کو بلو کے گھراں سے اب دھواں تک بھی نکلتا نیں[18]

غریباں پوا[19]یچ کیوں ہے کال جرا پوچھوں نکو پوچھوں

وہ سب تیرے مُلک کے منگا[20] موتی بیچنے ہارے

لگا کو مجھیں اب کیوں ٹال[21] جرا پوچھوں نکو پوچھوں

ارے ڈنڈے تیرے تو چلنے[22] والے ہیں نا بے گنتی[23]

تو پھر[24] کیکو اٹھایا حال ذرا پوچھوں نکو پوچھوں

۸ گھوڑا ۹ گالوں ۱۰ تم ہی ۱۱ اوندھا ۱۲ لے کر ۱۳ نحوست ۱۴ تک ۱۵ پہنچتے ہی

۱۷ کھپریل ۱۸ نہیں ۱۹ پر ہی ۲۰ مونگا ۲۱ لکڑیوں کی دوکان ۲۲ چلانے ۲۳ ان گنت ۲۴ پھر

عصمت چغتائی

پنکھڑیاں[1]

(چین کی ایک مزدور عورت کی کہانی)

ہنچاؤ کی پرسکون جھیل پر ہماری ناؤ جل پری کی طرح تیرتی چلی جارہی تھی۔ چھوٹی سی چوبی میز پر ارغوانی رنگ کی چائے سے لبریز پیالیاں کشتی کے ہلکوروں سے چھلکی جارہی تھیں۔ کشتی بان دھیرے، ہلکورے لیتے ہوئے سروں میں گا رہا تھا ——

"مشرق میں سورج ابھرا —— اور روشنی پھیل گئی —— کرنوں کی جگمگاہٹ میں مَیں نے اپنے محبوب کا چہرہ دیکھا" ——

وہ میرے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی، جیسے جھیل کے سکون کا موازنہ اپنی بیتی ہوئی پُرآشوب زندگی سے کر رہی ہو۔ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی غلافی آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں، صرف ایک باریک سی چمکیلی تحریر اس بات کا ثبوت دے رہی تھی کہ وہ جاگ رہی ہے، مگر جاگتے میں بھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔

"تم کہانیاں لکھتی ہو؟" اس نے چونک کر پوچھا —— "تو لکھو میری کہانی، اور ذرا جی لگا کر لکھو ——

جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اپنی ماں اور بڑی بہن کے ساتھ کپاس کے کھیت میں روئی کے سفید سفید پھول چنتے پایا۔ میں کب کپاس کے کھیت میں کام کرنے لگی، یہ مجھے یاد نہیں پڑتا، جیسے میں نے وہیں سفید سفید پھولوں کے سائے میں جنم لیا ہو۔ میرا بڑا بھائی جو دس برس کا تھا زمیندار کے ہاں مویشی چراتا تھا۔ ہم تینوں یعنی ماں اور ہم دونوں بیٹیاں دن بھر کپاس چنتیں اور رات کو اصطبل میں پڑ رہتیں۔ میری ماں پورے دنوں سے تھی اور بڑی مشکل سے گھسیٹ کر چلتی تھی۔

اسے میں باپ کے بارے میں تو بتانا ہی بھول گئی۔ مگر مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم بس اتنا سنتی تھی کہ وہ بہت خراب آدمی تھا اور نشہ کر کر کے مر گیا جو، کچھ بُرا نہ ہوا کیونکہ وہ روز میری ماں کی مرمت کیا کرتا تھا۔ سنتے ہیں جن کھیتوں پر میں کام کرتی تھی وہ ایک دن ہمارے اپنے ہی کھیت تھے۔ پھر نہ جانے کیسا حساب کتاب

---

[1] چین کے بارے میں تاثرات کے مجموعے کا نام۔

ہوا کہ وہ کھیت پرائے ہوگئے اور ہم مزدور کی حیثیت سے اُن پر کام کرتے رہ گئے۔ سارا کنبہ کام کرتا اور مزدوری میں ہمیں ایک جھونپڑی اور فصل پر چاول مل جاتے۔ ویسے مزدوری تو میرا باپ ہی کرتا مگر باقی کا خاندان بیگار میں لگا رہتا۔ باپ کے مرنے کے بعد مزدوری ختم ہوکر صرف بیگار رہ گئی۔ وہ جھونپڑی بھی چھن گئی اور ہم کھیت مزدور سے خانگی نوکر بن گئے ڈھور ڈنگر کی طرح ہم ہر طرح کا کام کرتے۔ اس کے عوض میں ہمیں اصطبل میں سر چھپانے کی جگہ اور صبح شام لنگر ملتا۔ ہم اپنے کاٹھ کے پیالے لئے قطار میں کھڑے رہتے۔ میری ماں میں بالکل دم نہ رہا تھا۔ وہ تو عموماً چکرا کر پیچھے رہ جاتی پر میرا بھائی دھکا پیل کر کے لنگر کا شوربا اور کالی بدبودار روٹی لے ہی آتا۔

اور پھر ایک دن سفید سفید پھولوں کی چھاؤں میں میری ماں نے زچہ خانہ رچا لیا۔ میں اور میری بہن بھی ادنیٰ انسان کی پیدائش کا معجزہ دیکھتی رہیں اور تھر تھر کانپتی رہیں۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر چاروں طرف جمع ہوگئے۔ جب جمعدار نے انھیں کوڑے مار کر ہٹایا۔ تو وہ اپنے کام پر جا لگے۔ اور میری ماں کو چند عورتوں نے اٹھا کر اصطبل کی زمین پر لٹا دیا۔

اور چند دنوں کے بعد میری ماں ننھے بھائی کی پوٹلی کمر پر لٹکا کر دھیرے دھیرے پھر کام پر لگ گئی۔ دن پھر گذرنے لگے۔ چونکہ ماں کی کمر میں مستقل درد رہتا تھا اس لئے بھائی زیادہ تر بہن کی یا میری پیٹھ پر لدا رہتا۔ اور جب اُسے لادے لادے میری پیٹھ شل ہو جاتی تو ہم دعائیں مانگتے کہ وہ مر جائے۔ مگر جب اُسے دورے پڑتے اور اُس کا رنگ نیلا ہو جاتا اور جبڑے بھنچ جاتے تو ہم ماں کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر روتے اور اس کے اچھے ہونے کی دعا مانگتے۔ اچھا ہوتے ہی وہ ہماری پیٹھوں پر آسیب کی طرح لد جاتا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا میرا بھائی! ماں کا دودھ جلد ہی خشک ہو گیا اور وہ لنگر کی کالی روٹی اور میلے چاول نگلنے پر مجبور ہوا۔ دن بھر وہ روتا رہتا۔ ویسے ظاہر میں تو اس کے جسم پر کہیں گھاؤ ناسور نہ تھا پر نہ جانے اس کے کہاں ٹیسیں اٹھا کرتیں کہ بس سانس لینے کی بجائے رویا کرتا تھا۔ اس کی ننھی ننھی سدا کی غمگین آنکھیں خشک رہتیں مگر ریں ریں آواز جاری رہتی۔ اس کے رونے کی سب کو عادت سی پڑ گئی تھی۔ معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ رو رہا ہے۔ بس جب تک وہ جاگتا فضا کربناک سی رہتی۔ میرا بڑا بھائی بڑا تنومند تھا۔ آئے دن اس کی مرمت ہوا کرتی۔ اس کی اتنی پٹائی ہوتی کہ ہماری گھگی بندھ جاتی، پر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا روز روز کی مار سے عاجز آ کر نہ جانے ایک دن وہ کدھر غائب ہوگیا۔ مر گیا یا کہیں بھاگ گیا، کچھ پتہ نہ چلا۔ بس اتنی تکلیف ہو گئی کہ پہلے لنگر کے لئے وہ کشتیاں لڑ لیا کرتا تھا، اب ہم کھڑے منہ دیکھا کرتے اور بالکل بوڑھے اپاہج لوگوں کی طرح آخر میں ہم کو بھی میلا پانی اور جلے چاول مل جاتے۔

بوڑھے اپاہج لوگوں کی اس زمانے میں کیا پوچھ ہوتی تھی۔ ایسا فرد خاندان پر مُردے کی طرح بھاری ہو جاتا اور لوگ اُسے بھیک مانگنے کے لئے گھر سے نکال دیتے تھے۔ اور وہ کسی بڑے شہر کی طرف رینگ جاتا جہاں بھیک اچھی

ملتی تھی۔ مگر ایسے اپاہج کا بوجھ خاندان پر بڑی نامناسب بات سمجھی جاتی تھی۔ اگر کارخانے میں کسی کی ٹانگ کٹ جاتی، کھیت پر ہاتھ پیر بیکار ہو جاتا تو وہ بھی یا تو بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتا یا دم دار ہوتا تو بھیک مانگنے لگ جاتا، اور یہ کوئی غیر معمولی فعل نہ سمجھا جاتا۔

میری بہن نو برس کی ہوئی تو زمیندار نے باپ کے قرضے کے عوض اسے ایک غریب کسان کے ہاتھ بیچ کر دام اینٹھ لیئے۔ میلے کچیلے چیتھڑوں میں میری سہمی ہوئی ننھی سی بہن بکری کی طرح بے زبان کانپتی ہوئی دور مڑ مڑ کر دیکھتی جا رہی تھی اور میری ماں سر جھکائے کپاس کے سفید سفید پھول چنتی رہی۔ اس نے رخصت ہوتی ہوئی بیٹی کو الوداع بھی نہ کہا۔ نہ کوئی رسم ہوئی نہ شادیانے بجے۔ گائے بیلوں کی خرید و فروخت میں بھی تو رسمیں نہیں ہوتیں!

میرا بھائی دو ڈھائی برس کا ہو کر ابھی تک زمین پر رینگتا تھا۔ وہ ایک کوٹھے کے بل لنگر کی خوشبو سونگھ ہی لیکتا، اور کبھی کبھی دو ٹانگوں والوں سے بھی سرپٹ رینگ لیتا۔ نہ جانے اس کا چلنے کا ارادہ تھا یا نہیں، مگر غلاظت میں لوٹنے کی اسے مکمل آزادی تھی اور بغیر ٹانگوں کے ہی وہ ہر جگہ آسانی سے غلاظت پا لیتا تھا۔ اور اس کی ٹھٹھری ہوئی ٹانگیں اور مٹکا سا منڈا سر دیکھ کر کبھی کسی کو پیار نہ آتا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی ماں اسے زانو پر لٹا کر تھپکتی ....

"میرے راج دلارے، ناشپاتی کے شگوفے، تیری دلہن صندل کا پنکھا جھلتی آتی ہے
اس کے آسمانی پیرہن میں گلاب کے پھول ہیں۔
اور بالوں کی سیاہی میں سنہری کنگھے ــــــــــ"

مگر صندل کے پنکھے اور آسمانی پیرہن والی دلہن کے بجائے میرے غیر شاعرانہ مزاج والے بھائی کو سفید موتی جیسے چاولوں سے عشق تھا جو اسے کبھی خواب میں بھی نصیب نہ ہوئے۔ میری ماں تیس برس کی بھی نہ تھی۔ دبلی پتلی، بالکل لڑکی سی لگتی تھی۔ فصل کے دنوں کے علاوہ ہم زمیندار کے گھر میں جھاڑو دینے کا کام بھی کرتے تھے۔ زمیندار کی بھاری بھرکم بیگم کو مستقل پنکھا جھلنا، ان کی جوتیاں پیروں میں ڈالنا، سر پر تیل تھپکنا، یہ چھوٹے چھوٹے کام میرے ذمے تھے۔ زمیندار کی نئی بہو آئی تو مجھے اس کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ اس کے جسم پر زیتون کے تیل کی مالش کرنا، دم پر دم چائے دینا۔ سنگھار کی چیزیں اٹھا دھرنا۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام میں بخوبی کرنے لگی تھی۔ میری ماں میں بھی کچھ دم آ گیا تھا۔ وہ سارے گھر کے بستر سنوارا کرتی، دالان دھوتی، اور شام کو روشنیاں کرتی۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ ہماری جیسی بیسیوں باندیاں کام پر جٹی رہتیں، شل ہو جاتیں پر کام نہ ختم ہوتا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، جیسے یہ سب خواب کی باتیں ہوں۔ ایک رات کوئی ہمارے اصطبل میں گھس

آیا۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی اور آس پاس کے لوگ جاگ پڑے۔ کئی سال بعد لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ چھوٹے زمیندار کا سالا تھا جو میری ماں کو آتے جاتے چھیڑا کرتا تھا۔ بڑی غلیظ صورت تھی اس کی۔ ملیا تری جیسا چہرہ اور لٹکے ہوئے ہونٹ۔ اُسے دیکھ کر میری نحیف ماں کے پچکے ہوئے گال نفرت اور غصے سے تمتما اُٹھتے تھے۔

ایک دن لوگ قریب گاؤں کے میلے میں گئے ہوئے تھے۔ میں اور میری ماں تھکے ہارے پڑے تھے۔ بھائی بھی کچھ دستوں سے نڈھال آج کم رو رہا تھا۔ سوتے سوتے میری ایک دم آنکھ کھلی تو اصطبل کی دھندلی تاریکی میں میں نے کسی کو اپنی ماں سے گتھم گتھا دیکھا۔ میں رو کر اس سے لپٹ پڑی۔ میری ماں کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ اسے چھڑانے کے لئے میں نے اس حیوان کی پیٹھ میں دانت گڑ دئیے اُس نے ایسی زور سے میرے کہنی ماری کہ میں دور جا کر دیوار سے ٹکرائی اور میرے سر سے خون بہنے لگا۔ میری چیخوں سے ڈر کر وہ حیوان بھاگ گیا۔ برسوں بعد میں نے اپنی ماں کی آنکھوں سے اُبلتے ہوئے آنسو دیکھے۔ میں نے رو رو کر اس کے منہ سے کپڑا نکالنے میں مدد دی۔ اور اس کے تار تار کپڑوں کو دیکھ کر سسکیاں بھرنے لگی مگر میری ماں ویسے ہی نیم برہنہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے آہستہ سے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ اور زمین پر اپنی ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کر سسکیاں لیتی رہی۔ اس نے میرے سر سے بہتے ہوئے خون کی بھی پروا نہ کی اور سوتے ہوئے بھائی کو سینے سے چمٹا کر آنکھیں بند کئے جھومتی رہی۔

نہ جانے کب نیند آ گئی۔ صبح اصطبل میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ٹاپوں کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میری ماں وہاں نہ تھی۔ میرے اور بھائی کے کپڑے خون میں تر تھے۔ جیسے کسی کو ذبح کیا گیا ہو!

مگر وہ جسے ذبح کیا گیا تھا، وہ میں تھی! یہ میرا ہی خون تھا۔ ماں کو کسی نے ذبح نہیں کیا تھا۔ وہ تو سامنے ناشپاتی کے درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے دوڑ کر اس کے پیر چھوئے جو برف کے ٹکڑوں کی طرح سرد تھے۔ میں اور میرا بھائی لٹکی ہوئی ماں کو دیکھ کر چیخنے چلانے لگے۔ ہماری آہ و بکا کو سن کر لوگوں نے آ کر ہماری ماں کو درخت سے اتارا اور زمین پر ڈالا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور جسم کا کوئی حصہ ڈھنگ سے پوشیدہ نہ تھا۔

میں اس کی نیم برہنہ لاش کو جنم جنم نہ بھولوں گی۔ وہ سدا میرے دماغ کے پردے پر لٹکی جھولتی رہے گی۔ رت کی بھیانک ترین تصویر ایک زخم کی طرح میرے وجود پر نقش ہو چکی ہے اور آج بھی جب میں اپنی معصوم کمسن ماں کی آبرو ریختہ نچی ہوئی لاش کو یاد کرتی ہوں، اس کی پپوٹوں میں سے اُبلی ہوئی آنکھیں اور نیلی کچلی ہوئی زبان

....

اور میں بھولنا بھی نہیں چاہتی، اور تم بھی نہ بھولنا۔ انسانیت نے حیوانیت کے ہاتھوں کتنے زخم سہے ہیں،

تہذیب و تمدن کے اس زمانے میں جب انسان ترقی کی بلندیوں کو چھو رہا تھا، حیوانیت اپنا بھیانک روپ کس کر
انداز میں دکھا دیتی ہے ـــــ تو میں بھولنا نہیں چاہتی کہ بھول میں کہیں میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ جائیں اور میری بہو
وہ کچھ دیکھے جو میں نے دیکھا ہے ۔ میں اس خون آشام تاریخ کے ورق کو دوبارہ نہ لوٹنے دوں گی ۔

زندگی میں جس نے سُکھ ہی نہ دیکھے ہوں، اس کے لئے ماں کا دکھ بھی اور دکھوں کی طرح دھیما پڑ جاتا ہے
اصطبل کے بجائے مجھے زمیندار کے احاطے کے ایک سائبان میں اور دوسرے نوکروں کے ساتھ جگہ مل گئی ۔

میرا بھائی پانچ برس کا ہو کر چلا ۔ کتنا سخت جان تھا وہ ! دنیا کی ہر بیماری سے صاف بچ نکلتا ۔ دن بھر
نہ جانے کدھر گھومتا اور کہاں پڑ کر سو رہتا ۔ لوگوں کو اپنی مصیبتوں سے فرصت ہوتی تو وہ دکھیاروں کی طرف
بھی توجہ کرتے ۔ اس وقت تو یوں یتیم و لاوارث پھرنے کو اہم بات ہی نہ سمجھی جاتی تھی ۔ کتنے ہی بچے سڑکوں پر
کتوں کے ساتھ لڑ بھڑ کر پلا کرتے تھے ۔

میری عمر سات آٹھ سال کی ہوگی ۔ صبح سے لے کر شام تک مشین کی طرح میرے ہاتھ چلا کرتے ۔ آج میں
جب اپنی آٹھ برس کی بچی سے اپنی زندگی کا موازنہ کرتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں ۔ میری بچی کے ننھے ہاتھ بھی دن بھر
چلتے رہتے ہیں، مگر کسی کی سیوا میں نہیں، پڑھنے لکھنے اور گڑیوں سے کھیلنے میں ۔ میرا پانچ برس کا بچہ سڑکوں پر
کتوں کے ساتھ پلنے کے بجائے نرسری میں عیش کرتا ہے ۔ تم اسے دیکھو تو دنگ رہ جاؤ ۔ بالکل شہزادوں کی طرح
رہتا ہے ۔ وہ فقیر، چور، اُچکا نہیں، ڈاکٹر یا انجینیر بننے کی تیاری کر رہا ہے ۔

اتنا کام کرنے پر بھی مجھے مار پڑتی رہتی ۔ اگر منہ دھونے کا پانی ذرا گرم یا ذرا ٹھنڈا ہوتا تو بہو رانی
ایک لات میرے پیٹ میں مار کر مجھے ڈھکیل دیتیں ۔ بال سنوارنے میں اگر ایک بال اِدھر سے اُدھر ہو جاتا تو
میری چوٹی پکڑ کر کھینچ دیتیں ۔ اگر دائیں بازو کے بجائے بائیں بازو پر جائے پیش کر دیتی تو کھولتی چائے کی پیالی مجھ پر
اوپر الٹ دیتیں ۔ ایک دن میرے ہاتھ سے نمک کا برتن گر گیا ۔ بہو نے چٹکی بھر نمک میری آنکھوں میں جھونک
دیا ۔

آفت تو اُس دن آئی جس دن اُن کی نسوار کی ڈبیا گُم ہو گئی ۔ میں ہی ان کی چیزیں اُٹھا دھرا کرتی تھی ۔
بس میری ہی شامت آ گئی ۔ جب بہت پٹتی تو قبول دیتی کہ ہاں چرائی ہے، فلاں جگہ رکھی ہے ۔ لیکن جب ڈھونڈے
سے بھی نہ ملتی تو پھر میری مرمت شروع ہو جاتی ۔ بس ڈھونڈنے کے وقفہ بھر مجھے سکون ملتا ۔ جب عاجز آ گئے
تو رائے ہوئی کہ مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے ۔ وہ کوٹھڑی جس کے پاس سے بھی بال بچے گزرتے ڈرتے تھے
اب تک مجھے کال کوٹھڑی سے صرف ڈرایا گیا تھا، اس میں بند ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی ۔ چیخ پکار کے باوجود
مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ۔ یہ وہ کال کوٹھڑی تھی جس میں سے آئے دن سانپ، بچھو، کنکھجورے

لاکرتے تھے مگر وقتی طور پر مار سے بچ کر مجھے وہاں بڑا آرام ملا۔ میں ایک لکڑی کے پنچ پر پڑ کر اونگھ گئی۔ لوگ
یسے مجھے بند کر کے بھول گئے۔ آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ کھڑکیوں سے آنے والی روشنی ٹیڑھے میڑھے زاویے
بناتی ہوئی کال کوٹھڑی کو اور بھیانک بنا رہی تھی۔ میرے واہمے نے کوڑے کرکٹ میں جان ڈال دی۔ مجھے ہر
طرف سانپ اور بچھو اور اژدھے پھنکارتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ وہ گدوں کا ڈھیر کھسک کھسک کر
میری طرف بڑھنے لگا۔ چمکیلے دھات کے برتن بھوتوں کے سروں کی طرح مٹکنے لگے۔ رسیوں کے گچھے سانپوں کی
طرح کلبلانے لگے۔ بھوک اور بخار نے میرا دماغ مختل کر دیا تھا۔ اور در و دیوار عفریتوں کی طرح تھرکنے لگے۔
دوران سب کے بیچ میری ماں کی ناشپاتی کے پیڑ سے لٹکتی لاش جھولنے لگی۔ ایک دم میری گھگی بندھ
گئی اور حلق پھاڑ کر میں چیخنے لگی۔ میری انگلیاں اینٹھ گئیں اور دانت بھنچ گئے اور میں کال کوٹھڑی
کے سارے سامان کے نیچے دب گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کال کوٹھڑی کے بجائے تندور کے پاس چٹائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ موٹی ماما میرے حلق
میں چائے کا عرق ٹپکا رہی تھی۔

"ڈبیا میں نے چرائی ہے، میں نے چرائی ہے۔" ——— میں نے ہوش میں آتے ہی کہا۔ مگر میں جھوٹ بول
رہی تھی۔ نسوار کی ڈبیا تو بہو کے گدے کی تہوں میں سے مل گئی تھی جہاں انہوں نے بھولے میں رکھ دی تھی۔
اور بھولے سے مجھے موت سے ہمکنار ہو کر لوٹنا پڑا۔

دسویں برس میرے کوٹھے کر دیئے گئے۔ ایک چھوٹا سا کاشتکار کچھ سو روپے دے کر مجھے خرید لے گیا
کیونکہ اس کی ایک بیوی بھاگ گئی تھی اور دوسری مر گئی تھی اور ماں بڑھیا تھی۔ بیل بھی بک چکے تھے، اور میرا
نیا خریدار بالکل کنارے پر کھڑا تھا۔ کوئی دم میں پیر پھسل کر وہ بھی ہماری ہی صف میں آنیوالا تھا۔ میرے
نئے خریدار کا کھیت پاس کے گاؤں میں تھا۔ مجھے خرید کر اس نے وہ سامان جو ہاٹ سے خریدا تھا میرے سر پر لادا
اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ یہ میری شادی یا جو چاہو اسے کہہ لو۔ ہم جیسوں کی اسی طرح شادی ہوا
کرتی تھی۔ اور مجھے اپنے اوپر ذرا بھی ترس نہ آیا اور نہ حیرت ہوئی۔

بہو جی کی بجائے مجھے اپنی ساس کی سیوا میں جٹ جانا پڑا۔ بڑھیا افیون کی لت میں گرفتار تھی۔ ویسے
تو اونگھا کرتی، بس مجھے مارنے کو چونک اٹھتی۔ میرے کپڑے چونکہ چھوٹے اور اٹنگے ہو گئے تھے۔ لہٰذا میری مری ہوئی
سوت کے کپڑے مل گئے۔ پرانا میلا یہ ایک جوڑا میں گرمی جاڑے پہنتی۔ جاڑوں میں اس میں روئی بھر جاتی اور
گرمیوں میں روئی نکال کر پہنتی۔ بیل کی جگہ کبھی میں اور کبھی میرا خریدار کام کرتے۔ مگر وہ بھی نشہ کا عادی تھا۔ اس
بیٹے فصل کی فصل افیون کی نذر کر دیتے اور مزے سے پینک میں پڑے رہتے۔ مجھے مارتے پیٹتے اگر کھانے میں

ذرا بھی تنگی ہوتی۔

میں مشکل سے تیرہ چودہ برس کی تھی کہ میرے خریدار نے حقِ شوہریت جتانے شروع کر دیئے میں اسے خریدار کیونکہ وہ مجھے خرید کر لایا تھا۔ میرا قانوناً مالک تھا۔ ایسا ہی جیسا اپنے مرنے والے بیل کا۔ اس نے مجھے استعمال کے لئے خریدا تھا۔ ایسے ہی جیسے وہ افیون خریدتا تھا۔ وہ خریدار ہی تھا میرا شوہر نہیں تھا۔ شوہر تو اور ہی کچھ ہو وہ جسے چاہنے اور اپنے کو سپرد کرنے میں لطف آئے، جس کے وجود سے غم اور دکھ ہلکے ہو جائیں جس کا بوجھ کی نعمت معلوم ہو، جس کے غم اپنے غم بہلا اور جس کی مسرتیں اپنی راحتیں ہوں، دوست رفیق بلکہ اس سے آگے دل و دماغ کا ساتھی، جسم کا رکھوالا اور چاہنے والا، جس کے پیار میں دین دنیا کی لذتیں ملیں۔

مگر وہ تو میرا ظالم خریدار تھا۔ وہ جب کبھی میرے قریب آنے کی کوشش کرتا، میں مرکھنی گائے کی طرح مقابلہ کرتی۔ وہ پینک میں جھومتا میرے پیچھے دوڑتا۔ گھر میں دھما چوکڑی مچتی۔ عمر کا ذرا پکا تھا۔ جلد ہی ہا لگتا اور ماں کی مدد طلب کرتا۔ تب دونوں مجھے مرغی کی طرح ڈربے میں گھیرتے مگر میں کبھی کھپریل پر چڑھ اور کبھی پیڑ پر جا بیٹھتی۔

وہ مجھے زیر بھی نہ سکتا تھا کیونکہ ان ہی دنوں اس کی زمین قرق ہو گئی تھی۔ اور مجھے نئی کھلنے والی کے ملبوں کی فیکٹری میں نوکر کرا دیا تھا۔ میری مزدوری ہی سے ماں بیٹے کا کھانا اور افیون چلتا تھا۔ وہ خود بھی آس پاس کے کھیتوں سے چرا لاتا تھا، اور بڑھیا مہذب طریقے پر بڑے گھروں سے خیر خیرات مانگ لاتی تھی مگر کمبخت کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ میں ایک دن پکڑی گئی۔ ماں کی لٹکی ہوئی لاش کے بعد یہ دوسرا زخم میرے دماغ پر لگا اور میں نے اور دوسرے زخموں کے ساتھ اس کو بھی جھیل لیا۔ اوپر سے مصیبت آئی۔ یہی ام پیٹ میں بچہ آ گیا۔ اب تو ماں بیٹے بہت ہی سٹ پٹائے۔ روزی کے لالے پڑتے نظر آئے۔ ان دنوں مزدو کی حفاظت کے کوئی قانون نہیں تھے۔ فیکٹری کے مالک جب چاہتے بہانہ کر کے مزدوروں کو نکال د حاملہ عورتوں کو انہیں چھٹی معہ تنخواہ دینی پڑتی تھی۔ اسی لئے وہ کسی بہانے سے انہیں زچگی کے وقت سے پہلے ہی نکال دیتے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ حمل کا راز کسی کو نہ بتاؤں۔ مگر جب دن چڑھے تو چھپانا مشکل میری ساس نے مجھے پیٹ پر کس کر پٹی باندھنے کو کہا تاکہ کچھ دن اور کام چل جائے۔ پھر عین زچگی کا زما جائیگا اور مجبوراً معہ مزدوری چھٹی دینی پڑے گی۔ مگر جب ٹیڑھے سر کا مردہ بچہ قبل از وقت پیدا ہوا تو بھانڈ پھوٹ گیا۔ ملبوں کا بکس اٹھاتے ہوئے میں گر پڑی اس وقت تو کچھ نہ ہوا مگر چھٹی کے بعد جب گھر لوٹنے لگی تو سڑک ہی پر بیٹھ جانا خون میں نہائی ہوئی میں اپنی ساتھیوں کے ساتھ بمشکل گھر پہنچی اور دو مہینے تک پڑی ایڑیاں رگڑتی رہی۔ موت تو میری پروردگار کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ لوٹ پوٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اور کھڑا ہونا ہی پڑا کیونکہ بھیک اور چ

انی میں سے وہ دونوں مجھے کچھ نہ دیتے تھے۔ کسی طرح میں ان کی جوٹھن کھا کر جیتی رہی اور پھر کام پر جانے لگی۔
ابھی پچھلے سال جب میرا لڑکا پیدا ہوا تھا تو میں دو ماہ پہلے سے چھٹی لے کر زچہ بچہ کے بارے میں کلاسیں
یا کرتی تھی۔ مجھے زچگی الاؤنس ملتا تھا۔ نرسنگ ہوم میں بہترین خوراک اور گرم کپڑوں کا انتظام تھا۔
جنم دینا مصیبت نہیں، اچھا بھلا عیش تھا۔

اس بھاگ دوڑ کے باوجود کچے پکے گیارہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے دو سخت جان تھے۔ سو مرنے سے
ے۔ کتنی نفرت تھی مجھے بچوں سے۔ روح کانپتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ خریدار کے بچے، خواہ اپنے ہی جسم
ہوں، ان سے نفرت ہی ہو گی۔ اور اس زمانے میں تو ہم میں حیوانوں جتنی مروت بھی نہ رہ گئی تھی۔ زندگی
کلوں نے ممتا جیسے مقدس جذبے کو بھی کچل ڈالا تھا۔ حالات اور بھی بگڑ گئے جب جاپانیوں نے ہمارے
کی ساری دولتوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ میری فیکٹری بھی دشمن کے ہاتھ آ گئی اور ہمارے اوپر پہلے سے
سختیاں ہونے لگیں۔ ہماری یونین توڑ دی گئی۔ جلسہ میٹنگ پر پابندی لگ گئی۔ ہماری مزدوری نئے نئے
ے نکال کر کاٹ لی جاتی اور کسی قسم کا احتجاج کرنے کا حکم نہ تھا۔ جو لوگ نافرمانی کرتے ان کی سزا موت
لک پر خوف و ہراسانی کا راج تھا۔ فوجی دستے کی نگرانی میں فیکٹری چلائی جاتی اور وہاں زندگی میں
ہوں نے خاموش پوشیدہ جدوجہد کا راز معلوم کیا۔ ہم بغیر میٹنگ کئے اشارے کنائے سے ہی بات
ے اور دشمن کو نقصان پہنچانے کی ترکیبیں سوچ کر بالکل انجان بن کر ان پر عمل کرتے۔ ہمارا لیڈر کون تھا
ی خبر نہ تھی، مگر ہم بڑی استادی سے مال خراب کر دیتے، مشین توڑ دیتے۔ اور ہمارا کوئی قانوناً کچھ بگاڑ
تا۔ کھلے اسٹرائک کی اجازت نہ تھی مگر ہم جب تک اپنی بات نہ منوا لیتے چین نہ لیتے۔ کتنے ہی لوگوں کو
ر غلط سزائیں بھی دیں مگر نہ ہمارے سرغنہ کا پتہ چلا اور نہ ہماری جدوجہد رکی۔ بڑھیا مجھے کتنی ہی
یاں دیا کرتی مگر غدار نہ تھی۔ وہ چھوٹی موٹی چوری اور بھیک سے نہ شرماتی تھی مگر اسے دشمن سے بڑی
تھی۔ وہ روز مجھے گالیاں دیتی کہ اگر میں نے دشمن کے سپاہیوں یا جمعداروں سے آنکھ لڑائی تو وہ میرا خون
لی۔ کھلے بندوں میں انھیں گالیاں اور کوسنے دیا کرتی۔ ایک دن ایک گوریلا گرفتار ہو گیا اور اس
ہ دینے والے سر بازار زکیں دے دے کر مارے گئے۔ بے حس بڑھیا کو ان کی تکلیفوں سے بہت
لی۔ سوکھی ماری افیونی بڑھیا سامنے بیٹھی منہ بھر بھر کر گالیاں دیتی رہی۔ تھوڑی دیر تک تو ظالم
رہے پر کسی نے اس کے ٹھوکر ماری جس پر اس نے بڑا سا پتھر دے مارا۔ پتھر کسی کے بھی نہ لگا مگر نجات دہ
م میں آ گئے ایک سپاہی نے بندوق کے کندے سے سر کچل کر مار ڈالا۔

بڑھیا کے مرنے سے میرا خریدار کچھ دنوں سڑکوں پر پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرا۔ پھر نہ جانے کہاں

غائب ہو گیا ـــــ اور دو بچوں کے ساتھ میں دنیا میں مقابلہ کرنے کو رہ گئی۔

بڑا بچہ پانچ برس کا تھا اور چھوٹا ڈیڑھ سال کا۔ آخری تحفہ وہ میرے پیٹ میں چھوڑ گیا جسے ختم کرا
میں نے بہت جتن کئے مگر وہ تو جیسے جونک کی طرح میری جان کو چمٹا ہوا تھا۔ ایک جاہل دائی نے کچھ ایسے
کہ بچہ تو ضائع ہو گیا پر میرے نلے سُوج گئے، اور ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا، اور میں بستر پر پڑ گئی۔ کیسا
کا زمانہ تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ آئے دن لوگ شمال کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں ہماری قومی حکومت
تھی۔ میں بیمار پلنگ پر پڑی فاقوں کا مقابلہ کیا کرتی ـــــ پہلے تو میں نے گھر کے ٹوٹے پھوٹے برتن بیچ
چاول کا انتظام کیا۔ پھر جو کپڑے بیمار ہونے کی وجہ سے جسم پر نہ تھے وہ بیچے مجھ میں تو ہلنے کی بھی طاقت
بڑے بچے کو چیز بیچنے کو دیتی۔ کبھی تو کوئی اللہ کا بندہ کچھ دے دیتا، کبھی کوئی کم بخت مار کر دیسے
سے چھین لیتا۔ پھر چاول ابالنے کے لئے پانچ برس کی جان سے میں لیٹے لیٹے کام کرواتی۔ بچہ ہی تو تھا
وقت جان چرا کر بھاگ جاتا تو میں اسے کسی بہانے سے پکڑ کر ٹانگ میں رسّی باندھ دیتی جو اس سے نہ کھلتی
کبھی وہ شرارت کرتا میں رسی سے اس کی ٹانگ گھسیٹ کر خوب مارتی۔ میرا پانچ برس کا بچہ جس کے
کودنے کے دن تھے، میری غلاظت اٹھاتا، گندے چیتھڑے دھوتا اور میرے اور اپنے لئے چاول
مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ میرے اٹھتے ہی وہ پڑ گیا اور تین دن میں چٹ پٹ ہو گیا۔
بیماری موت کا ہی پیغام لاتی تھی۔ گنتی کے چند لوگوں کے سوا باقی یا تو لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے یا م

آج جب شام کو ہم سب گھر میں جمع ہوتے ہیں، میں دفتر سے لوٹتی ہوں تو بھرے پُرے گھر
آگ کے گرد جمع ہو کر کہانیاں سناتے ہیں، گانے گاتے ہیں بچے اسکول کا کام کرتے ہیں۔ میں گھر کی دیکھ
ہوں۔ گھر میں سکون اور مسرت کی افراط ہوتی ہے تو مجھے بے اختیار ان بچوں کے درمیان اپنا ننگا بھوکا
و نادار مرنے والا بچہ یاد آجاتا ہے۔ میں اُسے کچھ بھی تو نہ دے سکی۔ تو پھر مجھے جنم دینے ہی کا کیا حق تھا
فاقہ اور موت کے اس کی ماں کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔

ماں کی جھولتی ہوئی لاش کے ساتھ مجھے اس کی ننھی سی اکڑی ہوئی لاش دکھائی دیتی ہے تو میں بے
ہو جاتی ہوں ـــــ"

جھیل ویسی ہی پرسکون تھی۔ ناؤ کنارے کنارے چل رہی تھی۔ کنارے پر جھکے ہوئے ناشپاتی اور
کے پیڑوں سے شگوفے ٹپک کر سطح پر ہلکورے لے رہے تھے۔ جھیل کے سینے پر تین انسانی محنت کے
ہوئے جزیرے تین گلدستوں کی طرح تیرتے معلوم ہو رہے تھے۔ کشتی بان متحیر نظروں سے میری دا
کو گھور رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کا نغمہ سہم کر خاموش ہو چکا تھا۔ ماضی کے اس خونچکاں وقت کو دہ

ھوں سے بڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھیوں کی کشتیاں پل کے نیچے سے دھیرے دھیرے جھیل کے دوسرے
اتر رہی تھیں۔ میری داستان گو نے آنکھیں جھپکا کر آنسوؤں کو جھٹک دیا اور مسکرا پڑی۔
"دراصل مرنے والا دور نہیں گیا۔ وہ اب میری گود میں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ سوکھا مارا نہیں گول
"

یں قطعی اس کے فلسفے کو نہیں سمجھی!
میرا سب سے چھوٹا بیٹا بالکل مرنے والے کی تصویر ہے۔ شگفتہ اور حسین تصویر جو کچھ میں مر تو والے
سکی اس کو میسّر ہے۔ ماں باپ کا پیار، مفید غذا، تعلیم و تربیت۔ اور جب میں ان بچوں کو نرم گرم
یں سوتا ہوا دیکھتی ہوں تو منوں مٹی کے نیچے دبا ہوا ٹھنڈا جسم بھول جاتی ہوں۔ اور کر بھی کیا سکتی
وائے اس کے کہ جس مٹی میں وہ سویا ہوا ہے اس سے سونا اگاؤں اور اپنے ملک کے سب بچوں کو نرم گرم بچھونوں
ں۔ جب ہی تو میں ڈبل شفٹ پر کام کرتی ہوں!"
"اور تمہارا شوہر؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔
"وہ کپڑے کی مل میں مزدور ہے۔ ہماری ملاقات لوکل میٹنگ میں ہوئی۔ اور میں نے زندگی میں پہلی
کے معنی سمجھے۔ گیارہ بچوں کو دفن کرنے کے بعد میں نے زندگی کا ساتھی پایا۔ گیارہ میں سے میرا چھوٹا بچہ
جواب اسکول میں پڑھتا ہے۔ آزادی ملنے کے چند مہینے بعد ہی ہم نے شادی کر لی۔ میرے تین بچے اور
ے ———"

"ابھی اور بچے پیدا کرنے کا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔
"کیوں نہیں۔ اب تو کہیں جا کر مجھے بچے پیدا کر کے پالنے پوسنے کا دلچسپ کھیل ملا ہے۔ میری عمر تو ابھی
رس بھی نہیں۔ ابھی تو میں کئی اور بچے پیدا کروں گی ———" اس نے بالکل ایسے کہا جیسے بچے پیدا کرنا
زین مشغلہ ہو۔
ہماری کشتی پل کے نیچے سے گزر کر جھیل کے دوسرے حصے میں پہنچ گئی جس کے کنارے ہماری قیام گاہ
شتی کنارے پر لگتے ہی شگفتہ کے پھولوں کی بے پناہ بارش ہونے لگی کہ ہماری گودیں بھر گئیں۔ اس نے اپنے گود کی
یں سمیٹ کر میرے آنچل میں ڈال دیں۔
"آج سے تم میری بہن ہو۔ ہم اپنے پیاروں کی گود پھولوں سے بھرا کرتے ہیں۔ جب تم اپنے دیس میں چلی جاؤ گی تو
اتنی بار یاد کروں گی جتنی تمہارے آنچل میں پنکھڑیاں ہیں۔"
میں نے پھولوں سے بھرا آنچل سنبھال لیا اور کشتی سے اتر آئی۔ میں نے ان پنکھڑیوں کو گنا نہیں کیونکہ محبت گنتی
ار کی حدوں سے آزاد ہے!

دیوندر ستیارتھی

عید سے پہلا دن

اگلے روز عید تھی اور لوگ خوش تھے۔ جب لاری چل پڑتی تو اُمس ذرا کم ہوتا اور لاری میں بیٹھی ہوئی سواریوں کو یوں محسوس ہوتا کہ طبیعت ذرا سنبھل گئی۔ ہوا مسافروں کا حال پوچھنے لگتی — خوش تو ہو، عید آتی ہے تو خوشیاں لاتی ہے۔ لاری کئی جگہ رکی۔ جتنے لوگ راستے میں اترتے اس سے کچھ زیادہ ہی سوار ہو جاتے۔ ویسے گرمی کے مارے سب پریشان تھے۔

کئی کئی بار انجن چلتے چلتے ایسا رکتا کہ آدھ آدھ گھنٹے تک ڈرائیور ایک تجربہ کار موٹر مکینک کی طرح اُچھل اُچھل کر انجن کے کل پرزوں کا معائنہ کرتا۔ لوگ رحمان پیر سے دعائیں مانگتے کہ کسی طرح لاری منزل تک لے جائے۔ آخر وہ رحمان پیر کے مزار پر ہی تو جا رہے تھے، اور رحمان پیر تو اپنے زمانے کے بہت بڑے سخی پیر ہوئے تھے۔ اللہ کے پیارے۔ بچوں سے تو رحمان پیر بہت خوشی سے پیش آتے تھے۔ اسی لئے رحمان پیر کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں سننے کو ملتیں کہ لوگ وجد میں آ کر انہیں ایک دوسرے کو سناتے اور کوشش کرتے کہ رحمان پیر کی تصویر کھینچ کر کھڑی کر دکھائیں۔ پیر تو بہت ہوئے تھے لیکن لوگوں کو تو وہی پیر پسند تھا جو اُن سے محبت کرتے کرتے اللہ کو پیارا ہوا۔ عید سے پہلے دن رحمان پیر اللہ کو پیارے ہوئے تھے اور اسی لئے اسی روز رحمان پیر کے مزار پر میلہ لگتا تھا۔ ہر سال جب ارد گرد کے دیہاتوں ہی نہیں، دور دور سے لوگ رحمان پیر کے مزار پر چلے آتے تھے۔

پچھلی سیٹ پر ایک پورا کنبہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ لوگ بھی رحمان پیر کے مزار پر جا رہے تھے اور پہلی بار جا رہے تھے۔ بڑی بیٹی بار بار پوچھتی "اب کتنی دور رہ گیا رحمان پیر کا مزار۔"

"اب رحمان پیر کے مزار پر جا کر رُکے گی لاری۔" کنڈکٹر جواب دیتا۔

"امی جان میں تو تنگ آ گئی گرمی کے مارے۔" پچھلی سیٹ والی لڑکی نے جھنجلا کر کہا۔

"مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ لاری میں اتنی تکلیف ہو گی تو کبھی تمہیں پیر کے مزار پر چلنے کی صلاح نہ دیتی۔"
شاید اس لڑکی کی قمیص بغل کے قریب تنگ تھی۔ وہ بار بار قمیص کو کندھے سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی، لیکن اس سے اُس کی پریشانی اور بڑھ جاتی۔ اس کی ارغوانی شلوار پر دودھیا سفید قمیص کی پھبن

تی۔ سفید دوپٹہ تہہ کر کے اس نے سر پر کچھ اس طرح لے رکھا تھا کہ دونوں کان ڈھک گئے تھے اور اس کی چوٹی کا کچھ حصہ بھی اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن نے صندلی رنگ کے پانچ کلی کے غرارے پر زری کی والا جمپر پہن رکھا تھا۔ اور لال دوپٹے کی بُکل مارے لاری کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی شکل رہ چودہ برس کی ہوگی۔ دونوں بہنوں کا ایک بھائی تھا جو سات برس کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سر پر سلمے کی ٹوپی نے رنگ باندھ رکھا تھا۔ تین بچوں کی ماں بھی تو کچھ کم ٹھاٹ کا لباس پہن کر نہ نکلی تھی۔ تین کی زری کی گوٹ والی فیروزی قمیص اور انگوری رنگ کے ریشم کی شلوار اور اشرفی کی کریپ کا دوپٹہ۔ ں میں جڑاؤ کنگن اور گلے میں چندن ہار۔ ویسے اس نے برقع لے رکھا تھا، لیکن وہ برقعے کو اوپر ئے لاری کے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔

منجھلی لڑکی کھڑکی سے منہ ہٹا کر ماں کی طرف دیکھنے لگتی تو اس کی ناک میں کنول کے سونے کی کیل چمک ی اور ماں پیار سے اس کا منہ چومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی ــــــ "اب رحمان پیر کا مزار دور نہیں"۔

بڑی لڑکی اپنے سادہ لباس میں بہت سنجیدہ نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ناحق ں سے ضد کی اور ناحق اس کی ماں نے اس کی بات مان لی۔ پیر کے مزار پر اسے کیا ملے گا؟ آخر وہ وہاں جا رہی ہے؟ وہاں اسے ایسی کیا غذا ملے گی کہ وہ واپس آ کر یہ سوچ سکے کہ وہ کچھ لے کر لوٹی ہے؟ کا جوڑا باندھنے کا انداز بھی بتا رہا تھا کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے اور اس کا شعور بہت سی منزلیں پار کر ہے۔ انگلیوں پر ٹھوڑی ٹیکے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ عید سے پہلے روز کی خوشی یوں کیا ہو جائیگی؟ اسکا پہلے کیوں پتہ نہ چلا۔ کیا عید کا یہی تقاضا تھا؟ عید سے پہلا روز یوں ایک کوفت بن کر آئے گا، اس ذرا بھی خبر ہوتی تو وہ لاری کے سفر کے چکر میں نہ آتی۔ لعنت بھیجو اس سفر پر! ــــــ

رحمان پیر کو اسی روز اللہ کے پیارے ہونے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ وہ 'ذخیر' پیدا ہوئے تھے تو لہذا انہوں نے اس دنیا سے کوچ کرنا ہی تھا لیکن ہم لوگوں کو کیوں اس مصیبت میں ڈال گئے؟ اب مزار پر ہر سال میلہ لگتا ہے۔ ہر سال سینکڑوں لوگ اُمس اور گرمی میں ان کے مزار پر جاتے ہیں۔ میلہ بھی ا ہوتا ہوگا، میں سب سمجھتی ہوں۔ لعنت بھیجو ان میلوں ٹھیلوں پر! لعنت بھیجتی ہوں اپنی عقل پر! آخر ے ہی تو منجھلی بہن کے کہنے پر ماں کو صلاح دی تھی کہ رحمان پیر کے مزار کا میلہ دیکھا جائے۔

بھیڑ کے مارے سچ مچ برا حال تھا۔ سورج بھی جیسے آج ہی سب سے زیادہ آگ برسانے پر تُل گیا بھارت جیسے کہیں رستہ بھول گئی تھی۔ کچھ دن تک تو زور کا برسا اور دریا میں طوفان آ گیا۔ آس پاس کے بت کے گھروں میں پانی گھس گیا اور بیچارے گاؤں والے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔ اور اب تو

گرمی کا یہ حال تھا جیسے ایک دن کے لئے بھی بادل نہ برسا ہو۔

"کس نے بنایا تھا رحمان پیر کا مزار؟" ایک سفید بالوں والا بڈھا اپنے کالی ڈاڑھی والے پوچھ رہا تھا۔ "میاں جمّاں، تم جانتے سب ہو، بس ہمیں کیوں نہیں بتاتے؟"

"میں بھی پہلی بار چل رہا ہوں رحمان پیر کے مزار پر۔" جماں نے ہنس کر کہا: "مزار سے پوچھ لیں گے کہ بتا کے مزار تجھے کس نے بنایا اور کب بنایا۔ صادق میاں! اب میں خود بھی نہیں جانتا تو تمہیں کیسے بتاؤں؟"

"مزار کیا بول سکتا ہے، میاں جماں؟" صادق نے پھر کہا۔ "مشکل سے کرایہ پورا کیا۔ سوچا لوگ مزار کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں تو کچھ تو ہوگا مزار ہمارے رحمان پیر کا اور پھر یہ عید سے پہلا دن۔ عید پر تھوڑا خرچ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں صادق میاں! عید تو عید ٹھہری۔"

"پیر کا مزار پیر کا مزار ٹھہرا۔ میلہ پسند نہ آیا تو سمجھ لیں گے کہ بٹوہ گم ہوگیا۔ ارے میاں، دو چار روپے کا ہی ہیر پھیر ہے۔"

"دو چار روپے کیا یونہی آجاتے ہیں، صادق میاں؟ لیکن تم ٹھہرے ہمارے لنگوٹیے۔ ہم تمہاری مان گئے کہ زندگی کا کیا بھروسہ۔ مرنے سے پہلے رحمان پیر کا مزار چل کر دیکھ آئیں تاکہ اللہ میاں کے سامنے ٹھیک جواب دے سکیں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ جب انسان اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے تو اللہ پوچھتا ہے کہ بتا رحمان پیر کا مزار دیکھا تھا یا نہیں۔ تو میاں، اب اللہ کے سامنے ہمیں جھوٹ تو نہ بولنا پڑے گا۔ ہم کھل کر کہیں گے۔ ہاں ہاں اللہ میاں! ہم نے رحمان پیر کا مزار دیکھا اور خاص عید سے پہلے روز کے میلے کے دن دیکھا، جب سینکڑوں لوگ میلے پر آتے ہیں۔"

کنڈکٹر نے چلّا کر کہا۔ "وہ سامنے رہا پیر کا مزار۔ ارے آج تو ٹھاٹ کا میلہ بھر رہا ہے!"

"ہم پہنچ گئے، امی جان!" پچھلی سیٹ سے بڑی لڑکی نے خوش ہو کر کہا اور اپنے سفید دوپٹے کو سر پر اور کس لیا۔ میلہ آگیا۔

"میلہ آگیا!" منجھلی بہن نے تالی بجائی۔ اس کے لال دوپٹے کی بکل کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

"اللہ رکھے بیٹیو! میں قربان!" ماں نے جھک کر اِدھر اُدھر دیکھا، اور اپنے اشرفی کی کریپ کے دوپٹے کے پلّو کو سنبھالا۔ "عید سے پہلا دن ہے۔ موج سے میلہ دیکھنا بیٹیو!"

چھوٹے بھائی نے بہنوں کی طرف دیکھا اور پھر ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں — "اللہ تیری عمر میں برکت دے ہزاری بیٹا!"

اب لاری اڈے پر پہنچ چکی تھی ۔ سواریاں نیچے اتر رہی تھیں ۔ جمّاں اور صادق نے نیچے اتر کر
اِدھر اُدھر دیکھا ۔ دُور سے میلے کی بھیڑ دیکھ کر صادق نے کہا ۔" میاں جمّاں ! ماشاء اللہ میلہ تو بڑا رج
رجاؤ والا ہے ! "

" رج رجاؤ والا کیوں نہ ہوگا ، رحمان پیر کے مزار کا میلہ ہے صادق میاں ! " جمّاں نے پلٹ
کر کہا " بول میں کچھ جھوٹ کہتا تھا کہ عید سے پہلا دن تو پیر رحمان کے میلے میں گزارا جائے ۔"

" اللہ رکھے میرا کبوتر بچہ ! " پچھلی سیٹ سے اٹھتے وقت ماں نے بیٹے کی سلمے ستارے کی ٹوپی ٹھیک
کرتے ہوئے کہا ۔ " بڑے آرام سے اترنا بیٹا ! "

بڑی بہن بولی ۔ " آرام سے اترنا منجھلی ! موچ نہ آجائے ۔ "

" مجھے سب عقل ہے آپا ! " منجھلی نے پلٹ کر قہقہہ لگایا ۔ " پہلے میں اتروں گی لاری سے ۔ "

" پہلے اترو چاہے پیچھے ۔ " ماں نے ہدایت کی ۔ " آرام سے اترنا منجھلی ! "

" آپا مجھے مرغی بچی سمجھے جا رہی ہے امی جان ! اپنے کو سمجھے ہے بلبل بچی ! " منجھلی نے تاؤ میں آکر
کہا ۔

لاری سے اترتے وقت ماں کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا پہلے آپا اتری ، پھر چھوٹا بھائی ، پھر
منجھلی اور سب سے پیچھے ماں جس پر سب کی رکھوالی کی ذمہ داری تھی ۔ نیچے اتر کر اس نے ناک پر انگلی رکھ
کر منجھلی کو سمجھایا کہ آپا کا ادب کرنا ضروری ہے ۔

" آپا کی عقل تیڑھی ہے ماں ! " منجھلی نے گال پھلا کر کہا ۔

" تیری عقل تو سیدھی ہے نا ! " آپا نے ڈانٹ بتائی ۔

" اللہ رکھے بیٹیو ! تم تو بلیوں کی طرح لڑنے لگیں ۔ ارے آج عید سے پہلا دن ہے ۔ عید کی خوشیاں
کیا کہیں گی تم لوگوں کو ۔ ارے بھئی تم تو بول بول کر لڑائی کے گھنگھلے پکار رہی ہو ۔ اللہ رکھے کریلا کھا کر تھوڑی
آرہی ہو کہ زبان سے اتنی کڑوی بات کہتی ہو ۔ "

منجھلی کی تنی ہوئی رگیں برابر تنی رہیں ۔ آپا نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا ۔ " ایسی بھی کیا ناراضگی ہے
منجھلی ؟ لاری میں تو خیر گرمی کے مارے دم گھٹا جا رہا تھا ، اب تو کھلی ہوا چل رہی ہے ۔ "

" ہم نہیں بولتے تمہارے ساتھ ۔ " منجھلی بڑبڑائی ۔

" اللہ رکھے کیا بتی لانگھ کے آرہی ہو منجھلی ؟ " ماں نے ڈانٹ بتائی ۔ " آپا سے اس طرح نہیں کہا کرتے ۔ "
سڑک کے ساتھ ساتھ درختوں کے نیچے یہ پورا کنبہ رحمان پیر کے مزار کی طرف جا رہا تھا ۔ کچھ لوگ ان

کے پیچھے آ رہے تھے ، کچھ آگے جا رہے تھے ۔ سب کی زبان پر تھا رحمان پیر کا نام ۔ سب خوش تھے ۔ سب کی طبیعت ریشم کی طرح ملائم ۔ کچھ لوگ قہقہے لگا رہے تھے ۔ کچھ مارے خوشی کے کپتے ہوئے جا رہے تھے ۔ غم اور فکر جیسے کہیں بہی تان کر سو رہے ہوں ۔ کھانے پینے ، پہننے اوڑھنے کی باتیں ہی جیسے زندگی کے نکھار کی باتیں ہوں ۔ عید سے پہلا دن تھا ۔ کوئی کباب کی تعریف کر رہا تھا اور کوئی روغن جوش کے چکر میں تھا ۔ آج تو رسیاں توڑ کر بھی کباب تک ہاتھ بڑھایا جا سکتا تھا ۔ آج تو پہیلیاں بوجھنے کی فرمائش کے بجائے کھانے پینے کی بات ہی مزہ دے سکتی تھی ۔ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا عید سے پہلا دن ۔ سب مصنوعی باتیں پیچھے چھوٹ گئی تھیں ۔ میلہ روز روز تو نہیں آتا ۔ پھر یہ رحمان پیر کا میلہ ۔ عید کی خوشی تو سرپٹ دوڑتی ہے ، ہچکولے نہیں کھاتی ۔

مزار پر قوالی کا دور چل رہا تھا ۔ ویسے تو قوالی رنگ آپا کو پسند تھا ، لیکن کیا وہ اتنی دور سے گرمی میں قوالی سننے آئی تھی ۔ قوالوں کو بہت سے لوگوں نے گھیر رکھا تھا ۔ سننے آنے والوں میں سے بھی بہت سے لوگ ان کے گرد گھیرے میں بیٹھتے جا رہے تھے ۔ آپا جھنجلا کر بولی ۔ "امی جان ! ہم یہاں نہیں رکیں گے ۔ پہلے میلے کا بازار دیکھتے ہیں چل کر ۔"

منجھلی اس رائے سے بہت خوش ہوئی ۔ "آپا ٹھیک ہی تو کہتی ہے امی جان !"

"تم کیا کہتے ہو چھوٹے ؟" ماں نے بیٹے سے پوچھا اور پیار سے اس کی سلمے ستارے کی ٹوپی پر ہاتھ رکھ دیا ۔

"مجھے بتاشے لے دو گی امی !" چھوٹے نے مسکرا کر کہا ۔

"بتاشے بھی لے دوں گی اور کباب بھی" ماں نے پیچھے کی طرف الٹے ہوئے برقعے کے نیچے اشرفی کی کریپ کے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے کہا ۔ "اللہ رکھے ، چھوٹے کو خوش کروں گی آج ۔"

منجھلی پھر رُوٹھ گئی ۔ "اے ہے تجھے چھوٹے کی خوشی بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی ، منجھلی ! نیک بخت یوں نہیں روٹھا کرتے ـــــــ"

"عید سے پہلا دن تو قہقہے مانگتا ہے ، منجھلی !" آپا نے نصیحت کی ۔

"تم اسے کچھ نہ کہو چھوٹے کی آپا ۔" ماں نے ہنس کر کہا ۔ "ہماری منجھلی صاحبزادی تو میری بات مانے گی ۔"

"منجھلی کے ساتھ میری کوئی لڑائی تو نہیں ہے امی جان !" آپا نے صفائی پیش کی ۔

"اے ہے ، بس چپ بھی رہ چھوٹے کی آپا !"

آپا بہت جھنجلائی ۔ یہ میلے پر آنے کا کونسا ٹھاٹ ہے ؟ آگے آگے چھوٹا چلا جا رہا تھا ۔ اس کے پیچھے منجھلی ہولی ۔ پھر ماں ، اور سب سے پیچھے آپا ۔ ماں نے یہ ضروری سمجھا کہ منجھلی اور آپا کے بیچ آ جائے تاکہ دونوں بہنوں میں نوک جھونک نہ ہونے پائے ۔

"ارے چھوٹے کی آپا !" ماں نے مچل کر کہا " ہماری منجھلی کو تو غضب کا دولہا ڈھونڈھ کر دیں گے ۔"

"میں کہتی ہوں اسے چوپٹ دیدوں والا دولہا ملے گا ۔" آپا نے طعنہ دیا ۔

"تجھے ملے چوپٹ دیدوں والا دولہا " منجھلی نے الٹا وار کیا ۔

" اے ہے ، کیا ہو گیا ہے ان لڑکیوں کو " ماں جھنجلائی ۔ "ایسے لڑتی ہیں جیسے خدا واسطے کا بیر ہو۔ [illegible]ندیہ کیسا زمانہ آگیا ؟ ہمارا بھی زمانہ تھا ۔ چھوٹی بہن کبھی بڑی بہن کے منہ نہیں آتی تھی ۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں " آپا بولی ۔ "منجھلی کو تو میرا ذرا بھی خیال نہیں رہتا ۔ جو منہ میں آتا ہے ، اُگل [illegible]تی ہے ۔"

"تو نخاس کی بچھیری ، اب تو ہی خاموش رہ جا ۔" ماں نے پیچھے پلٹ کر تیور دکھائے ۔

بازار میں بہت رونق تھی ۔ ماں نے چھوٹے کو بتاشے لے دیئے اور منجھلی کو کباب ۔ آپا بولی ۔ "میں کچھ [illegible]ہی لوں گی امی جان !"

ماں کو آپا کی یہ عادت پسند نہ تھی کہ ذرا سی ناراضگی سے کھانا پینا چھوڑ دو ۔ اس نے آپا کو بہت سمجھایا ۔ میلے [illegible]ہڑ اور لوگوں کا بے ہنگام شور ، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔ ماں کے اصرار کے باوجود آپا نے کچھ نہ لیا ۔ ایسے [illegible]ں اپنے لئے کباب کیسے خریدے ، یہ مسئلہ کافی ٹیڑھا تھا ۔

آپا کے چہرے پر تناؤ نظر آرہا تھا ۔ خدا کی پناہ ! ـــــ وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہاں اس میلے میں کیا رکھا ہے ۔ [illegible]ن پیر کا مزار ، ماشاءاللہ سب ٹھیک ہے ۔ رحمان پیر عید سے پہلے دن اللہ کو پیارے ہوئے ، یہ بھی ٹھیک ہے ۔ [illegible]ن پیر کے مزار پر قوالوں کی چاندی ہے ، یہ بھی ٹھیک ہے ۔ اس میلے میں بتاشے اور کباب بکتے ہیں ۔ ـــــ [illegible]یں ایسی خاص بات کیا ہے ؟ اس میلے میں ایسی کوئی بات نہیں جو میرے دماغ کی کنجی پھیر سکے ۔ اسے یہ میلہ سچ مچ [illegible]ہلوں کا مرقع لگا ۔ کچھ لوگ تو یوں گھوم رہے تھے جیسے کھونٹے سے چھوٹ کر آرہے ہوں ۔ ہر طرف دھول اڑ [illegible]ی تھی ۔ پھر بھی یہ لوگ سیر گشت کا مزہ لینا چاہتے تھے ۔ آپا کو ان لوگوں کی حماقت پر غصہ آرہا تھا ، اور اس سے [illegible]یادہ غصہ آرہا تھا اپنے اوپر ۔ تھان بدلی ہوئی بچھیری کی طرح وہ بڑی حیرت سے ادھر ادھر دیکھتی رہی ۔

"اے ہے اللہ رکھے بیٹی !" ماں نے بے دلی سے کوستے ہوئے کہا " پھر تو آئی کیوں تھی میلے میں اگر تو نے [illegible]ہ کھانے کی قسم لے لی تھی ۔ اے ہے تیرا جی نہیں چاہتا کہ کباب کھائے !"

"امی جان تم لے لو کباب ۔"

" اے ہے ، میں کیسے ڈال لوں منہ میں ، پھر یہ کباب تو ٹھنڈے ہو گئے ۔"

"مجھے تو نہیں چاہیئے ایک بھی کباب ۔"

لاچار ہوکر ماں نے ایک جگہ بیٹھ کر کباب منہ میں ڈال لیا ۔ وہ بہت بھوکی تھی ۔ اس نے بہت چاہا کہ آپا بھی شامل ہو جائے لیکن آپا کا تو دماغ چڑھا ہوا تھا ۔ گھر پر بھی تو اس کی یہی عادت تھی کہ بغیر مرضی کے کسی چیز کو منہ نہ لگاتی تھی ۔ کباب کھاتے کھاتے ماں نے سوچا کہ اللہ چھپر پھاڑ کر بھی ایسی اولاد کسی کو نہ دے جو ماں باپ کے کہنے میں نہ ہے ۔

چھوٹا اور منجھلی سڑک کی طرف چلے گئے' جہاں ایک درخت کے نیچے ایک غبارے والا کھڑا رنگا رنگ کے غبارے بیچ رہا تھا ۔ منجھلی نے چھوٹے کے لئے سبز رنگ کا غبارہ لے دیا جس پر ہلکی ہلکی سفید پھوار پڑی تھی اور بیچ میں ایک بچے کا چہرہ بھی دکھا یا گیا تھا ۔ منجھلی خوش تھی کیونکہ ماں نے اسے منہ سے بجایا جانے والا باجہ خریدنے کے لئے سات آنے دے دیئے تھے ۔ اس باجے پر وہ عجیب سا نغمہ الاپنے کی کوشش کرتی رہی ۔ چھوٹا اپنے غبارے سے نظریں ہٹا کر منجھلی کی طرف دیکھنے لگتا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ ایسی بھی کیا بات ہے ، اگر تم چاہو تو ابھی میرے غبارے کے ساتھ اپنا باجہ بدل سکتی ہو ۔

آپا نے دور سے چھوٹے اور منجھلی کو مچلتے اٹھلاتے دیکھا تو اور بھی جل بھن گئی ۔ میلہ تو چھوٹے اور منجھلی کے لئے ہے ، میرے لئے نہیں ۔ انہیں میری خوشی کی پرواہ نہیں تو میں بھی ان پر لعنت بھیجتی ہوں ۔ میں تو اس میلے پر بھی لعنت بھیجتی ہوں ۔ دور سے قوالوں کے گانے کی آواز اس کے دماغ سے ٹکراتی رہی لیکن اس کا غصہ تو بڑھتا ہی گیا یہ میلہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا ۔ استغفراللہ ، اب تو چلنا چاہیئے ۔ بھیڑ اور گرمی پر ہزار لعنت ، لاحول ——— توبہ توبہ ! اس کے دماغ میں عجیب الجھن تھی ۔ ماں سے کیا کہتی ۔ پنجرے میں پھنسی ہوئی چڑیا کی طرح اس کی طبیعت صدائے احتجاج میں کھو جانا چاہتی تھی ۔ عید سے پہلا دن اور خوشی یوں غائب ہو گئی جیسے ہرن کے سر سے سینگ غائب ہو جائیں ۔

" اے ہے ، تیری تو پڑھائی لکھائی پر بھی پانی پڑ گیا بیٹا ! " ماں نے جھنجلا کر کہا ۔ " دنیا خوش ہے بس تیرے اندر ہی آگ جل رہی ہے ۔ پرائے گھر جا کر بھی تو کون سا ہمارا نام روشن کرے گی ؟ منجھلی بھی تو تیری بہن ہے ۔ دیکھ کیسے مچل رہی ہے اور اپنے ساتھ چھوٹے کو بھی میلہ دکھا رہی ہے ۔ تو تو پیدا ہی نہ ہوتی تو اچھا تھا ۔ "

آپا کو بہت صدمہ پہنچا ۔ وہ کچھ نہ بولی ۔ اسے ڈر تھا کہ ماں گستاخی کا طعنہ نہ دینے لگے ۔ بس اس نے یہی فیصلہ کیا کہ چپکے چپکے غم کھا کر رہ جائے ۔ اس کے دل میں گرہ بندھتی گئی ۔ عید سے پہلا دن اور چھاتی پر مونگ دلنے کے لئے میلے کا شور جس میں قوالوں کی آواز الگ زہر میں بجھے ہوئے تیر چھوڑ رہی تھی ۔

" اے ہے اللہ رکھے ' تیرے لئے ٹھنڈا شربت لاؤں ، بیٹی ؟ " ماں نے قدرے نرم ہو کر پوچھا ——— " شربت سے تیرا جی اچھا ہو جائے گا ۔ گرمی بھی تو بہت ہے ۔ بادل نظر نہیں آتا ——— "

"شربت پی کر کیا کروں گی امی جان —" آپا نے جھٹ جواب دیا۔
ماں سمجھ گئی کہ بیٹی کی آواز میں ضد کا عنصر کم ہوگیا ہے۔ وہ سامنے کی دوکان سے اس کے لئے صندل کا شربت بنوا لائی۔ شربت پیتے ہی آپا کی طبیعت سنبھل گئی، اور وہ بولی " امی جان اب تو منجھلی اور چھوٹے کو بلا لو۔ چلو ذرا پیر رحمان کا مزار دیکھ آئیں۔"

چھوٹا اور منجھلی ماں کے بلانے پر دوڑتے ہوئے آگئے۔ اور آپا کے گرد ناچنے لگے —— اچھی اچھی آپا! اچھی اچھی آپا! نہ جانے انھیں گیت کی کڑی کی طرح یہ بول کہاں سے سوجھ گیا۔

آپا نے ہنس کر کہا۔" اچھی اچھی منجھلی! اچھی اچھی منجھلی!"

ماں نے شہ دی —" اچھا اچھا چھوٹا! اچھا اچھا چھوٹا!"

پورا کنبہ مزار کی طرف چلا جا رہا تھا۔ مزار پر جا کر ان کے پاؤں رک گئے۔ کوئی پیرزادہ پیر صاحب کے حالات زندگی اور ان کی تعلیم پر روشنی ڈال رہا تھا۔" پیر صاحب بڑے سخی انسان تھے۔ پھولوں سے ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ موتیا، چنبیلی، موگرا، سیوتی، گلاب —— انکو کون سا پھول پسند تھا، یہ بات کبھی انہوں نے کھول کر نہیں بتائی تھی۔ پیر بننے سے پہلے وہ بہت بڑے سارنگی نواز تھے ان کی سارنگی سن کر سننے والے خوشی سے جھوم جھوم اٹھتے ——"

ماں نے آپا کے کان میں کہا ——" اب تو بھی خوشی سے جھوم لے بیٹی!"

منجھلی بولی —" امی جان مجھے ایک کباب اور لے دو گی —— گرم گرم؟"

چھوٹا چلایا —" میں روغن جوش کے ساتھ کھاؤں کا روٹی گھر چل کر!"

"چپ بیٹا!" ماں نے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہا۔" کل عید ہے۔ کل ہمارے ہاں روغن جوش ہر صورت میں بنے گا۔"

پیرزادہ اپنی بات کہے جا رہا تھا۔" پیر رحمان کہا کرتے تھے کہ جیسے اچھا سارنگی نواز وہ ہے جو سارنگی سے کام لے، ویسے اچھا مرد وہ ہے جو عورت کو اپنے ساتھ چلائے۔ اسے راستے سے بھٹکنے نہ دے اچھا مرد وہ ہے جو بیوی سے کہے کہ بڑی بی ایسا سالن پکاؤ کہ ایک بار چکھنے سے بار بار ہاتھ لگانے کو جی چاہے۔"

آپا بولی ——" امی جان یہ تو اچھی تعلیم ہے۔ کل عید ہے۔ کل سے میں بھی اچھا سالن پکانا سیکھوں گی"

" اے ہے، اللہ رکھے بیٹی! میں تو ہمیشہ تجھے کہتی رہی کہ سالن پکانا سیکھ لے۔ آخر تجھے پرائے گھر جانا ہے ایک دن۔ آج نہیں تو کل۔"

پیرزادہ کہہ رہا تھا ——" پیر رحمان کہا کرتے تھے کہ روٹی گرم گرم ہی اچھی لگتی ہے اسی طرح

عورت وہ ہے جو اچھی بیوی ہے، اور اچھی ماں ہے۔ عورت نیک بخت ہو تو مرد خوش قسمت ہے۔ اچھی بیوی ہوگی تو اولاد بھی اچھی نکلے گی، جیسے اچھا موسم ہوگا تو طبیعت خود بخود ٹھیک ہو جائیگی۔"

ٹھنڈی ہوا چل پڑی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادل نظر آنے لگے تھے، جیسے یہ سب رحمان کی مہربانی کا نتیجہ ہو۔ آخر رحمان پیر جانتا تھا کہ اتنی خلقت اسی کے لئے جمع ہوئی تھی۔

پیرزادہ برابر کہے جا رہا تھا ـــــ "رحمان پیر اللہ پاک کی تعلیم میں سے جو بات خاص طور پر ہم سامنے رکھتے تھے وہ یہ تھی کہ مزدور کو اس کی پیشانی کا پسینہ سوکھنے سے پہلے اس کی مزدوری دے دو

"چلو بیٹی، اب گھر چلنے کی فکر کریں۔" ماں نے آپا کو اشارہ کیا۔

"چلو اماں!" آپا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی کیونکہ اب وہ جذباتی ہیجان میں سے نکل آئی

"اے ہے اللہ رکھے منجھلی، اللہ رکھے چھوٹا بیٹا! جلدی کرو، جلدی کرو! چلو چل کر لاری میں جگہ ڈھونڈ لیں۔" ماں نے صلاح دی۔ "یہ ساری خلقت ٹوٹ پڑی تو ہمیں جگہ کہاں ملے گی، اور میلہ تو اب اُٹھ رہا ہے۔"

وہ لاری کے اڈے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ آپا خوش تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر بادل گھر رہے تھے۔ اب وہ گرمی نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ گھر سے باہر آکر کھلی ہوا کا مزہ لے لیا۔ عید سے پہلا دن۔ اس کا اپنا مزہ ہے۔ کوئی ملے یا نہ ملے۔ باہر نکل کر انسان کی آنکھیں کھلتی ہیں اس کے تجربے میں اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا کہاں بستی ہے، کیا سوچتی ہے، کیسی ہوا چلتی ہے، لوگ کیسے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں اور چلنا چاہتے ہیں ـــــ یہ تجربہ گھر میں بیٹھ کر کہاں ملتا ہے؟

جیسے بیچ بیچ میں منجھلی اپنا باجہ بجانے لگتی اور چھوٹا بے قرار ہو کر کہتا "میرے منہ سے بھی لگا دو نا اپنا باجہ چھوٹی آپا!" تو آپا کے ذہن میں گدگدی سی ہوتی۔ وہ بڑی آپا ہے اور منجھلی ہے چھوٹی آپا۔ وہ چھوٹے کی سلمے ستارے کی ٹوپی کو چوم لینا چاہتی تھی۔ کل کو وہ بیاہی جائے گی۔ اس گھر سے دور چلی جائے گی جہاں وہ خود اپنی دنیا بسائے گی۔ اس دنیا میں بھی ہوگی چھوٹی آپا اور بڑی آپا۔ اور اس دنیا میں بھی میلے دیکھنے کو ملیں گے۔ لیکن رحمان پیر کا یہ میلہ یادگار رہے گا۔ آنے والے میلوں کے پس منظر میں رحمان پیر کا میلہ سر اٹھا کر کہے گا ـــــ "میرا چہرہ بھی یاد ہے نا؟"

"اری منجھلی، میں دیکھوں ذرا تیرا باجہ، منہ سے لگا کر۔" آپا نے مچل کر کہا۔

باجہ دینے کے لئے منجھلی تیار نہ ہوئی۔

"اے ہے اللہ رکھے منجھلی! تیری وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔" ماں نے پھٹکار بتائی۔ "دے دے اپنا

باجہ آپا کو۔ اری، آپا بازار میں تو نہیں بکتی۔ ماں جائی آپا ہے جسے ملنے کے لئے تیرا دل برسوں بیقرار رہا کریگا۔ اور آج
تو آپا کا ذرا لحاظ کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اری ناسمجھ، آپا کی بات پر کان دھرا کر ہمیشہ ——"

"جلدی کرو امّی جان، لاری چل نہ دے۔" آپا نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا ہمارے پاس تو واپسی کے ٹکٹ ہیں۔ لاری ہمیں لے کر جائے گی۔"

"پھر بھی جلدی کرو امّی! یہ ڈرائیور اور کلینر اور کنڈکٹر ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں ——"

"یہ تو ہمارے ہی بھائی ہیں بیٹی! ہمارے مزدور بھائی! رحمان پیر اللہ پاک کی تعلیم کے مطابق کہا
کرتے تھے نا، کہ مزدور کو اس کی پیشانی کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ہی مزدوری دے دی جائے۔ اور ہم تو
پیشگی ٹکٹ خرید کر پیشگی پیسے دے چکے ہیں تو وہ ہمیں چھوڑ کر کیسے چلے جائیں گے؟"

"میں کہتی ہوں جلدی جلدی قدم اٹھاؤ امّی، کہیں لاری چل نہ دے" آپا گھبرا کر بولی "چلو منجھلی،
جلدی جلدی! چلو چھوٹے، دوڑ دوڑ کر!"

آپا نے ماں کا کندھا پکڑ کر چلنا شروع کیا جیسے وہ اسے اپنے ساتھ اڑا کر لیجانا چاہتی ہو۔ اس کے
ذہن میں پیر رحمان کی تصویر ابھری، جیسے پیر بازو اٹھا اٹھا کر اُسے بتا رہا ہو کر روٹی گرم گرم ہی اچھی لگتی ہے۔
عورت وہ ہے جو اچھی بیوی اور اچھی ماں ہے۔ .... کل عید ہے۔ وہ اچھے اچھے سالن پکائے
گی اپنے ہاتھ سے، اچھے اچھے کباب سینکے گی۔ قسم قسم کے پلاؤ پکائے گی۔ قسم قسم کے کباب —— شامی کباب،
سیخ کباب، نرگسی کباب —— اور پھر روغن جوش، قیمہ، مٹن چاپ، اور گردے کپورے اور نہ
جانے کیا کیا پکایا جائے گا۔ عید آتی ہے تو اپنے ساتھ سو سو خوشیاں لاتی ہے۔ سو سو سپنے جگاتی ہے۔ عید
بہن کی سکھیوں کو گلے ملاتی ہے۔ عید ماں جائی بہنوں میں من منوتی کراتی ہے۔

لاری کا بھونپو تین چار مرتبہ فضا میں گونجا۔ آپا تیز تیز ڈگ بھرنے لگی اور پلٹ کر بولی۔
"امّی جان جلدی کرو ——" وہ اب چھوٹے کو گود میں اٹھا کر چلنے لگی تھی۔ منجھلی ماں سے آگے آگے جا رہی
تھی۔ ماں کے پاؤں جیسے بھاری ہو گئے ہوں، اور پیچھے چھوٹی جا رہی تھی۔ ماں کوئی سو قدم پیچھے ہو گی۔
آپا چلا کر بولی۔ "جلدی کرو، امّی جان!"

اتنے میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ پھر زور کا چھینٹا پڑا۔ منجھلی کے لال دوپٹے کا رنگ کچا
تھا —— پانی پڑتے ہی لال رنگ اتر کر اس کے گالوں اور ہاتھوں پر چڑھنے لگا۔

پاس سے گزرتے ہوئے سفید بالوں والے بڈھے نے چلا کر کہا —— "نامراد بارش کو بھی یہی وقت
ملا تھا، میاں جمّاں!"

"ارے صادق میاں! بارش کو ہمارے بھیگنے کی کیا پروا ہے؟"
پیچھے سے آنے والے بھاگ بھاگ کر لاری میں سوار ہو رہے تھے۔ پہلے ان کے لبوں پر گری تھی۔ اب ان کے لبوں پر بارش کی شکایت تھی۔

پانی میں ماں کا بڑا حال تھا۔ بیٹیاں اور بیٹا الگ اپنی قسمت کو کوس رہے تھے۔

لاری کا آخری بھوں بھوں فضا پر تازیانہ سا لگا کر رہ گیا۔ بھاگنے والوں کو پیچھے چھوڑ کر لاری کے پہیے آگے کی طرف چل دیئے۔

ل، احمد

ایک صناعت پارے کا افسانہ

(بسلسلہ امریکن طرزِ زندگی)

دنیا میں پانی برستا ہے تو ہوا میں تازگی آجاتی ہے لیکن ٹوکیو میں ہوا بوجھل ہوجاتی اور فضا میں گھٹن
…وس ہونے لگتی ہے۔ بازاروں کا شوروغل بھی بھیگا سا اور آوازیں گیلی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ درختوں کی رونق
…ی ڈالیاں، پتیاں، غیر حسین اور وہ درخت بے موقع معلوم ہونے لگتے ہیں۔ برسات کے مارے ہوئے یہ درخت
…روں کی بہجت و شادمانی میں شریک نظر نہیں آتے۔ اور ہوا جب ان کو ہلاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی
…زندگی کو جھٹک دینا چاہتے ہیں۔ ناہموار پٹری اور سڑک پر پانی رک جاتا ہے تو اس میں آس پاس کی عمارتوں
…زنے والوں کے عکس زمین میں دھنستے نظر آتے ہیں۔

دوکانوں اور شبینہ کلبوں کی آرائش رنگین کاغذ کے ہار و پھولوں اور قندیلوں سے کی جاتی ہے اور ان
…انوں اور طرب گاہوں میں دن کے وقت بھی برقی حروف میں اشتہار روشن رہتے ہیں۔

یہ سارا منظر ذہن و خیال کو ایسے انسانوں کے تصور پر مجبور کردیتا ہے جن کی زندگی کو بارش کا موسم ننگا
…دکھاتا ہے، کہ ان کو کونسا سامانِ زندگی میسر نہیں اور وہ کن برکاتِ زندگی سے محروم ہیں! ان کی یہ ننگی
…دگی، زندگی کی بہت سی قدروں کو بھلا دینے پر مجبور کردیتی ہے۔ ایسی قدروں کو جو انہیں ہر طرف اور ہر وقت
…ر بھی آتی ہیں۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں، کمرے کی چوبی دیواروں پر پڑ کر بارش زیادہ پرشور ہوگئی ہے، اس وقت
…ہ نظرِ خیال ٹوکیو کے اس حصے کو دیکھنے لگتی ہے جو شاید تعمیر ہی اس مقصد کے لئے ہوا ہے کہ وہاں کی قادونی
…ت باقی ٹوکیو کی مفلسی کے گہرے اندھیرے پر روشنی ڈالتی رہے! شہر کے اس حصے میں ہر بات اور اس کی
…ہر چیز دولت و تنعم کی زبان ہے! اور یہ دیکھ کر آدمی اس الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق خدائے کائنات
…ام ہے یا وہ دولت کا کارخانہ ہے! اس دولت کا کارخانہ جو بہ خود غلط ہے، جو مغرور و متکبر ہے، اور
…اپنے سوا ہر شے کا منکر اور ہر بات سے خالی الذہن ہے! غرض دولت نے ٹوکیو کے اس حصے میں اپنے لئے بلند و

سنگین عمارتوں کے قلعے کھڑے کرنے اور فولادی جنگلے اور پھاٹکوں کے حصار کھینچ لئے ہیں۔

یہ آقائے تخلیق دولت اپنے وجود کا اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور جن ناموں کے ذریعے یہ کیا جاتا ہے، ان ناموں کو کتابوں کے اندر غیر فانی بنا دینے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ متسوئی، متہ اور متسو تیشی وغیرہ بڑے بڑے تختوں پر موٹے موٹے سنہرے حروف میں لکھے ہوئے یہ نام جاپانی دولت کا اعلان کرتے ہوئے ٹوکیو کے بازاروں میں جابجا سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ایسے نام ہیں جو شکستہ ہو ...ماں سے پڑ گئے تھے مگر گذشتہ سات سال کی مدت میں اس فہرست میں کچھ ایسے نام بھی شامل ہو گئے ہیں جنھیں ... سال پہلے تک جاپان کے لوگ جانتے بھی نہ تھے۔ جیسے ہولینڈ اینڈ کمپنی، ولیمس، نیویارک ٹریڈنگ وغیرہ، دیسی اور بدیسی ناموں کی یہ تختیاں بڑے پندار کے ساتھ یہ اعلان کرتی محسوس ہوتی ہیں کہ:-

"ہر وہ بات جس سے ہمارا وجود عبارت ہے، یہ استحکام قائم اور دائم ہے!"

دولت کے انباروں کو سنگین کوٹھڑیوں کی اداس فضا اور فولادی تجوریوں کا اندھیرا پسند ہے۔ انباروں کو بڑے انبار بنانے کی ترکیبیں جہاں بیٹھ کر سوچی جاتی ہیں، ان عالی شان عمارتوں کی راحت اور ... سے دھنوانوں کے قبضہ و اختیار کا ثبوت ملتا ہے۔ اس آرائش و آسائش میں ہر پسند و مذاق کی پوری ... رکھی جاتی ہے۔ اور ہر امتیاز سے عاری مذاق کی بھی چاپلوسی کی جاتی ہے۔ ہر قسم و رنگ کی ہر وہ شے فراہم ہوتی ... صنعتی و تجارتی دماغ ذہن میں لا سکتا ہے۔

لیکن یہاں ایک طرفہ تضاد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سامان عیش و تنعم انسانی بازوؤں کی قوت مہیا ... دولت جس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی مگر اس کو اپنے دولت کدوں سے نکال بھی نہیں سکتی ہے۔ نوکر چاکروں ... میں مفلسی ان عشرت سراؤں کے اندر گھس آتی ہے۔ دھلی اور کلف دار وردیاں پہنا کر دولت کوشش کرتی ... کہ افلاس کا تصور بھی نہ آسکے لیکن محل سراؤں میں رہنے والے قارون ان بھوکی نظروں سے نہیں بچ سکتے ... سے وہ ہمیشہ آنکھیں چراتے ہیں۔

ٹوکیو کے اس حصے کا نام گنزا ہے جسے نیویارک کے براڈوے کا جواب کہنا چاہیئے۔ یہ بازار ... میں ٹوکیو کی شہ رگ ہے۔ یہاں وہ روح فرسا زندگی نظر آتی ہے دوڑ جھپٹ جس کا پہلا فریضہ ہے۔ اسی ... ایک بہت بڑی عمارت زرد رنگ سے لپی پتی ہے جس کی چوکور کھڑکیوں پر زرد ریشم کے نصف پردے ہوا ... کے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑایا کرتے ہیں۔ عمارت کی زیبائش میں زرد رنگ کا انتخاب و فوقیت شاید یہ ... ہے کہ اس دولت سرا میں رنج و غم کا گذر نہیں۔ یہاں مسرت ہی مسرت ہے! پورے گنزا میں یہ عمارت ... زیادہ معروف حصہ ہے یہ ایک ایسا مارکیٹ ہے جہاں دنیا بھر کا مال ڈیوٹی فری آکر بکتا ہے۔ البتہ وہ مال ...

یں خرید سکتا ، بلکہ وہاں سے چیزیں خریدنے کے مجاز و مستحق صرف غیر ملکی ہیں ! اور غیر ملکی سے عبارت امریکن فوجی ہیں
ں بعض امریکن فوجی گھورے دور پڑے پڑے گھبرا نہ جائیں ۔ اس لئے جاپان کی قومی خود مختاری کو بھینٹ چڑھا کر ان
ہلاؤ اور انہیں لالچ دینے کی یہ صورت پیدا کی گئی ہے ۔

امریکن فوجی جب اس مارکیٹ میں پہنچتا ہے اور اعلیٰ و نفیس سامان مفت برابر ملتے دیکھتا ہے تو بوکھلا
۔ یہاں اس کو ایسا امریکن مال بھی ملتا ہے جس کی گرانی کے سبب اسے امریکہ میں رہتے ہوئے خریدنے کا
بھی نہ آسکتا تھا ۔ امریکن فوجیوں کی بوکھلاہٹ سے ڈر کر سودہ بیچنے والی جاپانی لڑکیاں خوفزدہ ہو کر سامنے
ٹ جاتی ہیں ۔ غرض تھوڑے پیسوں میں بہت سا سامان خرید کر امریکن فوجی باہر نکلتا ہے تو ڈیبے بنڈلوں سے
لدا وہ اپنی بارک کو نہیں چلا جاتا بلکہ اسی بازار میں بل مارتا رہتا ہے ۔ جاپانی دکانوں میں گھس کر حسن و جمال
دگی نظر ، اور نکہت و رنگینی سے اپنی شاہ نوازی کرتا رہتا ہے اور جب وہ وہاں اس طرح سرگشت
ے تو اپنے ہر فعل اور ہر بات سے یہ ثابت کرتا رہتا ہے کہ وہ واقعی " خاص ملک خدا " کا باشندہ اور سات
پار کر کے " امریکی طرز زندگی کی برکت " پہنچانے آیا ہے ۔ وہ جاپانی عوام کی ترش روئی اور تلخ نگاہوں کو اپنی
کامیابی کا ثبوت اور اپنی برتری کا اعتراف سمجھتا ہے اور اس " برتری " کا یقین اس کو فوجی پادری بھی برابر
کراتا رہتا ہے ۔

اس مارکیٹ کا نام PX اسٹور ہے جہاں وہ مال فروخت ہوتا ہے جس پر جاپانی حکومت کو کسٹم ڈیوٹی
اختیار نہیں ہے ۔ اسی اسٹور کی کھڑکی کے جنگلے سے ٹکا ہوا امریکن فوجی جب کسی جاپانی صناع سے اپنا چہرہ نقش
ہے تو اسے فخر و غرور کا شدید احساس ہوتا ہے ۔ اسی لئے وہ بار بار اس نقاش کو گھورتا جاتا ہے ! جاپان کی سرزمین
پر وہ کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا اس کے خیال میں راحت و آرام پانے کے لئے ضروری ہے ۔ چنانچہ رستوراں کے خدمتگار
لی ، بوٹ پالش ، دوکاندار اور نقاش ، وہ جس جس سے خدمت لیتا ہے ۔ سب کو ایک سی صورت کا
ہے ۔ اس لئے ایک ہی سا برتاؤ بھی کرتا ہے ۔ یا پھر وہ امریکن جمہوریت کا نام دوبالا کرتا ہے ، جہاں انسان
میں فرق کرنا حرام مطلق ہے ۔ حبشی اگر درّے کھاتے ہیں تو ان کے بدن سے بو بھی تو آتی ہے ! غیر امریکن ،
شہریوں کے حقوق تلف نہیں کر سکتے ! اور ایسی باتوں سے جمہوریت کی اسپرٹ داغی نہیں ہو سکتی ہے !
اس کی یہ خفگی بالعموم چیخ پکار کر کے کبھی کبھی گالی ٹھوکر سے ظاہر کی جاتی ہے ۔ اور نتیجہ چونکہ حسب دلخواہ نکلتا
لئے وہ اپنے عمل و طور کو بالکل صحیح و درست باور کر لیتا ہے !

اس اسٹور کے کھلنے کے وقت سے لیکر دن ڈوبنے تک بیسیوں جاپانی نقاش وہاں منڈلاتے رہتے
ان صناعوں کا لباس مشکل ہی سے صاف اور ثابت ہوتا ہے ۔ صناع برادری کی عالمگیر روایات کے مطابق

جاپانی صناع بھی دراز زلفیں رکھتے، چوڑے چھجے کا ہیٹ لگاتے اور ٹائی کی جگہ سیاہ فیتہ باندھتے:
کی یہ وضع قطع دنیا بھر میں شرف افلاس کی علامت تسلیم کرلی گئی ہے۔

یہ جاپانی نقاش بے فکری کا انداز بنا کر اور خوش باشی کا ڈھنگ اختیار کرکے اپنی زندگی
پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے اور آدمی کو محسوس کرادینا چاہتے ہیں کہ اگر ان کی پیش کش خدمات پر
تو انہیں قطعی افسوس نہ ہوگا۔

ایک دن شام کے وقت میں اس دلچسپ مقام سے گزر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخ شعا
پٹریوں کو چمکا رہی تھیں اور شام کے سائے لانبے ہوتے جا رہے تھے۔ دن ڈوبتا تو ساری دنیا
ٹوکیو میں بڑی خموشی اور غیر محسوس طریق پر ڈوبتا معلوم ہوتا ہے۔ آدمی ان نامختتم وسعتوں کا د
لگتا ہے، سورج جن کے پیچھے جاکر ڈوبتا ہے اور یہ ڈوبتا سورج بیاد دلاتا جاتا ہے کہ اس کی روشنی
انسان کے لئے مخصوص ملاطفت کے معنی رکھتی ہے۔ سورج کا لطف والتفات ویسے تو ہر جاندار
کا مقسوم ہے لیکن انسان کے ساتھ اس کی عطا و بخشش فیاضانہ ہے، اس مسرت کی حامل۔
تلاش انسانی زندگی کا مقصد اور جس کے لئے وہ ہمہ وقت سرگرداں رہتا ہے۔ اچانک میرے پیچھے سے
انگریزی میں کوئی کہنے لگا:-

"مسٹر، آپ پسند کریں تو میں آپ کا چہرہ نقش کردوں؟ آپ بہت پسند کریں گے، میں ٹوکیو
آرٹس کا سند یافتہ ہوں، قیمت بھی معمولی ہوگی۔ پورا چہرہ بنوائیے یا ایک رخی تصویر، اور جس رنگ
اس کی گفتگو تیز تھی مگر بول رہا تھا رک رک کر۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس کی اس وقت کی مسکراہٹ غیر حقیقی ہونے کے ساتھ مترحم بھی تھی۔ میں نے
دیئے اپنی رفتار تیز کردی، لیکن وہ پسپا نہیں ہوا۔ اس نے وہی باتیں دوبارہ مختلف الفاظ میں کہیں
دفعہ اس کی آواز میں پہلی سی جان اور رونق نہیں تھی اور اس کا تخاطب مجھ سے کم اور خود سے زیادہ تھا
"شاید مسٹر نے مجھے اس کام کا اہل نہیں سمجھا یا شاید مجھے بجا آوری خدمت کی مسرت کا مستحق نہ
میں چلتے چلتے رک گیا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ مترحم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھر نمودار ہوئی مگر
ہوگئی۔ اب اس کے چہرے پر وہ چاکرانہ مستعدی کا انداز باقی نہ تھا۔ بالکل فطری انسان کا چہرہ نظر آرہا تھا۔
"معافی چاہتا ہوں، میں آپ کو امریکی سمجھا تھا!"
"آپ نے کیونکر جانا کہ میں امریکن نہیں ہوں؟" میں نے سوال کیا۔
"مگر آپ تو روسی ہیں، سوویٹ!"

اب جو وہ مسکرایا تو اس مسکراہٹ میں ایک اعتماد شامل تھا۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کے گوشوں پر
ضور نمودار ہو گئے۔ اور چہرے پر فطری ذہانت کے آثار تھے۔ وہ کہتا رہا " روس کے لوگ ہمارے ملک
تے ہیں۔ لیکن کوئی آجاتا ہے تو معلوم نہیں کیوں کر، مگر شناخت ہو جاتی ہے ۔" چلتے چلتے یہ ثابت کرنے کو کہ
دکنا نہیں چاہتا۔ اس نے سوالیہ نظر اٹھائی۔

صناعی برادری کا مثالی افلاس اس نقاش کے لباس سے بھی ظاہر تھا۔ کوٹ پرانا تھا اور رنگت بدل
. ایزل پر رگڑ کھانے سے آستین گھس گئی تھی۔ جہاں محبت کے ہاتھوں نے بے معلوم سا پیوند لگا دیا
ہرے کے رنگ اور چھریرے جسم کی چستی و چالاکی کی وجہ سے جاپانیوں کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا
ین اس کی عمر ہوگی اٹھائیس کے لگ بھگ۔ چہرے کی رنگت پیلاہٹ لئے تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ
ور آنکھوں کے گوشوں پر بہت باریک جھریاں بھی پڑنے لگی تھیں۔ عینک کے تاروں کو سر کے بال چھپا لینا
تے۔ اس کی سیاہ کپڑے کی قمیض اس کے زرد چہرے کا چوکٹا محسوس ہوتی تھی۔ اس نے کہے تو چند جملے لیکن ان
ن کے اندر میں نے اس کی بے مزہ زندگی کے باہری خطوط دیکھ لئے۔ کہنے لگا :-

"دوستوں کو یادگاری تحفے نذر کرنا آپ شاید واقف ہوں ہماری قدیم قومی روایت ہے۔ میری خواہش ہے
سوویٹ شہری کو کوئی تحفہ پیش کر دوں۔ لیکن میرے پاس ایسا تحفہ میرے ہی نقش کے سوا دوسری چیز نہیں ہے
آپ اگر قبول فرمائیں تو میں اپنا نقش لے کر آپ کی جائے قیام پر حاضر ہو جاؤں؟ مجھے بے حد خوشی ہوگی میں
پیش کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کو میرے وطن اور اسی بازار کی یاد دلاتا رہیگا۔"

میں نے اسے اپنا پتہ بتا دیا، اور اس نے دفتی پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک کارڈ مجھے دیا۔

"یاگی ہواشی، آزاد نقاش، ٹوکیو اسکول آف آرٹس، یورا گوچی، چہارا کو ——!"

تیسرے دن وہ اپنا تحفہ لے کر آیا، شام ہو چکی تھی۔ اور گہرا اندھیرا روئی کے گالوں کی طرح نرم
ہو رہا تھا۔ دور سے دف بجنے اور مناجات پڑھی جانے کی دھیمی صدائیں سنائی دے رہی تھیں،
ن کے نیچرین مسلک کا جلوس اپنی المناک مناجات سے بدھا کی شان بڑھانے کو بازاروں سے گزر رہا
ن کی صدائیں اندھیری فضا پر چھا گئی تھیں۔ اور میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا زمانہ قدیم کے خیالات میں
تھا۔ مشرق کی روشنی اور رنگینی کے باب میں میں نے مغربی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھی تھیں وہی خیالات
دماغ میں چکر کھا رہے تھے۔ یہ غیر ملکیوں کی بخشی ہوئی "روشنی و رنگینی" ہی تو ہے جس نے مشرق کے صحیح خط و خال
ہے! اچانک میرے کانوں میں ایک آواز پہنچی اور میرے یہ خیالات منتشر ہو گئے۔

"براہ کرم معاف فرمائیے گا ۔" ایک بجتی ہوئی آواز نے باہر سے کہا۔ ان لفظوں کو دہرائے بغیر کوئی جاپانی

کسی کے مکان میں داخل نہیں ہوتا ۔ دوسرے لمحے میں جاپانی نقاش ، تیاگی ہواشی دروازے میں سے نمودار ہو
لباس اس کا وہی تھا ۔ البتہ بٹن نے سرسے ٹنکے تھے ، اور گلے میں فیتے کی جگہ سیاہ ٹائی بندھی تھی ، وہ آرا
پر بیٹھا نہیں بلکہ اس میں گر گیا ۔ اور پیلے رنگ کا لپٹا ہوا کاغذ میز پر رکھ کر مسکراتے ہوئے بولا :۔
" اس نقش کی ایک کہانی بھی ہے جو میں بعد میں سناؤں گا ۔ اور معلوم نہیں کہ میں اپنا مافی الضـ
اس نقش میں منتقل کر بھی سکا ہوں ــــــــ "

وہ اچانک چپ ہو گیا ۔ اور اس کی اس خموشی نے میرے سامنے کی تصویر پیش کر دی جو تھک گیا
کے منزل کے سامنے ۔ کہنے لگا ۔

" آج میں نے ایک امریکن کار پورل کا چہرہ بنایا تھا ، مگر وہ اسے پسند نہیں آیا اور اس نے مجھے ا
جھنجی بھی نہیں دی ۔ "

" آپ کو گنزا میں کام کافی مل جاتا ہے ؟ " میں نے پوچھا ۔

" کام ؟ " اس لفظ نے اسے گہرے سوچ میں ڈال دیا ۔ اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکرا
آگئی ۔ " کچھ ٹھیک نہیں ۔ کبھی دو تین چہرے مل جاتے ہیں ، کبھی کئی روز کی ناغہ ، خاص کر جب موسم خرا
ہے ۔ " میری طرف ذرا جھک کر " میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے وطن میں صناعوں کی کیا حالت ہے
سوویت یونین میں دماغی کام کرنے والوں کو برابر کام ملتا رہتا ہے ؟ "

میں نے اپنی مسکراہٹ کو دبایا لیکن میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کہتا رہا ۔

" لیکن میرا سوال ہی بیہودہ ہے ۔ دراصل اہلِ فن کو ہمیشہ کام ملتے رہنے کا تصور میرا دماغ قبو
کرتا ۔ سمجھ رہے ہیں آپ میرا مطلب ؟ کام ! " یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ اس طرح اٹھایا گویا کوئی بوجھ اٹھا
ہے ، ہاتھ اٹھانے میں اس کی قمیض کا پھٹا ہوا کف باہر نکل آیا تھا ۔ اس وقت اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھ
وہ جذبات کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ۔ پھر گھٹنے پر ہات مار کر کہنے لگا ۔ " کام ! جب کا
کا نام ہی زندگی ہو ! اس کا مجھے پورا تجربہ ہے ہر وقت اسی خیال میں ڈوبا رہتا ہوں ۔ اسی کے خواب دیکھتا
آپ سمجھ رہے ہیں نا ؟ تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے گورکی کا (LOWERDEPTH) پڑھا تھا ۔ آپ ک
کے وہ لفظ یاد ہیں کہ اپنے آپ کو انسان محسوس کرنا بہت بڑی بات ہے ۔ اور گورکی جیسے انسان کہتا ہے مجھ
کے اندر تخلیقی کام کی زندگی دکھائی دیتی ہے ۔ ہمارے جاپان میں ایسے معلم ہیں جو نوجوانوں کے دل و دماغ میں ا
و اشرف خیالات کی تخم ریزی کر رہے ہیں لیکن ایسے قدامت پرست بھی بہت ہیں جو سکھاتے ہیں کہ سکورا
بہتر کوئی درخت نہیں اور سمورائی سے بہتر کوئی انسان نہیں ۔ میں مختلف عقیدے کا ہوں ہمارے ہاں ایک

ثل ہے کہ، شیر مرتا ہے تو کھال رہ جاتی ہے اور آدمی مرتا ہے تو نام رہ جاتا ہے۔ مضافات
ڈم میں REMBRANDT نے گدڑی کے اندر لال ڈھونڈھ نکالا جس کے نقش NIGHT
WA میں آج بھی منور ہے۔ اس نقش کی نازک تفصیلات تک میرے ذہن میں تازہ ہیں اس کے علاوہ
REPIN کا اور آپ کا VELASQUEZ، MURILLO REBIRA، SPIN
ال صناعوں کے نقوش کے اندر، صدیوں کے دھندلکے میں سے، مجھے انسان نظر آجاتا ہے۔ آپ کے ذہین
نیس تو انسانیت کا قصیدہ ہے۔ جس وقت میں نے اپنے ہونامی کستسو (HONAMI KOSTSU)
کوسیا (HOKUSIA) کے کمال فن کو پہچانا تو مجھے کتنی مسرت ہوئی تھی میں نہیں کہہ سکتا۔ بلاشبہ اپنے
و انسان محسوس کرنا بہت بڑی بات ہے۔ لیکن اگر........"

وہ شاید مناسب لفظ کی تلاش میں الجھ گیا تھا۔ اور پھر اس خیال ہی کو ترک کر کے گھبراہٹ کے ساتھ
یکھنے لگا۔ "آپ مجھے معاف فرمائیں۔ نہ معلوم اتنی زیادہ باتیں کر کے آپ کی سمع خراشی میں نے کیوں کی
ے ابتک اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ آپ کی اور بھی تو مصروفیات ہونگی!"

"آپ مطلق خیال نہ کیجئے، مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔!" میں نے اس کی پریشانی رفع کرنے
ا۔ اور واقعی مجھے کہیں جانا بھی نہیں تھا۔

"بہت کچھ تو کہہ چکا، ہوا کے طمانچے کھا کر چٹانیں کراہنے لگتی ہیں۔ کراہنے کے بعد شاید چٹانوں کو سکون
ہی ہوتا ہوگا۔ یہ کہاوت اچانک ذہن میں آگئی۔" وہ پھر خموش ہو گیا۔ کھڑکی میں سے خنک ہوا اندر آرہی تھی۔ میدھا
س اب بہت قریب آگیا تھا۔ اور مناجات کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ جلوس کی صداؤں نے شاید اسے
یا۔ اور اس کے شانے تیزی سے ہلنے لگے۔

"کام آپ کو کتنے دنوں سے نہیں ملا؟" میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کیا باتیں کروں؟

"جی، آرٹ اسکول سے نکل کر بیکار ہی ہوں۔ واقعی کام تو کبھی ملا ہی نہیں!"

"اسکول آپ نے کب چھوڑا؟"

"چوتھا سال ہے یہ۔ اس اسکول سے ہر سال تیس لڑکے سند حاصل کرتے ہیں۔ اور پچاس آرٹ
لاس سے نکلتے ہیں۔ یہ اسّی نقاش سالانہ سند پاتے مگر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ والوں
ے چار تو گنترا کا راستہ ناپا کرتے ہیں۔ باقی چھبیس میں سے ایک نے بیشک زندگی میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔
یگزین کے لئے تصویریں بنا کر اس نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ شہرت قابلیت کی ضمانت تو نہیں ہوتی۔
وہ واقعی ایک جوہر قابل بھی ہے۔ اس کی ذات ہم سب کے لئے ایک سہارا بن گئی ہے۔ کسی کام میں ایک کا

کامیاب ہو جانا دوسروں کی حوصلہ افزائی کا سبب ہو جاتا ہے۔ ہم لوگوں کی مثال ریگزار کے مسافر کی سی
کہ ایک قدم اٹھاؤ تو دوسرا گڑ جاتا ہے۔ اور سہارا تنکے کا بھی نہیں ہوتا۔"

"صرف ایک بار میں ایک تنکے کو پکڑ سکا۔ متسوکوشی کے اسٹور میں مجھے لیبل لکھنے کا کام مل گیا تھا
اس پر میں اتنا خوش تھا کہ اپنے خوش ہونے کی ذلت کا بھی احساس نہ کر سکا۔ یہ مستقل نوکری نہیں تھی بلکہ
کی مقدار کے مطابق اجرت ملتی تھی۔ اس لئے میں گھر پر بھی کام میں جٹا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ انگلیاں سُن پڑ
تھیں اور کمر سیدھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس سخت محنت نے مجھے بیمار ڈال دیا۔ لیکن ان دنوں میں ہر وقت
کا شکر ادا کرتا رہتا تھا کہ میرا بچہ بھوک سے تلملا تو نہیں رہا ہے۔ خدا محفوظ رکھے!"

"ہمارے ہاں ایک گیت گایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے نہ بھوک ستاتی ہے نہ طوفان ڈ
ہے، لیکن اپنے بچے کا بھوک سے بلبلانا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کام ڈھونڈتا پھرتا ہوا
"یہ گیت میری قلبی کیفیات کی سچی تصویر ہے۔ صناعت و فن کے لئے زندگی وقف کر دینے کا خیا
اب یکسر باطل ہو چکا ہے۔ متسوکوشی کے اسٹور میں کام پانے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ میں
مینجر کے سامنے خم تعظیم ادا کرتا، اور اپنی حرکت پر نفریں بھی کرتا تھا۔ لیکن تعظیم برابر ادا کرتا تھا۔ تین م
اس طرح گزرے تھے کہ تجارتی مندہ شروع ہو گیا۔ اور اخراجات کم کرنے کے ذیل میں مجھے بھی جواب مل گیا
میں نے پھر گنزا کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔" اس کے شانے پھر تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اور اس نے
کھڑکی کی طرف دیکھ کر مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ ہوا کی خنکی سے پھریری آ گئی تھی۔

وہ خموش ہو گیا۔ اور بدھا کا جلوس مکان کے بالکل سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بدھ
مذہب والوں میں یہ فرقہ GOSPEL OF LOTUS کا معتقد ہے۔ جو سمجھتے ہیں کہ ذاتی
جسم پر تمام عقوبتیں جھیلو اور دم نہ مارو۔ انتہائی رنج و غم میں بھی مسکراؤ۔ غم کرنا غلط ہے کیونکہ بودھا
تمہارے اندر ہے۔ ہمہ عجز و انکسار بن جاؤ تاکہ نروان ملے۔"

"یہ اصل سبب ہے کہ ضبط و صبر جاپان کا قومی کردار بن گیا ہے۔ میں خود بھی اس پر عمل پیرا ہونے
کی کوشش کرتا ہوں لیکن قومی کردار سے قطع نظر بعض انسانی خصوصیات ایسی بھی تو ہیں جو ایک بین
الاقوامی کردار بناتی ہیں۔ اور وہ خصوصیات دائم بھی ہیں۔ میرا مطلب تخلیقی صداقت یا حریت کی تلقین سے
نہیں ہے بلکہ حقیقت اشیاء کی تلاش انسانی خصوصیت یا کردار ہے۔ اور یہ خصوصیت اسی طرح رونما ہوتی
ہے جس طرح خشک زمین سے کلا پھوٹتا ہے۔ یہ میں شکایتاً نہیں کہہ رہا بلکہ کہیئے با واز سوچ رہا ہوں۔"
فطرت بسیط پر نظر ڈالیئے۔ میں تو اس مشاہدے میں کھو جاتا ہوں، ہر بات مناسب اور ہر شے موزوں

پنی اپنی جگہ ہر چیز صحیح اور ایک خاص مفہوم کی حامل ہے۔ ایک خاص حسن رکھتی ہے۔ ہر شے کی تفصیلات باہم دیگر مربوط اور ایک خاص مقصد کے لئے وضع ہوئی ہیں۔ انسان کو طبعاً خون خرابے سے اکراہ ہونا فی المعنی غیر فطری تباہی و بربادی پر انتباہ کی صورت ہی تو ہے، انسان کے دل میں زندگی کی محبت ڈال دینا اصلاً یہ مطالبہ ہے کہ انسان ہر صبح کو یوم مسرت کا پیش خیمہ باور کرے! یہ ماں باپ کے جذبات اگر ایک نئی زندگی کی تخلیق، تسلسلِ حیات کا اتباع اور حیات کی فتمندی کا راز نہیں تو اور کیا ہیں؟ میرے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہستی صورت بدل لیتی ہے۔ یہ زندگی کا حسین ترین راز ہے۔ ننھا سا ایک بچہ، ہمکتا ہوا پر اسرار وجود، کائنات کی محبوب ترین ہنسی اس کی غیر یقینی حرکتیں اور گیلگی باتیں.......... ان تمام علوی محسوسات کو عذاب جہنم سے بدل دینے کا آخر مقصد کیا ہے؟"

" مجھ سا ایک جوان آدمی جس میں کچھ جوہر قابل کا وجود بھی مانا جاتا ہو، صبح سے شام تک گنزا کے چکر کاٹے تاکہ کوئی ذلیل سی خدمت ہی مل جائے۔ اور محض اس لئے کہ وہ اپنی بیوی اور بچہ کو فاقہ کشی سے بچا سکے! یہ احتیاج اُسے ہر وقت سرگرداں رکھتی ہے وہ گڑگڑاتا ہے اور پھر مسکراتا ہے! کیسا ظلم عظیم ہے کہ ایک بھاری جیبوں والا فیصلہ کرے کہ شام کو جب میں گھر پلٹوں تو بیوی بچوں کے کھانے کے لئے کچھ لے کر جاؤں یا خالی ہاتھ، یا کر ان دونوں کی امیدوں پہ پانی پھیر دوں؟ بتائیے اس صورتِ حال میں کونسی منطق ہے؟ کیا استدلال ہے؟"

" میں نے ابھی کہا کہ نظامِ فطرت کے اندر استدلال پایا جاتا ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ بایماء عقل و فراست انسانی دنیا نظم و دلیل سے معرا ہے۔ سچ سچ میں سیاسیات کو نہیں سمجھتا، لیکن جب بھوکے انسانوں کا جلوس "ہمیں کام دو" کا نعرہ لگاتا گزرتا ہے تو صورتِ حال میری سمجھ میں فوراً آجاتی ہے!"

"کچھ دن ہوئے گنزا میں سڑک کی مرمت ہو رہی تھی ایک مزدور ہاتھ میں ڈنڈا لے کر کھڑا ہو گیا اور ٹرافک کو کنٹرول کرنے لگا۔ وہ اس طرح تنا ہوا کھڑا تھا کہ اس کا احساس فخر میرے لئے آشکارا تھا۔ اس کے ہاتھ اٹھا دینے سے قارونوں کی موٹریں رک جاتی تھیں، اور وہ اس ٹکے کے آدمی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اس مزدور کا یہ تحکم تھوڑی دیر کے لئے تھا مگر سوچئے تو اس وقت اس کے احساس مسرت کو کس پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے؟"

"آپ باغ میں چلے جائیے۔ صنوبر کے درخت، سکورا کی ہر ڈالی اور پتی، گھاس کا ہر تنکا اور پھولوں سے لدے ہوئے بوٹے اپنی اپنی جگہ مکمل اور کمال مطمئن نظر آئیں گے! یہ تمام برگ زار اپنی غذا بلا دغدغہ اسی ایک زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ شاخیں کاٹ دیجئے۔ ان میں پھر کلی پھوٹ کر شاخیں بن جائیں گی۔ گھاس کو روند ڈالئے وہ پھر بحال ہو جائے گی، کیوں؟ اس لئے کہ سب اپنی جڑوں کے سہارے جیتے ہیں۔ لیکن وا حسرتا کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کی زندگی کی جڑ غائب ہے! ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال میں اپنے آپ سے اس وقت سے کر رہا ہوں

جب سے میں نے زندگی کا بوجھ سنبھالا اور گنز لکے راستے کا گزینا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ میں اپنے بنائے ہوئے ان نقوش کی پھیری پھیرنے لگا جن کو میں نے اپنی زندگی کا مدار قرار دیا تھا۔ شروع میں ہر دوکان اور دفتر میں بلا دھڑک داخل ہو جاتا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں میری وہ دلیری بزدلی سے بدل گئی۔ اور اب اگر کسی دوکان میں داخل ہوتا ہوں تو دروازہ ایسے کھولتا ہوں گویا میں کوئی چور یا بھکاری ہوں۔"

"حکومت نے صناعت پاروں کی فروخت پر ٹیکس دوگنا کر دیا تو دوکانداروں نے اسی مناسبت سے قیمتیں بڑھا دیں۔ اس لئے کساد بازاری ہوئی۔ اب دوکاندار نقوش نہیں خریدتا۔ وہ اپنی پونجی کو جوکھوں میں ڈالنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے۔ میں، اور مجھ سے اور بہت صناع جہاں جاتے ہیں ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب کہئے ہم سے مبتدی کیا کریں۔ جن کے نام پیدا کرنے کے موقعے بھی اس طرح تلف کر دیئے جاتے ہیں۔"

ایک دن تقدیر نے زور مارا اور میں لکو ٹیٹو کی دوکان میں گھس گیا جو PX اسٹور سے ذرا آگے ہے۔ میں نے اپنی ایک اسٹڈی اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ بازار کا منظر تھا جہاں ایک مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ آپ نے شاید خیال کیا ہو، جاپانی بچے مداری کا تماشا دیکھنے کے بڑے شوقین ہیں۔ اب اس لئے کہ میں کوٹ کے نیچے ویسٹ کوٹ نہیں پہنتا۔ اور نہ میرے پاس چھپے ہوئے ملاقاتی کارڈ ہیں۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھے "آپ" سے نہیں "تم" سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ لکو ٹیٹو کا منیجر بولا:

"ارے بھئی بازار کا منظر تو بہت عام چیز ہے۔ تم کوئی دلکش اور نظر فریب نقش بنا کر لاؤ۔ شیشو اور ہرو نو بو سے اشارے لے سکتے ہو، جاپانی اسٹائیل میں کوئی کلاسک بنانے کی کوشش کرو، اور ملا شبہ ریشم پر ہونا چاہیئے۔ یہ بات برابر ذہن میں رکھنا کہ ہمارے گاہک سب غیر ملکی ہوتے ہیں۔ اس لئے تمہیں ہرو نو بو کا اتباع بہرحال کرنا ہوگا۔ جن شوقینوں کو جاپانی صناعت سے تو لگاؤ نہیں مگر جاپانی عورت کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ تمہاری قلم کاری انہیں پسند آجائے! کچھ سمجھے؟"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا کہ مجھے ایک آرڈر مل رہا ہے۔ میں گھر کو پلٹا تو میرے ہاتھ میں ایک درجن سوچی کا دونا تھا۔ یہی ایک مٹھائی تھی کہ کبھی کبھار ہم کھا سکتے تھے۔ اور جیب میں پیسے اتنے ہی تھے کہ ایک درجن سے زیادہ خریدیں۔ ہاتھ میں مٹھائی کی پڑیا لے کر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی لاٹری مل گئی ہے۔ گھر پہنچا تو دروازے ہی میں سے میں نے متسائیو، اپنی بیوی سے کہا کہ آج کا دن یاد رکھنا کیونکہ مجھے پہلا آرڈر ملا ہے! آج کا دن شاید ہماری زندگیوں کو بدل دینے کے آغاز کا دن ہے! اس رات میں اسی خیال میں دیر تک نہ سو سکا کہ پہلے کے بعد دوسرا، پھر تیسرا آرڈر ملے گا۔ اور ملتے ہی رہیں گے۔ اس وقت لوگ میرا پاس و لحاظ کرنے پر مجبور ہونگے .... غرض الفاظ عاجز ہیں کہ میری اس وقت کی کیفیات کو بیان

کرسکیں۔"

"کام شروع کرنے کے بعد بھی میں برابر خواب ہی دیکھتا رہا اور جیسے جیسے کام آگے بڑھ رہا تھا دوسرے خواب دکھائی دیتے جا رہے تھے۔ ہر گھنٹہ الہامات کے عالم رنگ و نکہت میں گزر رہا تھا۔ ہرونو بو سے اشارہ لینا کیا معنی، آدمی اس کی تو نقل کر کے مطمئن ہو سکتا ہے۔ اس کے موقلم سے بنے ہوئے نسوانی چہرے ہماری قومی نقاشی کا سرمایۂ ناز ہیں۔ غیر ملکی گاہک! میں کیا سمجھتا نہیں کہ دوکاندار کا ان لفظوں سے کیا منشا تھا۔ میرا نقش غیر ملکی گاہکوں کو ضرور پسند آئے گا۔ جوان جاپانی عورت، اپنا قومی لباس پہنے، اپنے مُنّے کو گود میں لئے ہے۔ اور پس منظر جاپانی کلاسک کا ہے! میرا نقش ہرونو بو کا نقش اس لئے نہیں ہو گا کہ وہ پچھلی صدی کے ٹائپ پیش کرتا تھا اور میں جدید جاپانی عورت کو پیش کروں گا۔ جو امریکن نوجوانوں کو یقیناً اپنی بیوی، منگیتر یا بہن کی یاد دلائے گی۔"

"جب ہمارے لوگ نعرہ لگاتے ہیں "یانکی اپنے گھر جاؤ" تو میں انہیں بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں۔ یہ امریکن سپاہی ہمارے گنزا میں اس طرح بل مارتے پھرتے ہیں جیسے وہ ان کا براڈ وے ہے۔ نہایت بے ہودہ اور غیر منطقی صورتِ حال! مجھے ان فوجیوں سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے۔ ان میں اکثر تو ایسے نوخیز لڑکے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے۔ جن کو کچھ سکھلایا ہی نہیں گیا ہے۔ اسی لئے یہاں پہنچ کر ان کا سبھاؤ برتاؤ وہ ہوتا ہے یقیناً جس کے لئے ان کی ماؤں نے انہیں جنم نہیں دیا تھا۔ یہاں وہ ساکے، گیشا لڑکیوں اور سمندری غسل کے سوا کوئی قابلِ قدر بات دیکھتے ہی نہیں۔ اور ایشیائی کہہ کر ہماری تحقیر کرنا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں نسلوں کی برتری یا کمتری کا یہ فرضی تخیل کیوں پھیلنے دیا جاتا ہے؟ ان نوعمر امریکنوں کی آنکھیں اس حقیقت کی طرف سے کیوں سی دی گئی ہیں کہ جاپان میں بھی ویسے ہی انسان بستے ہیں جیسے امریکہ میں؟ ان کو یہ حقیقت کیوں نہیں بتائی گئی کہ ساری دنیا کے انسان ایک طرح محبت کرتے، ایک ہی طرح ہنستے اور ایک ہی طرح روتے ہیں؟"

"میں نے کام شروع کیا تو اسی قسم کے خیالات و تصورات میرے اندر ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ اور میں ناواقف تھا کہ ان محسوسات کو رنگوں میں ظاہر کرنا کس قدر دشوار ہو گا۔ آج بھی مجھے یقین نہیں کہ میں پوری طرح کامیاب ہو سکا ہوں، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میرے نقش کا کوئی حتمی اور قطعی موضوع نہیں تھا۔ اور ہماری پرانی صناعت کے پیکر اگرچہ حسین و دلکش ہیں۔ میری ساری توجہ چہروں کے اظہار و تاثر پر رہی اور ماڈل خود میری بیوی اور بچہ تھا! اس کی اصل وجہ تو میری مفلسی تھی کہ ماڈل کی فیس ادا نہیں کر سکتا تھا لیکن دوسری طرف اس سے بہتر ماڈل مجھے بڑی سے بڑی فیس دے کر بھی نہ مل سکتے تھے۔ میری طرح بہت سے نقاش ہیں جو فیس نہ دے سکنے کی وجہ سے ماڈل نہیں لے سکتے۔ ہسائیو بچے کو چمٹا کر جب اس کے سر پر گال

دیکھ دیتی ہے تو اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی ہے ۔ اس منظر کو دیکھنے سے میرا صدمۂ ناکامی شدید تر ہوجاتا ہے ۔ اس لئے میں نظر چرا لیتا ہوں ۔"

"ہمارے یہاں ایک بڑا سوگوار گیت گایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ماں اپنے بیٹے کے لئے اس زندگی کی ایک ذرہ برابر مسرت کی آرزو میں گھلی جارہی ہے ۔ مجھے اس گیت میں ویسی ہی روشنی نظر آتی ہے جیسی اس وقت ہسائیو کی آنکھوں میں آجاتی ہے ۔ میں نے اسی پوز اور اسی چمک کو نقش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

دو ہفتے بعد جب میں نے لکوٹیٹو کی دہلیز او لانگی تو میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ دن روشن اور خوبصورت تھا ۔ سورج کی ایک کرن دوکان کے پالش کئے ہوئے فرش پر اس طرح پڑ رہی تھی جیسے ریشمی کمونو کی کرپیٹی میں میں زرتار چمکتا ہے ۔ میں مطمئن تھا کہ اس روشنی میں نقش کا معائنہ بخوبی ہوسکے گا ۔ دوکاندار کے پاس ایک اجنبی بھی بیٹھا ہوا تھا جو دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھا ۔ جیسا امریکن سیاح بالعموم چڑھائے رہتے ہیں ۔ چوڑا چکلا چہرہ ، آتشک زدہ سی چپٹی ناک اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی چھڑی تھی ۔ اور مونٹھ پر اژدھے کی شکل کندہ کی گئی تھی ۔ دوسرے ہاتھ میں ہاتھی دانت کی سمرنی لئے ہوئے تھا جیسی ہمارے بدھ مت کے پیشوا لئے رہتے ہیں ۔ میں نے اندازہ کرلیا کہ یہ جنٹلمین اپنے آپ کو مشرق کے معاملات پر سند کا درجہ دیتا اور مشرقی رسم ورواج کا ماہر سمجھتا ہے ۔" میرے نقش کو دیکھ کر کہنے لگا :

" اہم م م بری تو نہیں ——— شرطیہ بری نہیں ۔"

"اس کی اس ' اہیم ' کو سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ اٹھی ۔ اور اس کی آواز مجھے مرغ کی اس آواز سے مشابہ معلوم ہوئی جیسی وہ کوبر کریدتے وقت نکالتا ہے ۔ دوکاندار نے جس انداز سے میرا نقش پیش کیا اور جس طرح وہ اس اجنبی کی ہر بات پر ' بجا فرمایا ' کہہ رہا تھا ۔ اس سے میں نے سمجھ لیا کہ میری تقدیر کا فیصلہ اس اجنبی مخلوق کے ہات ہے ۔

' اہیم م م ——— واقعی بری نہیں ؟'

اس نے پھر کہا ۔ صورت حال کے تناؤ میں ذرا سی کمی آئی ۔ تو مجھے اپنا سر چکراتا ہوا اور ٹانگوں میں کمزوری کا احساس ہوا ۔ وہ اجنبی دوکاندار سے کہنے لگا ۔

"میں خریداری تو بہت کرچکا ہوں لیکن پھر بھی اس نقش کے پانچ ہزار دے سکتا ہوں ۔ بشرطیکہ اس پر تھوڑا سا کام اور کیا جائے ۔"

"اب میں سمجھا کہ یہ اجنبی صناعت کا کوئی قدردان نہیں بلکہ ایک تاجر ہے ۔ میں نے ذہن کے اندر حساب لگایا کہ پانچ میں سے زیادہ ملے تو تین اور کم ملے تو دو ہزار میرے حصے میں آئیں گے ۔ اور میں

چیخ پڑنے ہی والا تھا کہ سے لو۔ مگر اس اجنبی نے میری طرف نظر اٹھائی اور پھر شاید مجھ سے مخاطب ہونا غلط سمجھ کر دوکاندار سے بولا:۔

'اس بچے کی تصویر مٹا دینا ہوگی! بدنما لگتا ہے۔ اور ہم کو بیچنا ہے نسوانی رعنائی اور لچک، اس ماڈل کے خدوخال بیشک ولولہ انگیز ہیں۔ مگر اس کا سینہ چپٹا کیوں ہے؟'

"پھر وہ اپنی چھڑی کی نوک کو تصویر کے سینے پر رکھ کر تیلنے لگا۔ میری ہستائیو اور بچے کو چھڑی نوک سے گودنے لگا۔ میرا خون کھول گیا۔ مگر میں نے ضبط کر کے دل کو سمجھایا کہ 'تو تو کنول کے عقیدے کا ماننے والا ہے صبر کر، ان دونوں کے واسطے برداشت کر، وہ اجنبی پھر کہنے لگا:۔"

"بلاشبہ اس نقش کا اسٹائل جاپانی ہے۔ لیکن ہم لوگ ٹوکوگا کے عہد میں تھوڑی جی رہے ہیں۔"

"نیا زمانہ، نیا مذاق، اور پھر پیسہ جن کی جیب سے آتا ہے وہ بیشتر جوان اور چھڑے ہوتے ہیں۔ مانگ ہے جنسی کشش کی!"

اب مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں چیخ پڑا، اور اس حاتہ خور سوٗر سے کہہ دیا کہ اپنے گندے ہاتھ میرے نقش کو نہ لگائے اور پھر میں نے نہایت سکون اور اطمینان سے اپنی کینوس کو لپیٹا اور وہاں سے نکل آیا۔ اس کو دو برس ہو گئے۔ میں اس دوکاندار کے پاس پھر نہیں گیا۔

"ہمارے ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ان دو برسوں میں ہم میاں بیوی جب بستر پہ لیٹتے ہیں تو دماغوں پہ ایک ہی خیال مسلط رہتا ہے۔ کل کا موسم کیسا ہوگا؟"

"پانی برسنے میں کون تصویر بنوائیگا؟ برسات کا موسم گنزا کے نقاشوں کی بدنصیبی کی ایک صورت ہے!"

برابر والے کمرے میں گھڑی نے گیارہ بجائے تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔

"کہیں ٹرین نہ نکل جائے۔ اب ہم لوگ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ مضافات میں کرایہ مکان نسبتاً کم دینا پڑتا ہے۔"

پھر اس نے وہ کینوس اٹھا کر کمال انکسار کے ساتھ میرے سامنے پیش کی۔ اور احساسِ اعتماد کے ساتھ بولا

"اس ناچیز تحفے کو قبول فرمائیے ——— خداحافظ۔"

دوسرے لمحے وہ جا چکا تھا۔ چند سکنڈ قدموں کی چاپ سنائی دی!

اس نقش کو میں نے اپنے کمرے میں ٹانگ دیا ہے۔ اور جب نظر پڑ جاتی ہے اس صناعت سے گہرا اثر لیتا ہوں۔ یہ اثر اس صناعت کا ہے یا اس صناعت بارے سے متعلق کہانی کا ہے۔ میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں۔

ھجر

ایک جوان جاپانی حسینہ اداس، مگر کومل، اپنے منہ کو گودیں اٹھائے اس کے سر پر گال رکھے ہوئے ہے۔ اور اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کی گہرائی میں اپنے بچے کے لئے ایک غیر فانی محبت اور معمولی انسانی مسرت کی کی آرزو کا شعلہ روشن ہے۔

پانی اب بھی برس رہا ہے!

(اے کنز ہن، بحذف و اضافہ)

کجر

رضیہ سجاد ظہیر

الفت

جب بُوا نے آکر نسرین سے کہا کہ ٹیلیفون پر کوئی بلا رہا ہے تو اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ بھلا اسے کون ٹیلیفون کر سکتا ہے، اس نے دوبارہ بوا سے پوچھا "تم نے ٹھیک سے پوچھا بھی تھا کہ ہمارا ہی ٹیلیفون ہے۔"

"ہاں ہاں بیٹیا —— ارے بھلا —— ہم کا بڑی مس صاحب خود کہن کہ بی اے چھٹیل کی نسرین بیٹیا کا بلائے لاؤ۔ ان کا فون آیا ہے۔"

نسرین گھبرائی ہوئی پرنسپل صاحبہ کے دفتر میں پہنچی جہاں ٹیلیفون لگا تھا، پرنسپل صاحبہ کوئی کاغذ دیکھ رہی تھیں، بغیر سر اٹھائے بولیں "نسرین مرزا۔ آپ کا ٹیلیفون ہے۔" اور پھر کاغذات کی طرف متوجہ ہو گئیں نسرین نے ٹیلیفون اٹھایا، گھٹی گھٹی آواز میں بولی "ہلو —— کون ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "کون نسرین —— میں شہلا بول رہی ہوں۔"

"ارے شہلا —— تم —— تم یہاں کہاں —— تم تو ——"

"ہاں ہاں تم لوگ تو سمجھتے تھے کہ میں ولایت جا رہی ہوں تو زندگی بھر وہیں رہوں گی مگر دیکھو میں آگئی نہ۔"

"واہ بھئی کب آئیں اور کیا کر کے آئیں؟"

"بس ابھی آئے ہیں کوئی دو تین دن ہوئے —— ایر سے آئے ہیں۔"

نسرین کو تھوڑی سی کوفت ہوئی —— آخر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ایر سے آئے ہیں! خیر ذرا سا رک کر بولی "تو کیا کیا کیا وہاں —— کوئی ڈگری بھی لی؟"

دوسری طرف سے ہنسی کی آواز آئی "ڈگری لینے کون کم بخت گیا تھا، بس خوب سیر سپاٹا کیا، اور اور بہت کچھ کیا۔ اب تم آؤ تو بتائیں۔ کالج میں کیا ہو رہا ہے؟"

"وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔"

"گھاس کٹ چکی؟" شہلا نے اپنا خاص لفظ استعمال کیا

"ہاں تو کٹ چکی ؟ اب تو جھکڑ چلنے کا پیریڈ قریب ہے۔ پھر اس کے بعد گلزار کھیلے گا۔" ادھر سے نز
نے جواب دیا۔

"اچھا گلزار اب تک آخری پیریڈ میں کھیلتا ہے، بہت تھک جاتا ہوگا۔ بچارا گلزار!" شہلا پھر
"اچھا بھئی اب ہم چلیں، کافی دیر ہوگئی۔"

"تو پھر آرہی ہو نہ ؟"

"بھئی آنے کو جی تو چاہتا ہے۔ مگر دھوپ بہت ہے۔ پھر کسی دن آئیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ ارے ابھی آؤ ——— آؤ نا۔"

"اچھا آجائیں گے۔"

"ضرور آنا"

"ہاں ہاں" ——— نسرین نے ٹیلیفون رکھ دیا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ دفتر سے باہر نکلی
پچھلے چار سال کے واقعات اس کے ذہن میں تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ جب وہ کالج میں آئی تھی اور اس
فیس معاف ہونے کی درخواست دی تھی، پرنسپل صاحبہ نے فرسٹ ڈویژن دیکھتے ہی فیس معاف کر
سفارش کمیٹی سے کر دی تھی لیکن قاعدہ کی رو سے درخواست پر کسی بڑے آدمی کے دستخط ہونے ضروری تھے
اس کی بیوہ ماں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھیں، کسی بڑے آدمی سے ان سے کیا ناتا ہو سکتا تھا۔ سوچتے
وہ اس نتیجے پر پہونچیں کہ میاں شرف الدین جو سول انجنیر صاحب کے یہاں موٹر ڈرائیور تھے ان کے گاؤں
رہنے والے اور ان کے ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ شاید ان کے ذریعہ کام بن جائے۔ میاں شرف الدین نے
ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور شہلا کے والد خورشید حسین سول انجنیر جب اپنی لڑکی کا داخلہ اسی کلاس میں کرا
گئے جس میں نسرین نے درخواست دی تھی تو انہوں نے نسرین کی بھی سفارش کر دی! نسرین کو فیس معاف کر
کالج میں لے لیا گیا!

اس طرح نسرین کی شہلا سے ملاقات ہوئی۔ اسے شہلا بہت اچھی لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ بھی شہ
کی طرح ہو جائے۔ بالکل شہلا کی طرح نہیں! ——— لیکن ——— لیکن ——— اگر شہلا کے جیسے کپڑ
اس کے پاس بھی ہو جائیں۔ تو کیسا اچھا رہے! ایک دن وہ شہلا کے گھر گئی تو اس نے اسے اپنا تصویر دار
البم دکھایا۔ تھوڑی سی تصویریں نسرین کے پاس بھی تھیں۔ لیکن البم ایسا نہیں تھا، اسے وہ البم بہت اچھ
لگا۔ شہلا کا گھر بھی اسے بہت پسند تھا ——— ہر کمرہ ایک الگ رنگ کا تھا اور اس میں اسی رنگ کا ر
سامان، خود شہلا کا کمرہ ہلکا سبز تھا۔ اور اس کی کھڑکیاں جو پائیں باغ میں کھلتی تھیں گہرے سبز رنگ

ں، ہر کھڑکی پر باہر کی طرف سے زرد گلاب کی بیل چڑھی ہوئی تھی، نسرین کو زرد گلاب کی یاد کے ساتھ تھوڑی
[illegible]وفت ہوئی۔ بات یہ تھی کہ ایک دن اس نے یوں ہی ذرا رومانوی موڈ میں ایک گلاب توڑ کر اپنے بالوں میں
[illegible]یا تھا تو شہلا . . . . خیر چھوڑو اس بات کو۔ نسرین کو خود ہی بعد میں احساس ہوا تھا کہ پھول تو پیڑ
[illegible]لگے ہوئے خوبصورت لگتے ہیں۔ ان کو توڑنا کیا معنی! بس شہلا کے ساتھ صرف ایک ہی ہستی ایسی وابستہ
[illegible]جس سے اسے مستقل کوفت ہوتی تھی اور وہ تھے ڈرائیور شرف الدین! ان کا رویہ نسرین کی طرف عجیب تھا!
[illegible]کا مطلب یہ کہ . . . . خیر ــــ یہ تو حقیقت تھی کہ وہ بھی اسی گاؤں کے
[illegible]نے والے تھے۔ جہاں کی نسرین کی امی تھیں۔ ان کے ساتھ بچپن میں کھیلے بھی تھے۔ اس لئے ان کو بہن کہتے تھے
[illegible]ہنے نسرین کے داخلے کے لئے خورشید صاحب سے کہا سنا بھی تھا۔

[illegible]ورنہ خورشید صاحب نسرین کو کیا جانتے اور کیوں سفارش کرتے لیکن اب اس کے یہ معنی تو نہیں تھے کہ کالج
[illegible]پھاٹک کھلا ہے۔ ٹیچرز نکل رہے ہیں، لڑکیاں نکل رہی ہیں۔ نسرین شہلا کی بڑی سی نیلی موٹر کے پائیدان پر
[illegible]پاؤں رکھے اس سے باتیں کر رہی ہے، پھر شہلا ہارن بجاتی ہے۔ تو شرف الدین املی کے درخت کے نیچے
[illegible]خرگوش سے بیدار ہو کر اٹھتے کے ساتھ ہی پہلی حرکت یہ کرتے ہیں کہ انجن کے پاس والے خانے میں سے
[illegible]نیلی سی پوٹلی نکال کے نسرین کو تھما دیتے ہیں۔ "لے بٹیا، یہ تیری ممانی نے کھوریں بنائی تھیں، اماں کو دے
[illegible]لو ــــ یا ــــ کسی بازاری قسم کی چھینٹ کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے" لے بچے
[illegible]اماں سے کہیو مجھلی والی کی فراک سی دیویں گی۔ ذرا ڈھیلی رکھیں گی، مجھلی والی ذرا ٹینٹ ہو گئی تھی چھوٹی
[illegible]ہی پڑی۔ کالر کوئی اچھا سا بنا دیویں گی فینسی سا" ــــ ہا ــــ ہاں اب ابھی دن کی بات لیجئے
[illegible]شہلا کی سالگرہ پارٹی تھی۔ نسرین نے صبح سے چینی کے برتنوں میں گرم پانی بھر کے اپنے کپڑوں پر استری کی تھی۔ جوتا
[illegible]ایک جگہ سے بالکل پھٹ گیا تھا، اس نے موچی کو سمجھا کر دوسرے رنگ کے چمڑے کی دو گول گول چپیاں
[illegible]ان جوتوں پر سلوالیں بس ڈیزائن بن گیا۔ جوتا بالکل نیا لگنے لگا۔ اتنی سب تیاری کے بعد عین جبکہ شہلا
[illegible]کا تعارف اپنی سہیلی نجمہ سے کرا رہی تھی جس کے والد لکڑی کے بہت بڑے تاجر تھے تو شرفو ماموں
[illegible]نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے۔ ان کے ہاتھ میں ڈاک تھی ــــ ڈاک شہلا کو دے کر وہ نسرین سے مخاطب
[illegible]ہوئے۔" اماں سے کہہ دیجیو کہ منڈی والے حافظ جی کا انتقال ہو گیا۔ کل ہی کارڈ آیا تھا تمہاری نانی کا ــــ
[illegible]! ضرور کہہ دیجیو، بھولیو مت ــــ" نجمہ شرفو ماموں کا منہ دیکھنے لگی، شہلا جھک کر پیالیوں میں
[illegible]انڈیلنے لگی۔ اور نسرین نے اپنے جوتوں پر لگی ہوئی لال چپیوں پر نظریں جما لیں . . . .
یکایک نسرین کی ٹھکرا ئی گئی انگریزی کی منہ سے لکھے ہوئے نوٹس بجی۔ پاس کھڑے ہوئے لڑکے [illegible]

گروپ سے ہنسی کی آواز آئی ۔نسرین مڑ کر ان لوگوں سے جاملی ۔

"کیا سوچتی جارہی تھیں جو اتنی بڑی نسیم آپا بھی نہیں دکھائی دیں؟" سعیدہ نے کہا ۔

"شہلا کا ٹیلیفون آیا تھا بھئی ۔"

" اخاہ " نزہت نے زور سے کہا ۔" مٹھائی کھلاؤ تمہاری سہیلی صحیح سلامت واپس آگئیں، ہیں تمہارے ۔"

" بھئی تم لوگ خواہ مخواہ اس سے جلتی ہو ۔ ہم تو یہی برابر کہتے رہے اور اب بھی کہیں گے کہ سب آدمی نہیں بُرے ہوتے ۔"

"کون اس سے جلتا ہے " شمیم جو اپنے کو کمیونسٹ سمجھتی تھی ذرا خفا ہو کے بولی " مگر اب وہ م کہ ہم لوگوں پر اپنے کو لوڈں ، اور ساریوں کا رعب گانٹھے تو یہ تو نہیں ہو سکتا ۔ اگر اچھی طرح ملتی تو ہم اس سے ملتے ، کیا کسی کو اس سے کوئی ذاتی دشمنی تھوڑا ہی تھی ۔"

"جی ہاں اب آپ کو لفٹ نہیں دیتی تھی تو آپ اس کے اخلاق میں برائی نکالئے ۔" نسرین نے ہم "ہم کب اس کو لفٹ دیتے تھے ۔ اسی لئے آپ کو چپکی رہتی تھی اور اس کا بھی ایک سائیکالوجی کل نکتہ تھا اور کوئی اس کو پوچھتا ہی نہیں تھا " عشرت بولی جو سائیکالوجی کی طالب علم تھی !

" انجام بُرا ہے الفت کا کیا جانئے کیا کیا ہوتا ہے ۔" سُریلی آواز والی ساجدہ گنگنانے لگی ۔ سب لوگ کھلکھلا کے ہنسنے لگے ۔

"ارے چلو سب لوگ " پڑھنتو شمیم بولی " گھنٹی بجنے ہی والی ہے ، صفیہ آپا کا ٹیسٹ ہے یہ قصیدے .... "

O

نسرین ساڑھے بارہ بجے کے قریب کالج سے باہر نکلی تو دھوپ بڑی سخت تھی ، ڈامر کی سڑک تک سیاہ لوہے کی لکیر کی مانند تپ رہی تھی ۔ گرد و غبار اور لو سے آسمان پر زردی سی چھا گئی تھی اد لگتا تھا بادل گھر آئے ہیں ، نسرین نے اپنی اماں کی پرانی چھتری کھولی ۔ کتابیں سنبھالیں اور چل پڑی ۔ چنگی پر اتفاق سے ایک رکشہ مل گیا ۔ چار آنہ کرایہ طے کر کے وہ اس میں بیٹھ گئی ، " شہلا تو کرایہ دے ہی دیگی ۔ کئی بار دیا ہے ——— " شہلا کے یہاں پہنچی تو باہر سے سارے دروازے بند تھے ۔ وہ رکشے سے اتر کر برآمدے میں گئی بجائی اور وہیں پڑی ہوئی ایک بید کی کرسی پر بیٹھ کر پسینہ پونچھتی ہوئی رومال سے اپنے کو ہوا دینے لگی ۔ کئی بار گھنٹی کے بعد ایک بیرا نکلا اور " بٹیا تو لنچ پر ہیں ، مہمان آئے ہیں ، کہا ہے آپ ہمارے چھوٹے ڈرائینگ روم

لٹے " کہہ کر اندر چلا گیا۔ نسرین اس سے کیسے کہتی کہ چار آنے پیسے لا دو ٹھیلے سے۔ اس نے کتابوں کے بیچ میں سے اپنی
ں کی ہاتھ کی بنی ہوئی کروشیا کی چھوٹی سی سوتی تھیلی نکالی، پیسے گنے، ایک روپیہ تھا اور چار آنے میں ایک پیسہ
م تھا، رکشے والا تھوڑا سا بڑبڑایا۔ مگر چلا گیا۔ یہی غنیمت ہوا کہ اس نے فضیحتا نہیں کیا۔ اس نے روپیہ احتیاط
سے پھر تھیلی میں رکھ لیا۔ اور سوچ رہی تھی کہ باہر ہی بیٹھی رہے یا اندر ڈرائینگ روم میں چلی جائے کہ اسے
نزو ماموں دور سے اچانک سے آتے دکھائی دیئے، ان کے ایک ہاتھ میں موبل آئیل کا ڈبہ تھا دوسرے میں جلتی
ہوئی سگریٹ ——— اپنی خاکی وردی پہنے، موبل آئیل کا ڈبہ ہلاتے، سگریٹ کے کش کھینچتے، وہ بڑے
نرے میں اینڈتے چلے آ رہے تھے ——— ان کو دیکھ کر نسرین نے فوراً فیصلہ کر لیا اور قبل اس کے کہ شرفو
ماموں اسے دیکھیں وہ اندر ڈرائینگ روم میں گھس گئی! کتابیں شہلا کی میز پر رکھ دیں اور خود پنکھا کھول کر
کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہاں ٹھنڈا تو ضرور تھا۔ لیکن وہ اس ٹھنڈک سے کیا خاک لطف اٹھاتی جبکہ اسے سخت
بھوک لگی تھی، بار بار اسے خیال آتا کہ دیکھو شہلا نے جھوٹوں بھی کھانے کو نہیں پوچھا حالانکہ گھر میں کھانا ہوا
تھا! ٹھیک کہتی تھی شمیم۔ نہیں بھئی آخر شہلا نے اسے کھانا کھانے کو کب کہا تھا۔ اگر کہتی تو ضرور ہی بلوا لے
جاتی۔ آخر کئی بار وہ شہلا کے یہاں کھانا کھا چکی تھی۔ ——— مگر لنچ پر مہمان آ رہے تھے۔ تو اس نے
گیارہ بجے ٹیلیفون کیا تھا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا، ہو سکتا ہے اچانک مہمان آ گئے ہوں! لیکن ایک آدمی کا
کھانا ہی کیا ہے ایک آدمی تو ہمارے یہاں اچانک آ جائے تو کھا سکتا ہے!

اتنے میں شہلا تولیہ سے ہاتھ پونچھتی اندر کے کمرے سے نکلی، " ہلو نسرین " اس نے کہا اور پاس ہی کرسی
پر بیٹھ گئی۔ اس کے پیچھے تین چار لڑکیاں اور تھیں، جن کو نسرین نہیں جانتی تھی، تعارف ہوئے۔

شہلا نے الماری میں سے تاش نکالے۔ " بھئی رمی "۔

" نہیں بھئی برج "

برج شروع ہو گیا۔ نسرین کو برج نہیں آتا تھا، وہ دوسروں کو کھیلتے دیکھتی رہی، ایک لڑکی سلمہ نے
نسرین سے کچھ باتیں کیں " آپ کہاں پڑھتی ہیں "

" مسلم کالج میں "

" اچھا وہاں تو ابھی تک پردہ ہوتا ہے ——— ہم نے مسلم کالج کی بسیں دیکھی ہیں جیسے ردی کے
کٹھرے، اس میں بیٹھنے بڑا جی گھبراتا ہوگا، آپ لوگوں کا "

" میں بس میں نہیں جاتی ہوں " نسرین نے جواب دیا۔

" ویسے آپ رہتی کہاں ہیں " ایک اور لڑکی نے سوال کیا۔ جس کی ناک طوطے کی طرح تھی اور سر کا

دنبالہ تقریباً کنپٹیوں تک کھنچا ہوا تھا۔

"مولوی گنج میں"

"مولوی گنج میں؟" سلمہ نے سر کھجایا۔ "امین آباد کے پاس۔"

"اس سے ذرا آگے ہے۔" شہلا نے پتہ چلتے ہوئے کہا۔ "وہیں جہاں سے کل مون لائٹ پک نک لئے ہم لوگوں نے کباب خریدے تھے۔"

اوہ۔ اچھا " طوطے کی ناک نے نسرین کی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے کہا جیسے کہتی ہو "اچھا! آ وہاں رہتی ہیں تو یہاں آپ کا کیا کام ، اور وہ شہلا سے مخاطب ہو گئی۔

"گرمیوں میں کہاں جاؤ گی شہلا؟"

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں ـــــ ڈیڈی کی مرضی پر ہے۔"

"بھئی چاہے جہاں جاؤ ـــــ نینی تال مت جانا ـــــ وہی صورتیں دکھائی دیتی ہر لکھنؤ میں روز حضرت گنج میں دیکھ لو ـــــ" پھر آنکھ مار کے بولی "پچھلے سال وہ پورے کا پورا ہم ہوا تھا۔"

شہلا زور سے معنی خیز ہنسی ہنسی "اچھا ـــــ بھئی ہم نہ ہوئے یہ دیکھنے ـــــ ہم سوئٹزرلینڈ میں تھے۔ اس وقت اور ....

"شہلا ہم کو پہونچوا دو بھئی۔" طوطے کی ناک نے کہا۔

"جانا۔ جلدی کیا ہے۔ ایک گیم اور ...." شہلا پتے پھینٹ رہی تھی۔

"نہیں بھئی ممتاز انکل آئے ہیں، وہ کل ہی چلے جائیں گے، ضد کر کے تو ان سے اس وقت مِلنے پھر پہونچیں گے نہیں تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"ایسی گرمی میں اب آپ سینما جائیں گی" نسرین نے بات چیت میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"گرمی کیا۔ یہاں سے موٹر میں سیدھے مے فیر چلے جائیں گے۔ وہ تو ایر کنڈیشنڈ ہے!"

اس کے جانے کے چند ہی منٹ بعد نسرین نے بھی چلنے کو کہا۔ شہلا نے بس رسمی طور پر اس سے رکنے کو کہا اور پھر اجازت دے دی۔ جب نسرین سیڑھیوں سے اتر رہی تھی تو اس نے سنا "یہ پیدل چلی جائیں گی اس دھوپ میں؟ چندر کے ساتھ ہی لفٹ کیوں نہیں دے دیا؟"

"نہیں وہ چلی جائیں گی۔ شی از یوزڈ ٹو اِٹ! کالج بھی پیدل ہی آتی ہیں ـــــ آؤ ایک گیم اور

نسرین بس اسٹانڈ کے نیچے کھمبے سے لگی کھڑی تھی۔ خورشید لاج سے نکلتے وقت اس نے پھاٹک تک

ری نہیں کھولی تھی کیونکہ چھتری میں دو چار جگہ چھید تھے ، اس لئے پھاٹک تک آتے آتے اس کا سر دھوپ سے
رانے لگا تھا ، پسینہ اس کے سر پر سے بہہ بہہ کر سستے قسم کی کالی عینک کے شیشوں کو بار بار دھندلا دیتا
ا ۔ تلوؤں میں جوتوں سے ہو کر زمین کی تپش انگاروں کی طرح محسوس ہو رہی تھی ، لو کے جھونکے طمانچے کی طرح
لوں پر لگ رہے تھے اور جو موٹر گذرتی تھی وہ اس قدر مٹی اڑاتی تھی کہ نسرین چھتری کو کندھے پر ٹکا کر دونوں
تھوں پر رومال پھیلا کے اپنا پورا منہ چھپا لیتی تھی ۔ کسی طرح بس آ بھی چکے اور وہ اپنے گھر کے ٹاٹ پڑے
ہے دالان کی کوٹھڑی میں پہنچ جائے ۔ اس کی اماں کھانا لئے بیٹھی ہوں گی ، چنگیر میں روٹی ، کٹورے میں ماش
دال ۔ کھانا کھا کر وہ چٹائی کے ٹھنڈے فرش پر صاف چادر بچھا کر لیٹے ——— ٹھنڈی صراحی پر بار بار
ہاتھ رکھ کر اپنے گالوں کو لگائے اور اس کی اماں . . . . بھوک کے مارے الگ چکر آ رہے تھے
آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑتی دکھائی دیتی تھیں ۔

ایک موٹر سامنے سے دھواں اڑاتی نکل گئی ، نسرین نے رومال سے منہ چھپا لیا ۔ اور کھانسنے لگی ،
کھانسنے کے بعد اس نے تھوکنے کو رومال منہ سے ہٹایا ۔ موٹر یکایک رک کر پیچھے ہو رہی تھی ! اس نے کھمبے
سے پیٹھ لگا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا ——— اب تو اور بھی مٹی آئے گی سیدھی منہ ہی کے اوپر ۔

پھر اس نے موٹر بالکل پاس آ کر رکنے کی آہٹ سنی اور پٹ زور سے کھلنے کی آواز ——— نسرین
نے مڑ کر دیکھا تو شرفو ماموں اس میں سے جھانک رہے تھے ۔ " کے تو ' دھوپ میں کیا ہو رہا ہے بٹیا ، ہیاں کاہے
کھڑی ہے ۔ "

" گھر جانے والی بس یہاں ہی ملتی ہے شرفو ماموں ۔ " اس نے سر جھکا کے جواب دیا ۔

" اے واہ تو کیا گھنٹہ بھر بس نہ ملے گی تو تو گھنٹے بھر یہیں کھڑی رہے گی ۔ چل آ موٹر میں بیٹھ ۔ ابھی
گھر پہونچائے دوں ہوں ۔ " پھر انجن اسٹارٹ کر کے انھوں نے اوزاروں کے خانے میں سے ایک میلا سا پوسٹ
کارڈ نکالا ۔ اور اسے دیتے ہوئے بولے " یہ اماں کو دے دیجو ۔ کہیو آم کے باغ اچھے داموں اٹھ رہے
ہیں اگر بیچنا چاہیں تو کل مجھے کالج میں بتا دیجو جب میں چھوٹی بٹیا کو پہنچانے آؤں گا ۔ میں اپنا باغ بھی
بیچے جا رہا ہوں ۔ ان کا بندوبست بھی کر دوں گا ۔ اچھا ۔ بھولیو مت ۔ "

گجر

کرتار سنگھ دُگل

جھُوٹ جیسا سچ

یہ ہوٹل کناٹ پلیس ہے، شاید دلی کا سب سے بڑا ہوٹل۔ وہ اور اس کی دوست صبح سے پریشان ہو رہے تھے ——— "یہاں جگہ کہاں ملے گی؟" ایک نے جھنجلا کر کہا۔ "پتہ لگائے لیتے ہیں" ——— دوسرے نے بیدلی سے جواب دیا، اور دونوں اوپر چڑھ گئے۔

ایک نہیں بلکہ دو کمرے خالی تھے۔ وہ حیران رہ گئے۔ اس کی دوست نے فرطِ مسرت سے ہلکے سے اس کی چٹکی بھری۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو گاہک اور کھڑے تھے۔ دو مرد، بیاہی مائل سے۔ دوسرا کمرہ انھوں نے لیا۔ جب بیرا انھیں کمرے میں لے جا رہا تھا، لڑکی نے مڑ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے گاہکوں کو دیکھا۔

"موت کی طرح پیچھا کر رہے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔ وہ شاعر تھا۔

"دونوں یرقان کے مریض معلوم ہوتے ہیں۔" لڑکی نے اندازہ لگایا۔ وہ ڈاکٹری کا امتحان دے رہی تھی اور پھر وہ اپنے اور یہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تیسرہ نمبر اور چودہ نمبر۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے لڑکے نے ایک نگاہ اپنے پڑوسیوں پر ڈالی۔ "ایک اندھا ہے اور دوسرا کانا۔" اس کے اندر چھپے ہوئے مرد نے محسوس کیا۔

"ایک کو ذرا زیادہ بخار ہے، دوسرے کو ذرا کم۔" لڑکی کے اندر چھپی ہوئی عورت نے اندازہ لگایا۔

اور پھر اپنے اپنے کمروں میں، غالیچوں پر، گدیلوں پر، صوفوں ——— وہ انھیں بھول گئے اور یہ انھیں۔

"آپ غسل کر لیں پہلے۔ پھر کھانے کا وقت ہو جائے گا۔" اور پھر لڑکی نے سوٹ کیس کھول کر چیزیں باہر نکال نکال کر رکھنے لگی۔ اور اسی طرح جب تک لڑکا نہاتا رہا، لڑکی کچھ نہ کچھ کرتی رہی۔ پھر اس نے ایک کتاب اُٹھالی ——— "بھائیو، بہنو!" ——— یہ گاندھی جی کی تقریریں تھیں جو انھوں نے پرارتھنا سبھا میں کی تھیں۔ لڑکی کو گاندھی جی سے انتہائی عقیدت تھی ——— "مسلمان میرا بھائی ہے۔" اس کے کانوں میں گاندھی جی کے الفاظ گونجے۔ وہ کتنی محبت سے، کتنے اشتیاق سے، کتنی سچائی سے، کتنی سادگی سے کہتے تھے۔ امت الرسول اور سوشیلا نیر دو بہنیں تھیں ——— اور موہن داس کرم چند گاندھی اُن کے باپ تھے۔ کناٹ پلیس میں جب

ہ رہی تھی، دکانیں لوٹی جا رہی تھیں، چھرے چل رہے تھے، گولیاں چھوٹ رہی تھیں، ہوسٹل کے تمام مسلمان ملازم
ے گئے تھے، ہندو اور سکھ لڑکیاں ٹولیاں بنا بنا کر گھر گھر پھیرا کیا کرتیں اور یہ اُن کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھتی۔ شام کو جب
وہ پرارتھنا سبھا کا ریکارڈ بجایا جاتا، کمرے میں بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی ابھی باپو
ے اپنی گودی میں لے لیں گے۔

سوٹ کیس میں گاندھی جی پر ایک اور کتاب پڑی تھی۔ ایک اور۔ ایک اور۔ اردو میں، ہندی میں، انگریزی میں
یوں کتابوں کو الٹتے پلٹتے لڑکی اچانک چونک پڑی: "کھڑاک" ـــــ بغل کے کمرے سے ایک آواز آئی: تیرہ نمبر
رہ میں کم بخار والا لیٹا ہوا تھا، زیادہ بخار والا بے چین تھا۔ اتنا بڑا کام ابھی سامنے پڑا تھا، اور بخار تھا کہ کم ہی
ہیں آتا تھا۔ اور اسے ہر شئے پیلی پیلی سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دھوبی کی دھلی ہوئی سفید براق دھوتی نکالی اور
لنگ پر پڑے ہوئے اپنے ساتھی سے پوچھا ـــــ "کیا رنگ ہوگا اس کا؟"

"پیلا!" اس نے جواب دیا۔

"ان سبھوں کو سفید کر دیں گے ـــ" اور پھر جیسے دونوں گا اٹھے۔ کم بخار والا نرم سے لہجے میں اور زیادہ
ر والا اکڑ کر، اینٹھ کر۔

"یہ بغلی کمرے میں یرقان کے مریض نجانے کیا کھڑ پڑ کر رہے ہیں۔" لڑکی نے لڑکے سے کہا جو نہا کر باہر نکل رہا تھا۔
ـــ "کبھی ٹرنک کھلتے ہیں کبھی بند ہوتے ہیں، کبھی کچھ گرتا ہے کبھی کچھ ٹوٹتا ہے"

"دماغ خراب ہوگا" لڑکے نے کپڑے پہنتے پہنتے کہا۔

کھانے کے کمرے میں بھی تیرہ نمبر کی میز چودہ نمبر کے نزدیک تھی۔ قاعدہ کے مطابق چودہ نمبر کے بعد میں آنے
والے جوڑے نے اپنے پڑوسیوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بیٹھ گئے۔ ایک نے سفید براق دھوتی پہن رکھی تھی اور
دوسرا خاکی نیکر قمیص میں ملبوس تھا۔ ان میں سے ایک ذرا زیادہ سیاہی مائل تھا، دوسرا ذرا کم۔ دونوں چپڑ چپڑ کھا رہے
تھے۔ روشندان کو چیرتی ہوئی ایک چمکیلی کرن خاکی نیکر والے آدمی پر پڑ رہی تھی۔ ملگجا سا یہ مرہٹہ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ندی
کنارے کا مینڈک۔ نوجوان لڑکا اور لڑکی باتیں کر رہے تھے۔

"آج دوپہر کو ......" انھوں نے سوچا۔ "باہر نہیں جائیں گے" انھیں اس قدر اہم فیصلہ کرنا تھا۔

"اور برلا مندر؟" لڑکی نے شام کے پروگرام کی بابت پوچھا۔

"آج نہیں کل چلیں گے۔" لڑکے نے رکتے رکتے کہہ دیا۔ لڑکے کا انتظار کرتے کرتے لڑکی کئی ہفتوں سے باپو
کی پرارتھنا سبھا میں نہیں گئی تھی۔

"بس تب گئی تھی جب باپو نے برت کھولا تھا ـــــ ہاں بھلا آج کیا تاریخ ہے؟" لڑکی نے لڑکے سے پوچھا

اور لڑکا ابھی بتانے ہی لگا تھا کہ بغل کی میز سے آواز آئی "...... آج تیس تاریخ ہے جنوری کی تیس تاریخ۔ تیس ہو انیس سو اڑتالیس ـــ" نوجوان لڑکا لڑکی حیران ہو رہے تھے۔ ایسے شریفانہ ہوٹل میں اس طرح کے غنڈے ٹھہرتے ہیں۔ لڑکی نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں۔ مجھے تو کوئی ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ او جلدی جلدی کھانا ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں آگئے۔

کھانا کھا کے وہ اپنے کمرے میں آگئے اور اخبار دیکھنے لگے۔ اگر اخبار نہ دیکھتے تو دونوں بیٹھ کے سوچتے اور اپنی مشکل کا حل ڈھونڈتے۔ اور ان کی مشکل بھی تو کوئی آسان مشکل نہیں تھی ـــ "آج کل ہمدردی بھی آئے ہوئے ہیں ـــ" لڑکے نے اخبار پڑھتے پڑھتے بلند آواز سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ کئی دنوں سے وہ پرارتھنا سبھا میں باپو کے ساتھ ہی بیٹھتے ہیں۔" لڑکی کو روز کی ڈائری کا علم رہتا تھا

"کاش مہاتما جی کچھ عرصہ پہلے ہی پیدا ہوئے ہوتے ـــ"

"ہاں! تب تو آج تک ہندو مسلم جھگڑا مٹ چکا ہوتا۔"

"اور پھر ـــ اور پھر ـــ" جیسے دونوں ایک دم بول اٹھے۔ ایک نوجوان مسلمان لڑکی ـــ ایک نوجوان سکھ لڑکا وہ ایک دوسرے کو کس قدر چاہتے تھے۔ جیسے لڑکی ازل سے کہتی "تو میرے سپنوں میں بسا کرتا تھا۔ اس سے بہت پہلے جب میں نے تجھے دیکھا۔ میں تیرے متعلق سنا کرتی تھی تو میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اور پھر میں نے تجھے دیکھا جیسے ندی سمندر کے قریب آتی ہے، میرا جی چاہا کہ ایک لہر بن کر تیرے اندر کھو جاؤں۔"

لڑکا محسوس کرتا' اس بار پاکستان میں اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اس کے سپنوں کی موت' اس کے پیار کی موت' ان رشتوں کی موت جنھیں اس نے اپنی جوانی کے خون سے پالا پوسا تھا۔ وہ بھائی' بھائی نہیں رہے تھے جو ایک دوسرے کے لئے ترسا کرتے تھے۔ وہ دوست' دوست نہیں رہے تھے جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ نازک کلیاں جنھیں اس نے اپنے آنسوؤں سے سینچا تھا' انھیں پہچاننے سے منکر تھیں۔

اور لڑکی کہتی ـــ "میں تجھے سب کچھ بھلا دوں گی ـــ" اور لڑکے کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو یوں لگتا جیسے وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔

کھوئے کھوئے سے' چپ چپ سے' وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے' شکست' خالی خالی نگاہوں سے
یہ چیز کتنی آسان ہے مگر کتنی مشکل ـــ

یہ چیز کتنی آسان ہے مگر کتنی مشکل۔ بعینہٖ وہ یہی سوچ رہا تھا۔ بغلی کمرے میں لیٹا ہوا وہ آدمی جس کا بخار اور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ کم بخار والے کا بخار اب بھی کم تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا آنکھوں میں کاجل لگا رہا تھا ـــ "کاش کہ میں عورت ہوتا!" وہ سوچتا ـــ "میں عورت ہوتا: میں عورت ہوتا!! ـــ"

زیادہ بخار والے کا بخار اور بڑھ رہا تھا ——— "کتنا آسان تھا" اس نے کم بخار والے سے کہا کہ وہ دونوں "چیزیں" اسے پکڑا دے ——— ایک تو ایک' وہ تو ان سے چودہ ستاروں کو بھی توڑ سکتا تھا' آسمان کو گرا سکتا تھا' او پھر یہ دھرتی اس کی ہو جائے گی — پھر نیا چاند اُبھرے گا' پھر ندیاں ٹھکیں گی' پھر کونپلیں پھوٹیں گی۔ نہیں' یہ پیلا رنگ کوئی چیز سُرخ نہیں رہے گی — پیلے رنگ سے اسے نفرت تھی۔ چاروں طرف پیلا رنگ مسلط تھا۔ ...ٹھ..." اس نے کمرے کی دیوار کی طرف دیکھا' دیوار پیلی تھی۔ اس کا جی چاہا' اپنے ہاتھ میں اس "چیز" کو گھما کر اپنی چھاتی پر رکھے اور پھر گھوڑا دبا دے۔ خود بخود چیزیں لال ہو جائیں گی' کالی ہو جائیں گی' سفید ہو جائیں گی۔ اور پھر اس "چیز" کی نالی جیسے مُڑنا شروع ہو گئی۔

کم بخار والے نے زیادہ بخار والے کو آ کر جھنجھوڑ دیا۔ "یوں ——— اس چیز کو نیچے نہیں گرانا چاہئے۔"

چودہ نمبر میں وہ پھر چونک پڑے' جوان لڑکا اور جوان لڑکی۔ تیرہ نمبر والے کس طرح کے آدمی تھے' پھر "کھٹاک" — ! ...والا کیا انہیں اس قدر مشکل مسئلے کا حل تلاش کرنا تھا۔ کاش کہ وہ آج شام تک ہی سہی' یہ کھٹ پٹ بند کر دیں۔ کاش!

ایک پڑھی لکھی مسلمان لڑکی' ایک پڑھا لکھا مسلمان لڑکا۔ کیا حق تھا انہیں کہ ایک دوسرے کو چاہیں۔ گورونانک کا ...ت اور تھا جب ان کے ایک پہلو میں بالا بیٹھتا تھا اور دوسرے پہلو میں مردانہ۔ آج سکھ مسلمان سے بہت دُور چلے گئے تھے ...یہ' جو دونوں خدا کی وحدت میں یقین رکھتے تھے۔ کس بُری طرح سکھوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا' صرف اس لئے کہ وہ مسلمان تھے ...پھر مسلمانوں نے کس طرح سکھوں کے کیسوں کو پکڑ پکڑ کر گھسیٹ گھسیٹ کر ہلاک کیا تھا۔ کس طرح مسلمانوں کے محلّوں پر محلّے ...وں کے گاؤں تباہ و تاراج کر دیئے گئے تھے۔ اور یہ زخم ابھی تازہ تھے۔ ابھی تو اُن تلواروں سے لہو نہیں اُترا تھا جو خون میں ...نی رہتی تھیں۔ ابھی تو اُن چھُروں کو صاف بھی نہیں کیا گیا تھا جو اپنے پڑوسیوں کے سینوں میں کھُبتے رہے تھے۔ اور ایک نوجوان جس کی قوم نے وحشیوں کو جنم دیا تھا جنھوں نے انسانیت کو شرما دیا تھا۔ اور ایک مسلمان لڑکی جس کے دین کے ...یوں نے درندوں کو بھی مات کر دیا تھا ——— کیا وہ اس طرح سوچ سکتے تھے ——— نہیں! نہیں!! نہیں!!! ——— ...تین بجا رہی تھی' اور لڑکا اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے لڑکی کی جانب دیکھ رہا تھا' اور اپنی آنکھوں میں آنسو ...ے لڑکی' لڑکے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک منٹ بعد بغلی کمرے سے گھڑی کی آواز آئی ——— "آج' آج' آج!!" گھڑی نے تین بجائے ——— "آج یا پھر کبھی ...ں" ——— "یہ کام کوئی جیالا ہی کر سکتا تھا۔" اور سامنے کم بخار والا پڑا تھا جس کا بخار بڑھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ تصویروں کو تکتا ...ور میں بڑبڑا رہا' پلنگ پر آ کر اپنے ساتھی کے قریب بیٹھ رہا' لیکن پھر بھی وہی کا وہی رہا۔ "بزدل!" زیادہ بخار والے نے ...دل میں نفرت کے ساتھ کہا۔ اور پھر زیادہ بخار والا سوچتا' اگر یہ تصویر اس کے اوپر آ گرے ——— ؟ یہ ہوا ان کے کمرے ...سے کو کیوں لگاتا۔ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اندر غسل خانے میں نل کا پانی "ٹپ ٹپ" گر رہا تھا۔ کیا اس آواز کو کوئی بند نہیں کر سکتا؟

کھجر

—— آج آدمی نہ آجائے بادل نہ کڑکنے لگیں —— یہ موٹریں کبھی کبھی فیل بھی ہو جاتی ہیں لیکن اُڑ بھی سکتی ہیں۔ کوئی چاہے تو دنیا بھر کو خرید لے۔ کوئی چاہے تو دنیا بھر کو توڑ پھوڑ کر مسل مروڑ کر رکھ دے۔ ایٹم بم گھر گھر ہونا چاہئے، ایک ایک آدمی کے قبضے میں۔

" تیرا بخار تیرے سر کو چڑھا آرہا ہے "۔ کم بخار والے نے زیادہ بخار والے کو نظروں ہی نظروں میں کہا۔ اور زیادہ بخار والے نے غصے میں آکر نزدیک سے ایک چیز اٹھائی اور کم بخار والے پر دے ماری۔

" کھڑاک " ! —— پھر آواز آئی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے لڑکی چونک اٹھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے لڑکا چونک اٹھا۔ یہ لوگ کبھی فیصلہ نہیں ہونے دیں گے۔ کتا پڑوس میں کسی کا نہ ہو۔ لڑکی کا امتحان ختم ہو رہا تھا —— " آج ورنہ پھر کبھی نہیں —— فیصلہ ضرور کرنا تھا۔ اور پھر لڑکا کل واپس جا رہا تھا۔ اگر آج فیصلہ نہ ہوا تو پھر امتحان کے بعد وہ کہاں جائے گی؟ —— دور کہیں دور —— جہاں سے پھر کبھی واپس نہیں آیا جاتا۔ اجنبی دیس۔ اس دیس کے لوگ کتنے خود غرض بنتے جا رہے تھے! وہ یہ فرشتہ جو خدا نے بھیجا خدا کے پاس لوٹ جائے گا۔ یہ دیس، جہاں وہ پیدا ہوئی، پلی اور بڑھی، اب اجنبی ہو رہا تھا۔ اپنے دیش کو کوئی کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ اپنے دیش کے لئے تو جان بھی قربان کی جا سکتی ہے۔

لڑکے نے لڑکی کو بتایا، وہ پودا جو انھوں نے پانچ سال پہلے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر لگایا تھا، آج پھولوں کے بوجھ سے جھک رہا تھا! لڑکی کو یاد آیا کہ آج سے پانچ سال پہلے اس نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، ایک کمرے میں وہ میز پر بیٹھا تھا، جیسے وہ ایک سپنا ہو۔ اور وہ ڈر رہی تھی، کہیں وہ اس کے ساتھ کوئی بات نہ کر بیٹھے۔ اس سے اپنے دل کا بھید چھپایا نہیں جائے گا —— اور وہ ایک پھول کی طرح چپ بیٹھا رہا، چپ بیٹھا رہا۔

" کرنا تو ضرور ہے "۔ پھر جیسے یکبارگی دونوں بول اٹھے۔ ایک نوجوان سکھ لڑکا، ایک نوجوان مسلمان لڑکی —— " لیکن کس طرح کرنا ہے؟ " اس بات کا فیصلہ کرنا تھا۔

" کس طرح کرنا ہے؟ " اس بات کا فیصلہ بھی وہ کر کے آیا تھا۔ تیرہ نمبر میں وہ آدمی جس کا بخار برابر بڑھتا جا رہا تھا، " کس طرح کرنا ہے؟ " یہ تو کم بخار والا بھی جانتا تھا۔ زیادہ بخار والے کے سامنے جیسے تصویریں سی اُبھر رہی تھیں۔ ایک دھرم، ایک دیش۔ اور وہ وہ وہ کر مسکراتا، کبھی اونچی اونچی آواز میں ہنس دیتا۔ پھر اس نے کم بخار والے کو اپنے پلنگ کے قریب بلایا جیسے کوئی سویا سا ہو۔ اس کی آنکھیں کسی چیز کو تاک رہی تھیں۔ اس نے ایک کہانی کہنا شروع کی۔

ایک تھا راجہ۔ ایک دن اس نے کہا، آج میں انصاف کروں گا۔ چنانچہ عدالت لگی۔ پہلا مقدمہ پیش ہوا۔ یہ ایک بچہ کا تھا جس کی دو مائیں دعویدار تھیں۔ ایک کہتی " یہ میرا بچہ ہے "۔ دوسری کہتی " یہ میرا بچہ ہے "۔ راجہ حیران تھا۔ بالآخر اس نے کہا، بچے کو بانٹ دیں گے۔ اس نے اپنی تلوار سونت لی تاکہ بچے کے دو ٹکڑے کر دے۔ اصلی ماں تڑپ اٹھی " ٹھیک ہے سارا بچہ اسے دے دو۔ اسی کا ہے، میرا نہیں "۔ لیکن نقلی ماں نے کہا " نہیں، میں تو آدھا ہی لوں گی "۔ اور انصاف پسند راجہ کی تلوار اٹھی اور بچے کے دو ٹکڑے ——
اور زیادہ بخار والا زور زور سے ہنسنے لگا۔

گجر

کتنے روز سے ہنس رہا تھا وہ ـــــ "کیا ان تیرہ نمبر والوں کو انسانیت کے اصولوں کا بھی علم نہیں ہے؟" لڑکی نے
جھنجلا کر لڑکے کی طرف دیکھا۔

"دنیا وحشیوں سے بھری پڑی ہے، یہ تو صرف ہنس رہے ہیں۔ ورنہ اس طرح کا انسان تو اس سے بھی زیادہ خوفناک ہو
سکتا ہے" لڑکے کی نگاہوں نے جواب دیا۔

"لیکن اس کی ہنسی تو یوں لگتی ہے جیسے کوئی گولی چلتی ہے، جیسے بم پھٹتے ہیں" لڑکی کی آنکھوں نے شکایت کی۔

"تو سچی ہے، تو عورت ہے۔ عورت کی حس زیادہ تیکھی ہوتی ہے" لڑکے نے بغیر بولے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

اور لڑکی کا دل دھڑکنے لگا جس طرح ایک بار پہلے بھی دھڑکا تھا، اس وقت جبکہ کناٹ پلیس میں رات بھر آگیں سلگتی رہی،
نیں لوٹ کھسوٹ مچی رہی تھی، گولی چلتی رہی تھی، اور پھر خبر آئی کہ فسادی اس کے کالج پر بھی حملہ کریں گے۔ وہ سوچتی کیا یہ ہندو
ن تمام مسلمانوں کو مار ڈالیں گے ـــــ اور پھر اسے خیال آیا کہ بغلی کمرے والے بھی ہندو ہی ہوں گے۔ جبھی تو اس کے اندر چھپی ہوئی
لمان لڑکی کانپ کانپ جاتی تھی ـــ پھر اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی جب تک گاندھی زندہ ہے، ہندوستانی بیڑے کا یہ ملاح
زندہ ہے ـــ کل ہی تو وہ ان کی پرارتھنا سبھا میں جائیں گے۔ ان کے ہمراہ اس کا سکھ دوست ہوگا جس نے آج تک باپو کے درشن نہیں کئے تھے
وہ سوچتی، میں باپو سے کہوں گی۔ "باپو! آپ مشکل کا حل بتائیں" اور وہ مسکرا پڑیں گے، ہنس اٹھیں گے جیسے ان کا مشن پورا ہو رہا ہو۔

"آج میرا مشن پورا ہو کر رہے گا" زیادہ بخار والا بولے بھی جا رہا تھا اور کپڑے بھی پہنتا جا رہا تھا۔ خاکی نیکر، خاکی قمیص،
ی بوٹ ـــ "مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں کچھ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں" اور وہ سوچتا رہا، کس طرح ایک مرتبہ تاج محل
ر اس کا جی چاہا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، اور پھر وہ سنگ مرمر کی سلوں پر جیسے بے ہوش سا ہو کر گر پڑا تھا۔ کوئی کہتا اسے مرگی ہو گئی ہے
کہتا اسے غش آگیا ہے ـــ اور پھر کس طرح ایک دن چودھویں رات کے چاند کی چاندنی میں موتیے سے لدی ہوئی اپنی بھرپور
بیوی کو دیکھ کر اس کے منہ سے جھاگ نکل آئی تھی، اور کمپنی باغ کی بیر بہوٹیوں پر اس نے اسے زور سے دھکا دے دیا تھا۔ متھرا کے سب سے
مندر میں کرشن کی سب سے بڑی مورتی کو دیکھ کر اس کے بازوؤں میں اینٹھن شروع ہو جاتی اور بخار نے کیا کیا کچھ اس کے دل میں ابھارتا رہتا ـــ
پرستار تھے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تھے ـــــ اور "آج، آج، آج" گھڑی نے چار بجائے وہ بالکل تیار تھا۔ نیچے موٹر کے
کی آواز آئی۔ وہ بالکل تیار تھا۔ اس نے کم بخار والے کی جانب دیکھا۔ وہ پھر شیشے کے سامنے کھڑا آنکھوں میں کاجل لگا رہا تھا۔
ل" زیادہ بخار والے نے پھر دل ہی دل میں نفرت کے ساتھ کہا اور ریڈیو کے بٹن کو گھما کر باہر نکل گیا۔ کم بخار والے نے اپنے ساتھی
جلتے ہوئے دیکھا اور پھر ریڈیو کی طرف دیکھا جو گرم ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے اچانک سرمے کی شیشی گر گئی۔

پھر آواز آئی ـــ لیکن اب کمرے میں لڑکا اور لڑکی چائے پی رہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے متعلق وہ رات کو سوچیں گے
ہونٹوں میں سے آنچ آنا بند ہو جائے گی۔ دن بھر جیسے درمیانی دیوار میں سے پھوٹ پھوٹ کر شعلے سے نکل رہے تھے، اور انھیں
ٹیں سی لئے جا رہے تھے۔ اس کمرے کی سمت سے آتی ہوئی یوں محسوس ہوتی جیسے سیلی سیلی، بھیگی بھیگی، ٹپکی ٹپکی۔

اور پھر ہنستے کھیلتے دونوں تیرہ نمبر کے کمرے کو بھول گئے۔ رات کو انھیں فیصلہ کرنا تھا، تو شام کیوں فکر و غم میں گنوائی جائے ــــ لیکن پھر بھی، لڑکی سوچتی، کتنا مشکل تھا یہ فیصلہ کرنا۔ کون جانے اُن کی بھی یہ آخری رات ہو۔ اور لڑکا ہنستا ہنستا باتیں کرتا کرتا کھو سا جاتا ــــ "میں بے انصافی تو نہیں کر رہا، میں اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہا۔ کہیں اس لڑکی کی ماں نے کسی کے ساتھ وعدہ ہی نہ کر رکھا ہو۔ اس لڑکی کا بھائی کہیں زبان نہ دے چکا ہو"

آخر یہ اس قدر آسان بات تو نہیں تھی، اتنا آسان فیصلہ تو نہیں تھا۔ لڑکی نامور گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لڑکا بھی مشہور سکھ خاندان کا نورِ نظر تھا۔ اس کے والدین کیسے مانیں گے؟ مشکل، مشکل، مشکل! اب جبکہ پاکستان بن چکا تھا، جب اپنے نئے ملک کو ہر مسلمان کی ضرورت تھی، جب مسلمان لڑکوں کے لئے لڑکیوں کی کمی تھی، جب پاکستان سرکار کو ڈاکٹروں کی بڑی ضرورت تھی۔ اور لڑکے کی اپنی برادری میں کئی خوبصورت، تعلیم یافتہ اور سشیل لڑکیاں اس کی جانب نظریں لگائے بیٹھی تھیں۔ اور اب جبکہ اس نے شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا، تو پہلا حق اُن برادری کی لڑکیوں کا تھا جنھوں نے اس کے والد کے دروازے کی چوکھٹ گھس دی تھی۔ مشکل، بہت مشکل!! اور کبھی کبھی دونوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ناممکن تھا اور جیسے دونوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

گھڑی نے چھ بجائے۔ لڑکی نے سوچا، اپنے ہوسٹل جا کر اطلاع دے آئے۔ اور اس کے علاوہ نجانے کیوں دونوں کو جیسے انھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ دونوں کے دلوں میں جیسے اُمس سی ہونے لگی تھی۔ وہ باہر آ گئے۔

ہوٹل سے اُتر کر کناٹ پیلیس میں انھوں نے دیکھا کہ دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کوئی خاص توجہ کی۔ سڑکوں پر موٹریں تیزی سے جا رہی تھیں۔ انھوں نے پھر بھی کوئی خیال نہ کیا۔ لوگ باگ جیسے ہراساں ہراساں تتر بتر تھے اور بھاگ دوڑ رہے تھے، لیکن وہ دونوں اپنے دھیان میں مگن ہوسٹل کی طرف چلے گئے، جو سڑک کے اس پار تھا اور جونہی لڑکی نے گیٹ پار کیا، ایک چوکیدار بھاگا بھاگا آیا اور دروازہ بند کر لیا۔

لڑکا سامنے کے میدان میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑا تھوڑا اندھیرا ہو چلا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ پھر گیٹ پر آیا۔ لڑکی نے کہا تھا، وہ اتنی ہی دیر لگائے گی، زیادہ نہیں۔ جنگلے کے ساتھ لگی ہوئی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"چلو" لڑکے نے عام لہجے میں کہا۔ لڑکی چپ تھی۔

"کیوں؟ ــــ یہ گیٹ آج اس قدر جلد کیوں بند ہو گیا؟" لڑکے نے پھر سوال کیا۔ لڑکی پھر بھی چپ رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں، آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"باپو .... کو .... کسی نے مار دیا ــــ گولی سے"

لڑکا جیسے پتھر کی سِل بن کر رہ گیا۔

گجر

"کسی نے تین گولیاں چلا کر انھیں ڈھیر کر دیا ہے"

لڑکا ساکت کھڑا تھا۔

"میں نہیں آ سکوں گی۔ آج یہاں سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا ـــــ لیکن وہ فیصلہ جو وہ فیصلہ میں نے کر لیا ہے ـــــ"

لڑکا پھر بھی چپ تھا۔

"تمھیں اب "ہاں" کرنی ہی پڑے گی۔ باپو کبھی نہیں مر سکتے۔ ہم انھیں زندہ رکھیں گے۔

لڑکا بدستور چپ تھا۔

"اس جنگلے میں سے تمھارا ہاتھ اندر آ سکتا ہے؟ ـــــ ـــــ اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوگا"

لڑکے نے اپنا ٹھنڈا، یخ بستہ ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہم شادی کر دیں گے، ایک سکھ اور ایک مسلمان۔" انھوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کے ساتھ عہد باندھا۔ اور بے سُدھ، جامد سے وہ وہیں کھڑے رہے کھڑے رہے۔ اور اندھیرا اور بڑھ گیا، اور بڑھ گیا۔

دلّی کی سڑکیں یُوں سنسان پڑی تھیں جیسے یہاں کبھی کوئی بستا ہی نہیں تھا۔ تن تنہا، گن گن کر قدم رکھتا ہوا، لڑکا ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھا ـــــ ایک سکھ لڑکا جو مسلمان لڑکی کا ہو گیا تھا ـــــ اور اُسے پتہ لگا کہ ایک ہندو نے ایشیا کے سب سے بڑے ہندو کا خون کر دیا تھا۔ اور وہ ہندو دن بھر تیرہ نمبر کے کمرے میں اس کے پڑوس میں رہا تھا۔

"جبھی تو میں کہوں کہ اس دیوار میں سے دن بھر آنچ سی کیوں آ رہی تھی" لڑکا سوچنے لگ گیا۔

گجر

(ایک آواز سنائی پڑتی ہے)

یہ موت کی گھاٹی ہے جہاں اب کچھ بھی زندہ نہیں۔ نہ آدمی نہ جانور نہ پیڑ نہ پتے نہ پھول نہ آنکھوں کے چراغ نہ امیدیں نہ محبت۔

یہ موت کی گھاٹی ہے جہاں ہری بھری دھرتی پر موت کی فصل اگتی ہے نیلے آسمان سے موت کی دھول برستی صاف شفاف پانی کی لہروں پر موت تیرتی ہے ـــــ ہر طرف موت کا پہرہ ہے جھلس ہوئی ہوائیں موت کی کہانی کہتی ہیں بادل موت کے سفیر . . . .

یہ موت کی گھاٹی ہے جہاں ہر وقت تباہی کی بجلیاں ہوا میں کانپ رہی ہیں ـــــ جہاں ہر چیز اس طرح مر چکی ہے اب موت زندگی اور زندگی موت ہے۔

وہ پچھلی دنیا مٹ گئی۔ وہ تاریخ اب موت کی نیند سو رہی ہے۔ خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے نئے ورق ابھی ہیں جن پر کچھ بھی نہیں ـــــ کچھ بھی نہیں . . . .

(قیامت خیز بم داخل ہوتا ہے ـــ بھیانک شکل جلاد کے کپڑے۔ ٹوپی پر موت کا نشان۔ مردے کی ایک بوڑھی کھوپڑی اور ایک پر ایک رکھی ہوئی دو سوکھی ہڈیاں۔ بالکل صلیب کی طرح۔ سینے اور پیٹ پر ایک بڑا سا خوفناک گدھ پیٹھ پر دُم کا زبردست نشان)

علاوہ میری دستخط کے ـــــ میں قیامت ہوں۔ یم ہوں ـ موت کی ایک ایسی سخت چٹان جس پر زندگی کا ایک سبزہ بھی نہیں اُگ سکتا . . . . ہُم۔ م۔ م۔ م۔ م۔ م . . . .

میں کون ہوں؟ نہیں جانتے؟

یہ پھوٹتا ہوا جوالا مکھی ـــــ یہ پچیسوں میل کے دائرے میں پھیلا ہوا شعلہ فشاں آتشکدہ۔ سائنس کا یہ نیا سورج پھٹتا ہے تو آسمان کا وہ پرانا سورج بھی ایک بار ماند پڑ جاتا ہے ـــــ زمین کی کوکھ سے اٹھتا ہوا دھواں۔ دھوئیں کا بادل ـــ پہاڑ جس کی اونچائی اتنی کہ ایک ایورسٹ دوسرے کے کندھے پر کھڑا ہو کر اسے چھو سکے ـــــ یہ سینکڑوں میل

---

[1] موت کا دیوتا۔

گگجو

دکھائی دینے والی میری آگ — یہ ہزاروں میل دور تک دنیا کے ایک ایک کونے کو چاٹ جلنے والے میرے لپکتے ہوئے اندھے شعلوں کی لپٹ۔ یہ میرا دس میل اونچا اور سو میل لمبا موت کا خوبصورت چھاتا —— اب بھی تم نے مجھ کو نہیں پہچانا؟
تو سنو میں کلجگ کا پیغامبر ہوں۔ میرے غصے سے ترلوک میں کہیں پناہ نہیں۔ میں تباہی کا پس منظر ہوں —— قیامت ہوں —— یہ دیکھو میری کھیتی ....

× × × × ×

(مردوں میں کسمساہٹ ہوتی ہے۔ سب ایک ایک کرکے کھڑے ہوتے ہیں)

مرے ہوئے اور مرنے والوں کا گیت

....

ہم مر چکے ہیں۔ ہم مر رہے ہیں۔ مگر یہ کس گناہ کی سزا ہے بھگوان! ہم نے تو کسی کا گلا نہیں کاٹا کسی کا گھر نہیں اجاڑا کسی کو بھوکوں نہیں مارا۔ کسی کی محبت کے ترانوں کو چھرا نہیں بھونکا۔ تب پھر ہمیں یہ کس گناہ کی سزا ملی بھگوان!
ہم مر چکے ہیں۔ ہم مر رہے ہیں۔ مگر ہمیں تو اچھی موت بھی نصیب نہیں —— موت —— سمندر کی تیز اور تند لہروں کی طرح —— مرنا وہ ایک بار کا —— درد کی ایک چھری —— کام ختم .... یہ نہیں یہ نہیں یہ نہیں .... یہ موت جو موت نہیں۔ یہ زندگی جو زندگی نہیں —— جسم میں یہ آگ سی لگی ہوئی —— یہ اینٹھن —— یہ کوڑھ کے ابھرے ابھرے بدنما داغ —— یہ سیاہ پڑتی ہوئی زرد کھال —— یہ خون —— پانی پانی .... یہ کس گناہ کی سزا ہے بھگوان!
ہم مر چکے ہیں۔ ہم مر رہے ہیں۔
مگر کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ ہم تو کارخانوں میں کام کرتے تھے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ دفتر میں کام کرتے تھے۔ کمہار تھے۔ بڑھئی تھے۔ لوہار تھے۔ مالی تھے۔ ملاح تھے۔ مچھیرے تھے۔ ہمیں تو اپنے بال بچوں میں رہنا اور اپنی محنت کی دو روٹی کھانا پسند تھا —— ہم فنکار تھے —— سچائی کا بیج بو کر خوبصورتی کی کونپل اگاتے تھے —— ہماری تو کسی سے عداوت نہیں تھی —— تب پھر ہم پہ موت کیوں ٹوٹی —— یہ دس موتوں کی ایک موت ...... کیوں کیوں کیوں؟؟؟ بولو نا میرے ظالم پھپھولو۔

(پھپھولے بولتے ہیں۔)

پہلا —— میں عیسیٰ مسیح کی نئی شکل ہوں —— سوز و الم کا چشمہ
دوسرا —— میں پتھروں کے زمانے کی وہ وحشی رات ہوں جو آج پھر جاگ اٹھی ہے —— جب آدمی ایک درندہ تھا —— گوریلا۔ خونخوار اور جنگلی۔
تیسرا —— میں علم، سائنس، آرٹ، تہذیب، مذہب اور تمدن کی نئی تفسیر ہوں —— بالکل نئی —— آسان سی
چوتھا —— میں ہیروشیما ہوں۔ ناگاساکی ہوں ....

پانچواں ـــــ میں وہ نامعلوم گناہ ہوں جس کی سزا ہمیشہ ایشیا کے سر پر گرتی ہے ....

چھٹواں ـــــ میں وہ شیشہ ہوں جس میں انسان اپنے آنے والے دنوں کو پڑھ سکتا ہے ....

ساتواں ـــــ میں وہ پرانا منحوس زنداں ہوں جس میں انسان نے پہلی بار غلامی کی سمت اور بدذائقہ روٹی توڑی تھی ـــــ میں گواہ ہوں کہ وہ زندان اب بھی قائم ہے۔

آٹھواں ـــــ میں نفرت کا وہ زہر باد ہوں جسے مضبوط ہاتھوں سے نشتر لگانا ہوگا۔ ورنہ ....

(سب مردے ناچ ناچ کر اپنی بے سری اور کرخت آواز میں گانے لگتے ہیں)

پھر آدمی نہ ہوگا ـــــ پھر آدمی نہ ہوگا ـــــ

بس ہمیں ہم ہوں گے ـــــ بس ہمیں ہم ہوں گے ـــــ

موت ہوگی وبائیں ہوں گی ـــــ خون ہوگا اندھیرا ہوگا ـــــ

خاک ہوگی ـــــ دنیا ریگستان ہوگی ـــــ

اور اس ریگستان کے بیچ میں ایک آدمی ہوگا ـــــ بس ایک ـــــ کالا، کوٹلا، جلا ہوا، ٹھونٹھ ـــــ تنہا تخت کے لئے ـــــ

پہلا مردہ ـــــ دھوکے میں مت آؤ ـــــ یہ اتفاق کی بات ہے کہ جنھیں اس قیامت خیز بم کی پہلی آنچ لگی وہ ہم جاپانی مچھیرے تھے۔"

دوسرا مردہ ـــــ ہماری جگہ تم بھی ہو سکتے تھے ـــــ کوئی بھی ہو سکتا تھا ـــــ برمی بھنگلی ملائی چینی ـــــ کوئی بھی ـــــ ؟ ہوا ایک ہے، پانی ایک ہے، آسمان ایک ہے۔ تباہی کا یہ سیلاب کسی کو نہیں چھوڑے گا

تیسرا مردہ ـــــ اور یہ تو ہماری ننھی سی قسمت ہے کہ ہر نئے بم کی پہلی آنچ ہمیں کو لگتی ہے ـــــ شاید اسی لئے کہ ہم سورج بنشی ہیں۔

چوتھا مردہ ـــــ (بجھتے ہوئے چراغ کی طرح بھبک کر) مگر جو سچ پوچھو تو یہ چہرہ کسی خاص قوم کے آدمی کا چہرہ نہیں۔ ہر انسان کا چہرہ ہے ـــــ انسانیت کا چہرہ ہے ـــــ ہاں یہی چہرہ جس کے جلد کی سات تہیں جل چکی ہیں۔ جس کا خون پانی ہوگیا ہے اور گوشت بھسبھسی مٹی ....

(آگے بڑھ کر)

ہاں تباہی کی مہر لئے ہوئے یہی ڈرا ہوا ڈراؤنا چہرہ جس سے سب ڈرتے ہیں کیونکہ موت وہ دبا ہے جس کے ہزار پیر ہوتے ہیں ـــــ اُف کتنی جلن ہے۔ جیسے کوئی آگ پر بھون رہا ہو۔

(گر کر ڈھیر ہو جاتا ہے)

× × × × ×

گجر

(شاعر کہتا ہے)

شاعر ـــــ یہ جہنمی آگ نئی تخلیق کی حامل ہے۔ زمین کو اسی آگ سے تپ کر نکلنا ہے ـــ
تخریب اور تعمیر ایک ہی عمل کی دو شکلیں ہیں۔ جس سائنس نے دنیا کو یہ روپ دیا ہے اسی نے نئی دنیا کی آواز باز گشت بھی
اس کے اندر رکھ دی ہے ـــ گھبراؤ مت۔

میں نے بہشت نہیں دیکھا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ بہشت کے اس ننھے سے دروازے پر ضرور ایک بہت
بڑی خندق ہوگی ـــ گہری ـــ خوفناک ـــ یہ قیامت خیز بم بھی وہی موت کی خندق ہے ـــ ٹھیک
اسی بہشت کے دروازے پر جو اسی کرہ ارض پر بننے جا رہی ہے ـــ بہار نے میرے کان میں آکر کہا ہے کہ نندن بن[1]
اب یہیں بنے گا ـــ انسانی طاقت کی اس نئی دیوی کو سلام ـــ جنھوں نے تجھے قید کر رکھا ہے۔ انھیں اشکوں
کے خون سے تیرا ترپن[2] کروں گا اور تجھے اپنے دل کی رانی بناؤں گا۔

سائنس داں بتلاتے ہیں کہ آگ کے گولے سے ہی اس زمین کا جنم ہوا تھا۔ اس بار بھی وہی ہوگا۔ اس آگ کے
گولے سے اک نئے کرہ ارض کی تخلیق ہوگی ـــ میں اس عظیم الشان دنیا کا شاعر ہوں ـــ اس نئی صبح کا مغنی ـــ
اے میری آندھی طوفان اور کالی گھٹاؤں کی البیلی صبح تجھے سلام! ممکن ہے تیرا سورج ابھی آنکھوں سے
اوجھل ہو لیکن جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہے ـــ اسی نئے کومل میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو گا ـــ چھیڑ دے اپنا
ترانہ سحری ـــ اور ماں میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو بھی افسوس نہ کر........

× × × × ×

(ماں اور اس کی بیٹی اپنے پیدا ہونے والے بچے سے کہہ رہی ہے)

لال! تجھے دیکھنے آنکھیں ترس رہی ہیں۔ تو دھرتی پر کب آئے گا ـــ تو کس پر جائے گا ـــ
کو یہ پایان پر........

آہ پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ تجھے دیکھ کر وہ بھی کتنا خوش ہوتے۔ ان کے من میں بھی کتنی امنگیں
اٹھتی ہوں گی ـــ لیکن........ تیری پیدائش پر سب ہوں گے۔ بس ایک وہی نہ ہوں گے ـــ وہی
نہ ہوں گے ـــ اف۔ اس رات ہوا میں کتنا نشہ تھا۔ کیسی چندن جیسی چاندنی چٹکتی ہوئی تھی ـــ ٹھنڈی ٹھنڈی

---

[1] ۔ بہشت میں اندر دیوتا کا باغ

[2] ۔ مردوں کے نام پر پانی بہا کر ان کے نجات کی امید کرنا ـــ (عقیدے کے مطابق کسی کے نام پر
یہاں بہایا گیا پانی دوسری دنیا میں اس کو مل جاتا ہے)

ابھی ابھی ——— اور وہ دودھیا بستر ——— وہی بانس کے جھرمٹ کے پیچھے سے کھڑکی میں سے جھانکتا ہوا بے شرم چاند ——— وہ نشے کی چھلکتی ہوئی مینا ——— وہ لاج کے ٹوٹتے ہوئے بندھن ——— وہ آدھی رات کا سناٹا۔ اور اس سناٹے میں بجتے ہوئے سانسوں کے تار ——— ایسے میں بس دو او رہیں۔ اور ہمارے درمیان ترسی ہوئی زندگی کی وہ بھرپور جوان رات ——— جیسے انگور ——— جسے جتنا نچوڑو اتنا ہی رس نکلتا آئے ——— ہم نے بھی اس مدہوش رات کو نچوڑ کر اس کا سارا رس چوس لیا اور پھر گویا صبح ہو گئی ——— وہ لام پر چلے گئے اور تو میرے پاس آ گیا ...... یہاں ...... یہاں ...... ارے تو مچھلی کی طرح کیا تڑپتا ہے تجھے ذرا بھی چین نہیں۔ تیرے تڑپنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تو لڑکی ہوگا ——— سہیلیاں کہتی ہیں کہ لڑکی زیادہ چنچل ہوتی ہے ——— لیکن میں جانتی ہوں کہ تو لڑکا ہی ہے ——— مرد بچہ ——— کیونکہ ان کی یہی خواہش تھی۔ معلوم نہیں کتنی بار انھوں نے کہا ہوگا دیکھنا بیٹا ہوگا۔ میرا بیٹا بھی بڑا ہو کر سپاہی بنے گا ——— برما، عراق، ایران، میسوپوٹامیہ، مصر، اٹلی، فرانس، انگلینڈ...... دیس دیس کا پانی پئے گا ——— بھاڑ میں جائیں یہ دیس اور یہ منہ جلی لڑائیاں جو ماں سے بیٹے کو چھین لیتی ہیں ——— بھگوان! تو بھی کتنا بے درد ہے کہ جس بیٹے پر ماں جان چھڑکتی ہے اسی کو تو سات سمندر پار نہ جانے کس ویرانے دیس میں لے جا کر جھونک دیتا ہے ——— بچہ پلنے میں پڑا ماں ماں کرتا ہے ——— ماں دیکھتی ہے ——— پھر اس کے دانت نکل آتے ہیں ——— ماں دیکھتی ہے ——— وہ گھٹنیوں چلنے لگتا ہے ——— وہ کھڑا ہو کر اپنی لڑکھڑاتی چال میں ڈگمگ چلنے لگتا ہے ——— ماں دیکھتی ہے ——— وہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے۔ ندی میں تیرتا ہے۔ پیڑ پر چڑھتا ہے، لڑتا ہے۔ بھڑتا ہے۔ اسی طرح کھیلتے کھیلتے بڑا ہو جاتا ہے۔ اور معلوم نہیں کہاں چلا جاتا ہے ——— پھر ماں کچھ نہیں دیکھتی ——— بس وہ چٹھی کی راہ دیکھتی ہے اور اس کی جان سولی پر ٹنگی ہوتی ہے ——— جیسے آج تیرے باپ کیلئے میری ٹنگی ہے ...... سچ بتا یہ لام بھی کیا کوئی خونی دلدل ہے، جس میں پشت در پشت لوگ پھنستے چلے جاتے ہیں ——— پہلے باپ پھر بیٹا ——— پھر بیٹے کا بیٹا ——— پھر اس کا بیٹا ——— پھر اس کا ...... کب ٹوٹے گی یہ کڑی؟ کیا نصیب ہے ہمارا! ہم تو دن رات جاگ کر پہرہ دیں ——— منوا کا جسم گرم تو نہیں ہے ——— ٹھنڈا تو نہیں ہے ——— چھینک کیوں آئی۔ پسلی کیوں پھڑکی ...... مگر کیا حاصل؟ ایک روز کوئی آیا اور بھرتی کر کے لے گیا ——— پھر وہی گنڈا تعویذ ——— منت دعائیں ——— دیوی دیوتا ——— اللہ رسول ——— بدنصیب ماں انتظار کرتی رہتی ہے کہ ایک نہ ایک دن اس پر بھی بھگوان کی نظر پڑے گی اور اس کا بیٹا اسکول جائے گا ——— لیکن ——— لیکن ——— میں نے کتنی بار دیکھا ہے بیٹا نہیں ملتا ——— فوج کی چٹھی ملتی ہے ——— اُف ——— ایسی کوکھ میں آگ کیوں نہیں لگ جاتی ——— ارے یہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میری زبان کیوں نہ کٹ کر گر گئی ——— اپنے ہی بیٹے کی برائی سوچ رہی ہوں ——— مجھے کیا ہو گیا ہے ——— بھگوان! میرا ہوش ٹھکانے نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دو ——— تو میرے آنسوؤں کو دیکھ۔ یہ کتنے جل رہے ہیں ——— بتا کیا میں اکیلی ماں ہوں جو اس طرح آنسو بہاتی؟ پھر یہ لڑائی رک کیوں نہیں جاتی؟

سکھ چین سے رہیں تو کیا بُرا ہے؟ میں تو کسی سے بیرا موتی نہیں مانگتی۔ ان سے ہاتھ جوڑ کر صرف میری اتنی عرض
شوہر مجھے دیدو ـــــ میرا بیٹا مجھ سے مت چھینو۔ ہم لوگ اپنی نمک روٹی میں خوش رہیں گے۔ بس ہمیں ایک ساتھ
۔ ایک دوسرے سے الگ نہ کرو۔ جب وہ نہیں تو پھر جی کر کیا ہوگا؟ لگا دو آگ یہ سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے
کشن کی ماں کہتی تھی اب یہی ہونے والا ہے ـــــ سب کچھ سواہا ہو جائے گا ـــــ سب کچھ ـــــ سب کچھ۔۔
ہاں بیٹا یہی وہ بدذات دنیا ہے جو تجھے نگلنے کو تیار کھڑی ہے ـــــ میں کیا کروں کہ اس چڑیل کا سایہ تجھ پہ
ـــــ لیکن میں تیرا مکھڑا دیکھنے کو ترس بھی تو رہی ہوں ـــــ کیسے کہوں ۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں بیٹا۔ کچھ نہیں کرنا
ـــــ تو آ میں تیرا سواگت کروں گی ـــــ موسلوں ڈھول بجاؤں گی ـــــ جب مرنے کی گھڑی آئے گی تو سب
مر جائیں گے ـــــ کیا رکھا ہے ـــــ روز روز مرنے سے تو اچھا ہوگا سب ایک ساتھ ہی صاف ہو جائیں۔
آ آ تو بھی آ۔ تو اپنے اس گیلے اندھیرے میں مچھلی کی طرح اور مت تڑپ ـــــ آ اور ہمارے اس موت کے جلوس میں
ـــــ ہم بہت دھوم دھڑاکے سے تباہی کی طرف جا رہے ہیں ـــــ دن کی صاف اور چمکیلی روشنی کو چھوڑ کر
ہرے کی طرف جس میں نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کی یاد۔

(ایک سپاہی جس کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ لڑکھڑاتا بیساکھی ٹیکتا ہوا آتا ہے)

ہاں مایوس نہ ہو۔ کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ اس ننھی سی سر سبز شاخ کو کوئی چھو بھی سکے جو تیرے اندر پھول رہی ہے،
جو تجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جیسے تو درمیان کے سارے پردوں کو چیر کر تھوڑی دیر کے بعد اپنی
کرنے والی محبت آمیز نظروں سے سہلا بیٹھی ہے۔ جس کا روپ ہر وقت تیری آنکھوں میں سمایا رہتا ہے ـــــ
ل کی موسیقی ہر وقت تیرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے ـــــ جو تیرا ہے اور تو جس کی ـــــ تیرا بچہ ـــــ
کوئی اسے چھو نہ سکے گا ـــــ ماں تو مت ڈر۔

انسان جھوٹ کی گلیوں میں بہت بھٹکا۔ نہ جانے کتنی گونگی بہری قربان گاہوں پر اس کا خون بہا۔ کتنے ریگستان
ن سے بھیک بھیک گئے۔ کتنے سیاستدانوں نے اس کے بہے ہوئے خون کی ندیوں میں اپنی کشتیاں دوڑائیں
۔ بہت ہوا۔ بہت ہوا ـــــ اب اور نہیں اب اور نہیں ـــــ انسان اب اپنے لئے لڑے گا ـــــ
ے گا۔ اگر مرنا ہی ہے تو اپنی زندگی کے سکون کو بچانے کے لئے مرے گا۔ اب وہ چالباز سیاستدانوں کے لئے
ر بھی نہیں بہائے گا۔

میں نے اپنی یہ ٹانگ کس لئے گنوائی؟ مجھے کیا ملا؟ جب بھی جنگ چھڑتی ہے بڑے بڑے اصولوں کے ڈھول
ے میں ـــــ انصاف کے، مذہب کے، تہذیب کے، اِس کے اُس کے۔ مگر سب جھوٹ، سب جھوٹ، سب جھوٹ
ہوں ـــــ دس پانچ کروڑ میں ایک چالاک اور طاقتور آدمی اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے بیگناہ انسانوں کو

آپس میں لڑاتا ہے۔ جان کسی کی جاتی ہے، حویلی کسی کی کھڑی ہوتی ہے ــــ میں جانتا ہوں ــــ انصاف اور تہذیب کی بات وہ کرتا ہے جس کا انصاف مذہب اور تہذیب سب پیسہ ہے۔ (زہر میں ڈوبی ہوئی تیکھی ہنسی) میں ان کے ہنس منہ دلے پر بہت بار بیٹھا ہوں، اب مجھے اس کے نام ہی سے متلی آتی ہے۔

ماں تو ذرا بھی مت ڈر۔ اب ہم سب مل کر اپنی حفاظت کے لئے لڑیں گے۔ کیا اس تباہ کن بم کے ایک دھماکے سے انسان اپنے کو مٹ جانے دے گا؟ کیا زندگی اتنی سستی ہے؟ انسانیت بھی کیا کوئی مجبور اور بیکس گائے ہے کہ دو چار قصائی آ کر اس کے پہلو میں اپنا خنجر بھونک دیں اور وہ کان بھی نہ ہلائے؟ لد گئے ــــ وہ دن لد گئے ــــ دیکھا ہے؟ کبھی گائے کو اپنے ننھے بچھڑے کی حفاظت میں کھڑے دیکھا ہے؟ آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ سینگ سیدھی کی۔ حملہ آور کا جواب دینے کے لئے ایک دم تیار .... کسی بھی شکاری سے پوچھو ایسے میں شیر بھی اس پر حملہ کرتے ہوئے ایک بار سہم جاتا ہے۔ اور اگر کبھی یہ بپھری ہوئی گائیں اپنی غول بنا کر فوج کی طرح آگے بڑھتی ہیں تو جنگل کے راجہ کو بھی بھگا کر جنگل سے باہر کر دیتی ہیں۔ کسی اچھے شکاری سے پوچھ لو وہ بتائے گا کہ ایسا ہی ہوتا ہے ــــ تو بھی تو ماں ہے۔ تیرے بھی تو اپنا بچھڑا پیارا ہے۔ کیا تجھے یہ ٹسوے بہانا اچھا لگتا ہے؟ جنت سے نکلے ہوئے باغی آدم کی بیٹی ہو کر بھی کیا تو ان گایوں سے گئی گذری ہے؟ نہیں میں یہ کبھی نہیں مانوں گا ــــ میں جانتا ہوں تیرے اندر کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے ــــ ہم سب کے اندر کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے ــــ ہاتھی جب اپنے بچاؤ کی تدبیر نہیں کرتا، ایک ننھی سی چیونٹی بھی اسے مار دیتی ہے، لیکن بلی جب ہتھیلی پر جان رکھ کر اپنی حفاظت کرنے پر آجاتی ہے تو بڑے بڑے حوصلے والوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔

موت کی اندھیری گھاٹیوں میں آدم کے بیٹے نے بہت سفر کیا ــــ اس کنارے سے اس کنارے تک .... اس اندھیرے زمانے سے اس نئے اندھیرے دور تک ــــ یہ اندھیرا اس لئے ہے کہ اپنی ہی روشنی سے اس کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں ــــ مگر اب اور نہیں ــــ چیخو چیخو ــــ موت کی آندھیوں میں گھرے ہوئے میرے دوستو! ساتھیو! انسانو چیخو ــــ اپنی آواز اٹھاؤ ــــ آسمانوں میں گونجاؤ ــــ اگر اب نہیں تو پھر کبھی نہیں ــــ یہی وہ آخری گھڑی ہے ــــ قیامت کی گھڑی ....

میں لڑوں گا۔ میں اس دشمن کو جانتا ہوں۔ ہم سب اس دشمن کو جانتے ہیں۔ یہ موت کا سوداگر ہے۔ یہ عجیب بیل بوٹے والا۔ بھدے کپڑوں میں لپٹا ہوا جانور نما پھوہڑ انسان آدمیوں کو خریدتا ہے ــــ عصمتوں اور بازوؤں کو خریدتا ہے ــــ ضمیروں کو خریدتا ہے ــــ یہ موت کا سوداگر ہے ــــ موت کا دلال ہے ــــ میں اس سے لڑوں گا اسی نے مجھے لنگڑا کیا ہے۔ اسی کے ہتھیاروں نے میرے بیٹے کا خون بہایا ہے، اسی نے میری بہن کو کوٹھے پر بٹھایا ہے۔ اسکے

پہنچے ہر گھر پر پہونچ رہے ہیں۔ کسی کو اس سے پناہ نہیں ـــــ کوئی بچہ کوئی بوڑھی ـــــ کوئی نہیں ـــــ
میں لڑوں گا ـــــ میں اس آدمی سے لڑوں گا۔ میں اسے خوب پہچانتا ہوں۔ یہ آدمی نہیں۔ آدمی کی شکل میں دیو ہے
ـــــ ایک مجسم ہوس ـــــ ایک کبھی نہ مٹنے والی شیطانی بھوک ـــــ سونے کے پہاڑوں کے لئے ـــــ سلطنت
کے لئے۔ طاقت کے لئے ....

میں اس کیکڑے کو جانتی ہوں۔ آج اسی کی گھنی ٹانگیں دنیا کے کونے کونے میں پہونچ رہی ہیں ـــــ اپنے
جلاد کی بے پناہ وزنی۔ ہمت ور اور انصاف پسند تلوار اٹھاؤ ـــــ کھانڈا اٹھاؤ۔ اس کا زنگ دور کرو۔ اس پر سان
چڑھاؤ اور اس کو اپنی مٹھی میں لے کر کوڑے ہو جاؤ کہ اپنی دھرتی پر رینگتی ہوئی ان گھنی ٹانگوں کو وہیں کاٹ کر دفن کر دینا ہے
ماں تو افسوس نہ کر۔ انسان جئے گا۔ تیری کوکھ کا وہ سلونا بچہ جئے گا۔ گاؤ کوئل گاؤ ـــــ مغنی تم بھی اپنا راگ
چھیڑ دو۔ ہوائیں امن کے نغمے گونجنے دو۔ امن کے امرت کو موت کے بادلوں سے ٹکرانے دو۔ یہ غم کا چھاتا جو ہمارے
سروں پر تنا ہوا ہے اس کو چیر کر ہمیں آزاد آسمان تک پہونچنا ہی ہوگا ـــــ سچائی ہماری رہبر ہے۔

ترجمہ

گجندر سنگھ

رگیں

اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب سے اسے تار ملا، قسم قسم کے ولولے تھے۔ اشتیاق ا
نے اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیا تھا۔ اس کے کانوں میں لگاتار شائیں شائیں تھی۔ اس کے سینے۔
جنبش تھی گویا اندر سے کوئی اس کے پھیپھڑوں کو کوٹ رہا ہو حتیٰ کہ اس کا گلا درد کرنے لگا لیکن ا
کچھ کیسے کہتا۔

باہر جاتے ہوئے اس نے نوکر کو آواز دی۔ وہ کہنا چاہتا تھا "دروازہ بند کر لو۔ میں
ہوں"۔ لیکن نوکر کو سامنے پا کر وہ سوچتا رہ گیا کہ کیا کہے۔ "کیا بج گیا ہوگا"

نوکر کے پاس گھڑی نہ تھی۔ وہ رسوئی سے آٹا گوندھتے ہوئے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ آٹے
ہو رہے تھے۔ ایک اپاہج کی طرح وہ کھڑا اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اس نے خود ہی گھڑی اپنی جیب سے
اور وقت دیکھا۔ "کل صبح وہ آ جائے گی"

"جی ہاں" ـــ نوکر اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اس نے بوڑھے کی بات کا جواب دینے کے لئے
ڈھونڈے ـــ "بی بی کب تک پہنچ جائے گی؟"

"اچھا تو ٹائم ٹیبل لے آ" اس نے کہا۔ "گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر لیں"

نوکر نے پچھتاوے سے اسے دیکھا۔ "وہ تو دو سال پرانا ہے۔ کیا پتہ اب وقت کیا
دروازہ بند کر لے میں جا رہا ہوں۔ وقت معلوم کرا دوں گا" اس نے چھڑی اٹھائی اور
آہستہ گھر کی چار سیڑھیاں اتر کر سڑک پر رینگتا گیا۔

اسی طرح وہ شام کے وقت سیر کرنے گھر سے چلا جاتا۔ رستے میں کسی کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر
وہ واپس کھانے کے وقت پر لوٹ آتا تھا۔ اور اس کی زندگی ایک پرسلیقہ، صاف ستھرے پر س

خاموش ماحول میں گزرتی تھی ۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور تین لڑکیاں تھیں ۔ اس کی بیوی اگر زندہ ہوتی تو شاید یہ خلا، خاموشی اور اداسی نہ ہوتی ۔ تو شاید وہ سکون اور سلیقگی بھی قایم نہ رہتی لیکن اسے اپنی زندگی سے اپنے ماحول سے اس معمول سے بالکل دلچسپی نہ تھی لوگ اپنے بڑھتے کنبوں اور غل غپاڑے کا احتجاج کرتے تو وہ حسرت سے کہتا ” بھائی ۔ اکیلی زندگی بہت دردناک ہے ۔ تم اتنے خوش قسمت ہو کر اپنی بیوی کو کوسنے مت دیا کرو ۔ جب یہ بچے بڑے ہو کر اپنے اپنے کاروبار میں لگ جائیں گے تو تم بوڑھے بابا اسی ایک سہارے پر رونق اور تسلی پاؤ گے اسے چین اور سکھ دینے کی کوشش کیا کرو ۔ اور یہ بچے ...... ۔ تمہیں اپنے پر غصہ کیوں نہیں آتا ؟“

قدرتی طور پر لوگ ایسی باتوں پر ہنس دیتے ۔ وہ اس کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ لیکن وہ وہاں سے یہ سوچتا اس کے پانچ بچے اپنے اپنے دھندوں میں کاروبار میں مشغول ہوگئے ۔ کبھی کبھار ان کے خط آ جاتے تو یہ بھی ان کی مہربانی تھی ورنہ وہ اکیلا اسی طرح صبح شام سڑکوں پر بے مطلب رینگتا جاتا ۔ سیر کے بہانے وہ گھر کے پر حجود اور بیکار ماحول سے اوٹ لینے کے لئے باہر چلا آتا تھا ۔ وہ کتنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی گھر میں ایک تیز رو رونق کو قائم رکھتی لیکن وہ محض چاہ ہی سکتا تھا ۔ وہ ایسی چاہت اور ارمان کتنی مدت سے کر رہا تھا ۔ یہ چاہت، یہ آرزو کوئی دنیاوی اقتصادی اصول یا فلسفہ پورا نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ مر چکی تھی ۔ اس کے پانچ بچوں کی ماں ۔۔

آہستہ آہستہ قدموں سے گھر کی چار سیڑھیوں سے اتر کر وہ سڑک پر رینگتا گیا ۔ چلتا گیا ۔ سوچتا گیا ۔

اگلی صبح اس کی بیٹی آ رہی تھی ۔۔ سب سے چھوٹی بیٹی، دوسرے لڑکے سے بڑی، وہ بیٹی جو اپنی ماں کو بھی بہت پیاری تھی ۔ وہ بیٹی جس نے ان تمام بچوں میں سب سے کم ماں کا پیار پایا تھا جیسے خود اس نے پالا تھا ۔ اسے یہ بیٹی بے حد پیاری تھی ۔ وہ اپنے گھر میں آ جاتی [illegible] کیا کرتی اور اسے ضرور بھیجتی وہ کسی آتے جاتے دوست یا رشتہ دار کے ذریعے اسے اپنے شہر کے [illegible] لذیذ چیزیں بھیجا کرتی ۔ وہ خط برابر لکھتی ۔ وہ اس سے اپنے دکھ درد بیان کرتی ۔ جب وہ گھر آ جاتی تو گھر کا سارا کام کاج خود سنبھال لیتی اور پھر وہ بیکار سے بھی [illegible] ۔ پھر وہ اخبار لئے [illegible] آرام کرسی پر بیٹھا دھوپ سینکتا اور اس کے جسم میں ایک گرمی سی اٹھتی ۔ وہ [illegible] کمرے میں کوئی اور وجود ہے ۔ وہ وہیں سو جاتا ۔ پھر [illegible] ۔ [illegible] کھانا تیار ہے ۔ کھانا کیا پکا ہوگا ۔ یہ پہیلی سوچتے وہ سیڑھی اترتا [illegible]

کرنے وقت سارا لطف ختم ہو جایا کرتا تھا۔ اب اسے جو کچھ کھانے کو ملتا۔ وہ اس کی بیٹی کی نگرانی میں تیار ہوا کرتا تھا۔

دراصل وہ اکثر اسی بات کو سوچے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کی شادی کرکے اچھا فعل کیا ہے یا اس نے ایک غلطی کی ہے۔

اس کا دل، اس کی خود غرضی اس کی ضروریات اسے ایک غلطی بلکہ گناہ تصور کرتیں لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ تمام خیالات ناپاک تھے۔ ایک بات جو اسے اس بیٹی میں زیادہ مفید لگتی وہ اس کے اکیلے آنے کی تھی۔ اس کے یہاں بچے نہیں تھے۔ دوسری لڑکیاں آتیں تو اپنے کئی بچوں کو بھی ساتھ لاتیں اور وہ گھبرا جاتا۔ ان کے بدسلیقہ عادتوں سے وہ پریشان ہو جاتا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ وہ سب نہ آئیں۔ لیکن یہ بیٹی سب سے مختلف تھی۔ کیونکہ وہ اس کا بڑا خیال کرتی تھی۔ وہ آتی تو خاموشی سے اس کے کپڑوں کو سنوارتی باورچی خانے کو بہتر بناتی اور گھر کی ہر چیز کو قرینے سے سجاتی رہتی اور جو چیز کم ہو چکی ہوتی اسے از سر نو مکمل کر دیتی۔ اسے وہ بیٹی بہت پیاری تھی کیونکہ وہ بھی اسے محبت کرتی تھی۔ حقوق یا جائز نا جائز کی بحث نہیں کرتی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینے کو تیار تھی۔

وہ انھیں چھوٹے چھوٹے قدموں سے آہستہ آہستہ چلا آیا۔ درختوں پر کبوتر، کوے اور طوطوں کے غول کو رات کے لئے بیٹھتے اور سمٹتے دیکھتے ہوئے۔ لوگوں کو سیر کرتے، آتے جاتے، بحث کرتے دیکھتے ہوئے ہر چیز کو بڑی دلچسپی سے سوچتے اور دیکھتے ہوئے کیونکہ اب اس کی بیٹی آرہی تھی ___

وہ صبح صبح جاگ اٹھا۔ گھر کے نزدیک ریل کی پٹری پر دندناتے انجن آتی جاتی گاڑیاں اور ان کی سیٹیاں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ہر حرکت پر اسے بیٹی کی آمد کا احساس ہوتا۔ اس نے نوکر کو جگایا پانی غسل خانے میں رکھوا کر اپنے بہترین کپڑے نکالے۔

اس کی لڑکی نے غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ "میں آگئی ہوں"۔

اس نے نہانا بند کر دیا "کیا" ؟ اس نے ان سنی کر دی۔

"میں آگئی ہوں"

"اچھا۔ اچھا" ___ جھجک سے اس نے نہانے میں بڑی دیر کی۔

وہ سامنے کرسی پر بیٹھی اس کی لڑکی تھی۔ جب وہ نہانے گیا تھا وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ رات کے وقت بھی وہاں نہ تھی۔ جب وہ کچی پکی نیند سو رہا تھا۔ اس وقت وہ لڑکی گاڑی میں تھی۔ فوراً پھر وہ اس کے نزدیک آرہی تھی لیکن اب وہ پہنچ گئی تھی۔ اب وہ وہاں بیٹھی تھی باتیں کرتی مسکراتی

ہنستی دیکھتی اس کی طرف بڑھتی۔ باؤجی کہتی اس کی پیاری بیٹی اب اس کے نزدیک تھی۔ کل کیوں نہ تھی۔ رات بھر جب وہ اتنا بے چین تھا۔ اسوقت ہی ہواؤں میں اڑتی کیوں نہ آپہنچی۔ جب وہ کل بازار میں چل رہا تھا اس وقت اچانک سامنے نظر کیوں نہ آگئی۔ واپس گھر لوٹ کر آیا تو گھر میں موجود کیوں نہ ہوئی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ وہ زندہ تھی۔ خود وہ جی رہا تھا۔ وہ دونوں تھوڑے فاصلہ پر ایک دوسرے کے نزدیک تر آنے کی جدوجہد میں تھے لیکن ایکدم آمنے سامنے نہ ہو سکے۔ وہ لڑکی اب آئی جب وہ تنہا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "باؤجی آگئی ہوں"۔ وہ اگر پہلے اس کے پاس ہی رہتی۔ شروع سے اس کے نزدیک ہوتی۔ بچپن سے اب تک اس کے قریب اس کی دیکھ بھال کیا کرتی، اس کے گھر کا انتظام کرتی تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ لیکن اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ کل رات خاوند سے جدا ہوئی ہوگی۔ گاڑی پر وہ چھوڑنے بھی آیا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر اس نے تانگہ والے سامان رکھا ہوگا اور اتنی آہستگی سے اتنے لمحے خرچ کر کے ضائع کر کے پہنچ سکی ہوگی۔ یہ معجزہ ہی تو تھا۔ اب وہ چنانچہ پہنچ گئی تھی وہ اسے چھاتی سے لگائے کھڑا تھا۔ وہ اس کے قرب کی حقیقت کو پہچان رہا تھا۔ وہ اس کے سر کو سینے سے بھینچ رہا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ وہ اس کی بچی تھی۔

پھر انہوں نے ناشتہ کیا۔ پھر وہ اپنے اپنے احوال کی، فضا کی، لوگوں کی، رشتہ داروں کی باہر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے نوکر کو کہا۔ میری کرسی اوپر چھت پر بچھا دے۔ ان ذمہ داریوں سے اب اسے فرصت مل گئی تھی۔ اب گویا اسے چند روز کی چھٹی مل گئی تھی اور وہ بیش قیمت لمحے چھت پر بیٹھ کر اخبار ہاتھ میں پکڑے گزارنا چاہتا تھا۔ اوپر جاتے ہوئے میز پر اس نے چابیوں کا گچھا پھینک دیا۔ دوپہر تک وہ آرام کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ پھر ہمیشہ کی طرح نوکر نے اسے آکر جگایا۔ باؤجی۔ کھانا تیار ہے۔

اس کی بیٹی میز پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی رنگت کچھ زرد تھی۔ اس کے چہرے پر ایک غبار سا تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے دریافت نہیں کیا کیونکہ اس کی بیٹی نے خود اسے کچھ نہ کہا۔ وہ دوپہر کو اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اسے نوکر نے جگایا۔ نوکر نے کہا۔ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے"

یہ اسے دوپہر کو ہی معلوم ہو چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے وہ اس کے کمرے میں گیا۔ کیا ہے بیٹی"

پھر یکلخت اس کی حالت کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے اس کے ماتھے کو چھوا۔ اس کے ہاتھوں میں حرارت

کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی نبض کو ٹٹولا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطراب اور خوف تھا۔ وہ رو رہی تھی اور پسینے کی بوندیں اس کے آنسوؤں میں مل کر تکیے پر گر رہی تھیں۔

اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس کی پیٹھ میں پسلیوں کے درمیان درد تھا اور برداشت سے باہر تھا۔ چپکے سے اس نے جوتے پہنے۔ اپنی چھڑی لے کر آہستہ آہستہ وہ سیڑھیاں اتر کر ڈاکٹر کی طرف چل پڑا۔ وہ حیران تھا۔ وہ پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ خطرے اور تکلیف سے وہ گھبرا گیا تھا لیکن اس کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا تھا۔ میں چھڑی کی مدد کے بغیر چلتا تھا۔ ڈاکٹر کی دوکان بہت دور نہ تھی۔ ٹانگے نزدیک نہ تھے۔ اسے پیدل چلنے میں لطف آتا تھا لیکن اس کی بیماری کے لئے ڈاکٹر کی جلد ضرورت تھی۔ وہ ایک تشنج میں اب تک جکڑا ہوا تھا۔
جب وہ گھر سے چلا تھا تو سورج کی گہری شعاعیں کافی تیز تھیں لیکن اب ڈاکٹر کی دوکان اب سامنے نظر آ رہی تھی تو سورج کافی دور ڈھل چکا تھا۔ شعاعیں اب بھی تھیں لیکن مکانوں کی چھتوں تک محدود ہو گئی تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پسینے میں شرابور تھا۔ کافی دیر تک وہ ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ شام کے وقت ڈاکٹر کی دوکان خوب چلتی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو سورج بالکل ڈوب گیا تھا اور لوگ گھروں کی طرف جا رہے تھے۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دیکھ کر اسے بتا دیا کہ حالت خطرناک ہے۔ اگر حفاظت نہ کی گئی تو صحیح خوراک اور دواؤں کا انتظام نہ کیا گیا تو شاید زندگی کا معاملہ درپیش ہو جائے۔

وہ غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس جو کچھ جمع پونجی تھی وہ اس نے اپنے لئے بڑی مشکل سے ساری عمر جوڑ جوڑ کر اکٹھی کی تھی لیکن اس کی بیٹی کی زندگی بھی اسے عزیز تھی۔ وہ بہت خرچ نہیں کر سکتا تھا لیکن اوسط درجہ کا علاج وہ پھر بھی کر ہی سکتا تھا۔

وہ کافی دیر تک اندر کمرے میں نہ جا سکا۔ وہ چیخوں اور سسکیوں کی آوازیں سنتا رہا لیکن اندر جانے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔ نوکر دوا لے کر آیا تو وہ بمشکل تمام دروازے تک پہنچا۔ چیخوں اور سسکیوں میں اس کی بیٹی اسے بلا رہی تھی۔ جانے کتنی دیر سے وہ اسے بلا رہی ہوگی۔ "جا کر تار دے آ۔" دوا پینے کر اسے سرگوشی کی۔ "میں ابھی لکھ دیتا ہوں۔" پھر دوا پلا دینے کے بعد معمولی تسلی دینے کے بعد اس نے تار لکھ دیا۔ وہ ساری رات سسکیاں اور چیخیں سنتا رہا۔ وہ سو نہ سکا۔ اپنی ذمہ داری کے احساس سے وہ جاگتا رہا لیکن اس نے چادر منہ تک لے رکھی تھی۔ وہ جتا رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔
اگلا سارا دن درد شدید تر ہو گیا تھا۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ وہ اکیلا تیمار دار تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا داماد تار ملتے ہی آ جائے گا۔ اس نے خود ہی گرم کھولتے پانی میں روئی بھگو کر اس کی پیٹھ کو سینکا۔ شام کو جب ڈاکٹر آیا تو مریضہ کی پیٹھ پر بڑے بڑے چھالے تھے۔ "یہ کیا ہے؟" وہ بھی گھبرا گیا۔ "یہ آپ نے کھولتے ہوئے پانی سے کیوں سینکا۔ زخم ہو گئے ہیں۔"
لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے سمجھا تھا کہ سینکنے سے آرام آ جائے گا۔

"کیا خوراک ہے۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ کیا غذا دے رہے ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔

"اگر خوراک نہ دی گئی۔ اگر طاقت نہ ہوئی تو دق کا خطرہ مضبوط ہو جائے گا۔"

واقعی اس وقت وہ گھبرا گیا۔ اسے کبھی اتنی خطرناک حالت کا علم نہ تھا۔ اس نے کہا۔ کسی اور ڈاکٹر کو بھی پوچھ لیجئے۔ لیکن ڈاکٹر کو وہم نہ تھا یہ حقیقت تھی۔ وہ خاموش اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے درد کی کراہتی سسکیاں سنتا رہا۔

اگلے روز اس کا دادا آگیا۔ "کیا تکلیف ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پیٹھ میں درد ہے۔" اس نے پرواہی سے کہا۔ "ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ کمر میں بل پڑ گیا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس لئے کہ دونوں باتیں کریں، وہ خود باہر چلا گیا۔

اس کے باہر جانے کے بعد وہ رونے لگی۔ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا اس نے سن لیا تھا۔ اپنی تکلیف کے بارے میں وہ جانتی تھی اور اسے فکر تھا کہ علاج باقاعدگی سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے والد کی آمدنی حیثیت اس کی بیماری کا علاج کرنے کے لائق نہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند بھی امیر آدمی نہ تھا۔ اس کا علاج بہت قیمتی اور اس کی بیماری خرچ بڑھانے والی تھی۔ اسے غم تھا کہ وہ بیمار تھی۔ اسے تکلیف تھی کہ وہ لوگ غریب تھے۔ نہ خرچ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اسے افسوس تھا کہ اس کے باپ نے اس کی بیماری کو خاص اہمیت نہ دی تھی۔ وہ رنجیدہ تھی کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ پھر ان سب باتوں کے مدنظر وہ اگر کسی سے کچھ کہہ سن کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہ کر سکتی تو رونے کے علاوہ وہ کیا کرتی۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ وہ غمزدہ اور پریشان تھی۔ وہ آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کا شوہر گھبرا گیا۔ اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ اسے اس بات کا زیادہ رنج تھا کہ اس کی بیوی کی ایسی حالت کو اتنی تکلیف کو معمولی سمجھ کر ٹالا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اس کی شگفتگی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں سہمی ہوئی تھیں اس کی چیخیں بہت دردناک تھیں۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا وہ حیرت سے بولا۔ کہ نہیں میں نے اچھا بھلا گاڑی میں بٹھایا۔ ہنستی کھیلتی تم وہاں سے آئیں اور تمہیں کیا ہوگیا وجہ کیا ہے۔"

وجہ معلوم کرنے وہ ڈاکٹر کی دوکان پر پہنچا۔ پھر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈاکٹر نے بہت بھیانک نقشہ کھینچا۔ علاج تو کافی کبھی نہیں ہو رہا ہے۔ وہ غصے میں بھرا واپس لوٹا کیونکہ اسے کہا گیا تھا کہ اس کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت تو اس لئے تھی کہ وہ اس کی بیوی تھی کیونکہ وہ اسے محبت کرتا تھا۔ ان دونوں میں بہت پیار تھا۔ وہ یہ کہہ بیٹھی تھی کہ اس کے آنے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

اور وہ باپ چاہتا تھا کہ بے علاج بے خوراک اس بیچاری کو ہلاک کر دیا جائے لیکن وہ زندہ تھا۔ وہ امیر نہ تھا لیکن اپنی بیوی کو سنبھالنے کے قابل تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ جائے گی وہ اس کے ساتھ یکدم چلی جائے گی۔ فوراً ....

وہ سیدھا بیوی کی چارپائی کے پاس آکھڑا ہوا۔ وہ ایک پہلو پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ اس نے اس کے زرد پھیکے چہرے کو دیکھا۔ اس کی مظلوم آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے ... دلگیر مستقبل کے بارے میں سوچا پھر اسے ماضی کی کئی باتیں کئی واقع یاد آئے۔ وہ تلملا اٹھا۔ لطیفہ نے اپنے آنسوؤں میں مسکرانے کی کوشش کی۔ "واہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یونہی میری پیٹھ میں درد ہو گیا ہے۔"

یہی الفاظ اس نے پہلے سنے تھے۔ "میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اب بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بالکل نہیں چاہتا کہ تم یہاں رہو۔ میں خود واپس جا رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری حالت ہے میں تو دو روز کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آج ہی چلی چلو۔ کیا میں تمہارا علاج نہیں کر سکتا۔" اس نے حقارت سے سارے کمرے کو دیکھا۔ "میں آج ہی چلا جاؤں گا۔ گاڑی شام کے چار بجے جاتی ہے۔"

وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں کو، اس کے گندمی چمکتے چہرے کو، اس کے چوڑے ماتھے کو۔ "لیکن میں سفر نہیں کر سکتی۔ میں تو ہل نہیں سکتی۔" "سفر کی کیا خاص بات ہے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ پھر اسے قدموں کی چاپ سنا دی۔ وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ "بیٹا" ۔ اس کا باپ آیا تھا۔ طبیعت کیسی ہے کچھ فرق ہے؟"

وہ اپنے باپ کو چاہتی تھی۔ اس کی آواز میں مزاج پرسی میں مسکراہٹ میں ایک عجیب سکون تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر خاوند کے ساتھ جا کر اس کی دلشکنی یا بیغرتی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس بوڑھے کو رُلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ فکرمند تھا۔ اسے بیٹی کی حالت پر تشویش تھی۔ اس کی اپنی رنگت پھیکی ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ کمرے کی مختلف چیزوں کو دیکھتا رہا لیکن وہ سوچ اسی کے بارے میں رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔

وہ باہر جانے لگا۔ "میں یونہی آپکو تکلیف دے رہی ہوں۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

اسے برا لگا۔ "کوئی نہیں،" وہ بڑبڑایا۔ "کہیں بھی نہیں۔"

"کیا حرج ہے۔ میں چلی جاؤں۔ ڈاکٹر نے بھی یہی کہا ہے۔ مجھے کہیں اور جانا چاہیئے۔"

وہ تڑپ اٹھا۔ "وہ کیا کہتا ہے تجھے؟ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔ کہیں نہیں جانا یہیں رہو۔ علاج کیا نہیں ہو رہا۔"

وہ چلا آیا۔ علاج کے بارے میں وہ بھی مطمئن نہ تھی لیکن اس کے بعد وہ کیا کہہ سکتی تھی۔"

وہ باہر جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا داماد اس کی طرف آیا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آج

ساتھ لے جاؤں۔ وہ آرام سے رہے گی۔"

"کیا" وہ ناراض ہو گیا "وہ یہاں آرام نہیں ہے۔ تم بڑا آرام دو گے۔ سارا دن کام پر رہو گے۔ خدمت کون کریگا تم کیا تیمارداری کر سکتے ہو۔ وہ یہیں رہے گی۔ اس کا علاج ہو رہا ہے کسی قسم کی فکر یا خطرے کی بات نہیں۔ ایک دو روز میں آرام ہو جائے گا۔ وہاں بڑا آرام دو گے تم!"

وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔ اندر بیوی کے پاس ۔

بوڑھا آدمی کافی دیر تک بڑبڑاتا رہا اسے تسلی ہو گئی ۔ اس کے داماد کا فکر جائز تھا۔ وہ اس کا خاوند تھا۔ ان دونوں کے پیار کے متعلق وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ایسے موقع پر اس کی پریشانی جائز ہی تھی۔ لیکن وہ بیٹی کو ایسے حالات میں کیسے جانے دیتا۔ وہ اسے بیمار کیونکر رخصت کرتا۔ وہ اس کے علاج کے بارے میں بھی مطمئن تھا۔ اسے کوئی تشویش کی بات نظر نہیں آتی تھی۔ بیماریاں ہوتی تھیں اور علاج معالجے تھے۔ گو اس چھوٹے شہر میں بہترین علاج نہیں تھا تاہم وہ علاج کر رہا تھا۔ اپنی حیثیت کے مطابق۔ ضرورت کے موافق۔ وہ وہیں شفا پائے گی۔ اسے یقین تھا۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی۔ شام کی چائے کا وقت تھا۔ اس کے بعد وہ ہوا خوری کے لئے سیر کرنے کے لئے جانا چاہتا تھا۔ اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے اس نے داماد کی چائے اندر کمرے میں ہی بھجوا دی ۔

نوکر چائے کمرے میں لے گیا۔ "مجھے نہیں چاہیئے چائے۔" اس نے کہا "میں نہیں پیوں گا چائے۔" اس نے چائے واپس کر دی۔ چھڑی کے ساتھ قدموں کی آواز مکان سے دور ہوتی گئی۔ پھر نوکر نے باہر کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کا طیش ابھر آیا۔ وہ غصے سے کانپنے لگا۔ "یہ علاج ہو رہا ہے۔ وہ اپنی سیر نہیں چھوڑ سکتے۔ علاج یوں تو نہیں ہوتا۔ اندر تمہاری یہ حالت ہے اور انہیں سیر سوجھی ہے ۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں" اس کی بیوی نے کہا۔ "ہم انہیں ناراض نہیں کر سکتے ۔"

"ان کی ناراضگی کا سوال کیا ہے۔ تمہاری زندگی .... ان کی ناراضگی کی خاطر تم اگر صحت گنوا بیٹھیں؟" وہ پاؤں پٹخنے لگا۔ "وہ کیا چاہتے ہیں۔ نہ علاج ہو سکے نہ تیمارداری نہ خود کرتے ہیں نہ مجھے کرنے دیتے ہیں۔" وہ غصے سے کانپنے لگا۔ وہ آخر چاہتے کیا ہیں؟ میں تمہیں یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں اب تمہیں لے کر ہی جاؤں گا ویسے نہ بھی لے جاتا لیکن اب سلوک دیکھ کر تمہیں یہاں میں نہیں رہنے دوں گا۔" اس نے بیوی کے چہرے کو بغور دیکھا لیکن کوئی فیصلہ نہ پڑھ سکا۔ وہ بے بس ہو گیا۔ "دیکھو یہ میری عزت کا سوال ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی چاہیئے۔ میں تمہیں اب لے کر جاؤں گا ورنہ پھر میں ہمیشہ کے لئے اکیلا ہی جاؤں گا ۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"یہ میرا فیصلہ ہے" جوش میں بھرا وہ باہر چلا گیا۔

اس کے کان سن سے ہو گئے۔ اس کا حلق سوکھ سا گیا۔ ایسے الفاظ سننے کی اُمید اسے نہ تھی۔ وہ

وہ اپنے بوڑھے باپ کو چھوڑ کر جانے کے لئے بھی تیار نہ تھی۔ بیشک اس کے مستقبل کا سوال تھا۔ اس کی صحت کا سوال تھا۔ اس کی زندگی کا سوال تھا لیکن وہ اس لئے ان حالات کی پیچیدگی سے گھبرا گئی۔ اس کا خاوند بھی غصے میں ناجائز باتیں کر رہا تھا اور اس کا باپ بھی یونہی ایک ضد کئے بیٹھا تھا اور وہ اس چکی میں پسی جا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی ضد کا نشانہ بن گئی تھی اور وہ ان دونوں کو خوش رکھنے کا طریقہ نہیں جانتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اپنے باپ سے کہے گی۔ وہ خود ضرور اجازت دے گا کیونکہ بات اب پیچیدہ، سنجیدہ ہو گئی تھی۔

باہر دروازے پر دستک ہوئی وہ واپس آ گیا تھا۔ کمرے میں اس کا خاوند داخل ہوا۔ "تم نے کیا سوچا ہے۔" اس نے سختی سے کہا۔ "میں کل صبح واپس جا رہا ہوں اگر تم میرے ساتھ چلو تو تیاری کر لوں۔ ورنہ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

وہ خاموش سنتی رہی کیونکہ وہ جوش میں تھا۔

شام کی سرخی پر سیاہی کا سایہ پھیلتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں تارے چمک اٹھیں گے۔ ہر طرف مصنوعی روشنیاں ہوں گی کتنی دیر بعد چاند نکلیگا اور صبح ہو جائے گی —— جب شبنم گھاس پر سوکھنے لگے گی تو گاڑی کا وقت ہو جائے گا۔ اس کا خاوند اس گاڑی سے واپس جا رہا تھا۔ گھر کی ہر چیز اس نے خود آمدنی کو بمشکل بچا بچا کر اکٹھی کی تھی۔ جہاں اس نے خودی احساس کیا تھا جہاں اس نے اپنے مستقبل کے سارے پلان بنائے تھے —— وہ اس گاڑی سے اس گھر میں چلا جائے گا۔ وہ اس کے بغیر واپس جا سکتا تھا۔ وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا۔ وہ اس کے بغیر بھی اس گھر کی ہر چیز کو استعمال میں لا سکتا تھا۔ اور وہ خود —— اس کا بوڑھا باپ کب تک اسے رکھے گا۔ اور وہ اسے کیونکر سمجھائے کس طرح اس ضد کو ختم کرے۔ سیاہی کا پرتو پھیل رہا تھا۔ شام کی سرخی تقریباً ختم ہو چکی تھی اور تارے نظر آنے لگے تھے اور مصنوعی روشنیاں چمکنے لگی تھیں اور وقت کم ہو رہا تھا۔ وہ خاموش لیٹی سوچتی رہی۔

نوکر نے اس کے خاوند اور باپ کے لئے میز پر کھانا چن دیا تھا۔ اس کا باپ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اندر آیا۔ اس نے اس کے بازو کو پکڑ کر حرارت کا اندازہ کیا۔

"میں چلی جاؤں۔" اس نے منت سے کہا۔ "اگر اب میں نہیں جاؤں گی تو پھر ہمیشہ یہیں رہنا پڑے گا۔ پھر میں نہیں جا سکوں گی۔ یہی مجھے کہا گیا ہے!"

وہ دونوں خاموش رہے۔ "تمہاری اپنی مرضی ہے" اس نے سرگوشی کی۔ "میرے پاس کھانے کی کمی نہیں۔ اگر وہ تمہیں چھوڑنا چاہتا ہے تو میں پرواہ نہیں کرتا۔" پھر اس نے اسے گھور کر کہا۔ "میں یہ بےغیرتی برداشت نہیں کروں گا۔ تمہارا علاج یہیں ہوگا۔"

اس کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ وہ خاموش لیٹی اپنی نبض کو سنتی رہی۔ یکدم اس کا درد پھر بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ کراہنے لگی تھی۔ باہر وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ محض ان کے چمچوں کی آوازیں آ رہی تھیں،

وہ اندر نیم بیہوشی ہو گئی تھی اور انھیں معلوم نہ تھا

وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں ارادوں میں پختہ پلان میں مشغول تھے۔

اس کا داماد کھانے کے بعد کمرے میں چلا گیا۔ وہ اکیلا برآمدے میں بیٹھا رہا۔ اس کے داماد نے روشنی گل کر دی وہ سو گیا تھا، باہر بستر پر بیٹھا وہ سوچتا رہا۔ اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب اس نے اپنی بیٹی کے لئے اس داماد کو منتخب کیا تھا اب اس شخص نے بڑی دھمکی دی تھی۔ وہ اس کے لئے تیار نہ تھا لیکن اسے تیار ہونا پڑا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ وہ خوف سے لرز رہا تھا۔ اس نے حساب لگانا شروع کر دیا۔ اس کے پاس اتنی رقم تو تھی کہ وہ اور اس کی بیٹی گزر کر سکیں۔ لیکن وہ بوڑھا تھا اس کے بعد اس کی بیٹی کا کیا بنے گا؟ وہ کیونکر زندگی کاٹے گی پھر اسے بیٹی سے زیادہ محبت ہو گئی۔ اس کا داماد کتنا سخت دل تھا۔ وہ کتنا وحشی تھا۔ اس نے چاہا وہ اسے خود پیچھے سے سوال کرے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ لیکن یہ کتنی شرمناک بات تھی وہ اپنی بیٹی کی بیماری میں اسے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ باپ تھا۔ اس کے خاوند کی طرح نہ تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی خدمت کریگا۔ وہ اس کی صحت کی حفاظت کریگا۔ وہ اسے زندہ رکھے گا۔ وہ اسے اپنے پاس رکھے گا پھر اس کا گھر ہمیشہ کے لئے پر رونق رہے گا۔ پھر اس کے گھر کی وہ مالکہ ہو گی۔ وہ خود چھت پر بیکار اطمینان سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھا کرے گا۔ بے فکری سے سو سکے گا۔ وہ دونوں باپ بیٹی چین سے رہیں گے۔ اس کے خود غرض خاوند کے برعکس۔

پھر اسے نیند کا احساس ہوا۔ رات کافی بیت گئی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ نوکر بھی باورچی خانے میں کام ختم کر چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں بستر پر جا لیٹا۔ اس کے شل دماغ کو نیند کا سکون پانے کی امید تھی۔ وہ اس بے چینی کو دور کرنا چاہتا تھا پھر اس نے سوچا۔ وہ اپنی بیٹی کا مکمل اور باقاعدہ علاج کریگا۔ اسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ان تمام ہدایتوں پر عمل کرنا چاہیئے جو ڈاکٹر نے کی تھیں۔ اس کی بیٹی اس کے ہم خیال تھی اور وہ اسے کسی صحت افزا مقام پر بھیجنے کے پلان بناتا رہا۔ وہ مقوی غذائیں لانے کی ذہنی فہرست مرتب کرنے لگا۔ اسے اب سکون ملنے لگا تھا آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں نیند کا غلبہ محسوس کرنے لگیں۔ دور اس نے مرغ کی بانگ سنی۔

وہ رات بھر کراہتی رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا درد کم ہو گیا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی چیخیں اونچی نہ ہوں تاکہ وہ لوگ سوتے رہیں۔ ان کی نیند میں خلل نہ ہو سکے۔ اب وہ سارے جسم میں تکان محسوس کر رہی تھی۔ اس کا سارا بدن تھک کر چور ہو گیا تھا۔ اس کے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ اپنی حالت کا اندازہ کر رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا خاوند اس سے کیوں ناراض تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا باپ اس کی حالت پر متفکر سے کیوں خائف تھا وہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لئے وہ دونوں عزیز تھے۔ وہ دونوں کو خوش رکھنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی لیکن وہ دونوں اسے نظر انداز کر کے ناراض ہو کر سو رہے تھے اور وہ کراہ رہی تھی ——

صبح کے وقت اس کا خاوند جانے کے لئے تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ وہ اسے ملنے نہیں آیا۔ وہ گاڑی کے وقت کی انتظار میں تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ اس کی بیوی اپنا ارادہ بنائے اور اسے بتا دے۔

جب وہ اٹھا تو سورج کافی نکل آیا تھا۔ اس کا داماد باہر برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اس کے بوڑھے

تجر

جسم میں دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے تھکاوٹ ہو گئی تھی۔ اسے اپنی بیٹی پر بھی گلہ تھا۔ اس نے صاف
خاوند کے روبرو انکار کیوں نہ کر دیا تھا۔ اس نے صاف صاف وہیں رہنے کی حامی کیوں نہ بھری تھی
وہ اس بے عزتی کو کیونکر برداشت کر رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر ناشتہ کئے بغیر گھر سے چلا گیا کیونکہ اسے ڈاکٹر سے
مشورے کرنے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو ملنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اس طرح اپنی ناراضگی ظاہر کرنا چاہتا تھا
وہ بار بار اس کے جانے کا قصہ سننے کو تیار نہ تھا۔ وہ وہیں رہے گی۔

وہ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے سڑک پر رینگتا گیا۔ اس نے گھر سے چلتے وقت اپنے داماد سے رخصت
بھی نہ لی تھی۔ اس نے اسے الوداع بھی نہ کہی تھی۔ اب معاملہ بالکل بدل گیا تھا۔ اب اس کا داماد ایسے تکلف پر
رسم و رواج کے لائق نہ رہا تھا۔ اب نئے ماحول کو پا کر وہ مطمئن سا ہو گیا۔

وہ ڈاکٹر کی دوکان پر پہنچا۔ اس نے ضروری ہدایتیں لیں۔ اس نے ضروری خوراکوں، دواؤں، غذاؤں
کا بندوبست کیا۔ ان سب لفافوں کو بغل میں دبائے وہ واپس لوٹ آیا۔ وہ اپنی بیٹی کو جلد تندرست
ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ بہت جلد شفا پا کر دوبارہ گھر کی دیکھ بھال کر رہی تھی،
اگر اس وقت اس کا داماد واپس آ کر اپنی گستاخی اور جلد بازی کی معافی بھی مانگے تو وہ یہی چاہتا تھا کہ
اس سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا جائے لیکن یہاں اس کی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا۔ اس نے فیصلہ کیا موجودہ
تشنج ناراضگی خفگی کچھ عرصہ بعد نہ رہے گی۔ وہ سب مل بیٹھیں گے۔ وہ تو محض اپنا فرض پورا کر رہا تھا۔ وہ
تو محض بیٹی کی صحت کا خیال کر رہا تھا۔ وہ تو محض اس کی عزت چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسکی بیٹی
خاوند کے یہاں باوقار اور باعزت رہے۔ وہ تو محض داماد کو سزا دے رہا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس کا نوکر لفافوں کو لے کر اندر جانے لگا۔ "صاحب چلے گئے ہیں"
کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔
"وہ بی بی کو بھی ساتھ لے گئے ہیں"

وہ چونک پڑا۔ "ہاں۔ بی بی خود چلی گئی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود پہنچ کر سارا حال لکھیں گی"
وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ نہایت ناکارہ بوڑھا اپاہج ہو گیا ہو۔ سامنے اس
کی بیٹی کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ اسی نے اس کا بجائے خاوند کا چناؤ کیا تھا اس کا گلا بھر آیا۔ اس نے لرزتے ہوئے
جیب میں سے دوائی شیشیاں نکالی۔ نزدیک سے ریل کی سیٹی سنا دی۔ گاڑی جا رہی تھی۔ اس نے
ان سب دوا کی شیشوں کو آہستہ آہستہ میز پر رکھ دیا۔ اس کے آنسو نہ رک سکے اس کے پاؤں کے قریب جا کر
وہ سسکی کو دبا نہ سکا۔

جائزے

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

تعبیر تشریح تنقید

مصنف مسیح الزماں پبلشر ——— "خیاباں" ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد ۳
قیمت ——— دو روپے

مسیح الزماں صاحب اس سے قبل اردو تنقید کی تاریخ لکھ چکے ہیں جو کافی اہم کتاب ہے۔ "تعبیر تشریح تنقید" ان کے ایسے ادبی نوٹس کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو لکھوائے، یہ مختصر سے مضامین ہیں جن میں تنقید کے کسی خاص فارم یا کسی قسم کے تنقیدی اصولوں کو نہیں برتا گیا ہے بلکہ یہ ایک لکچرار کے انفرادی تاثرات ہیں جو اپنے طالب علموں پر وہ واضح کرنا چاہتے ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں ادب کے بہت سے موضوعات اور اہم کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مسیح الزماں صاحب کی وسعت نظر اور نظریۂ ادب قابل قدر ہے۔ "امراؤ جان ادا" "جدید شعر کا پس منظر" اور "اردو کی ابتدا کے مختلف نظریئے" بہت اچھے مضامین ہیں۔

ادب کے طالب علموں کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیئے۔ کتاب کی خوبصورتی اور ٹائیٹل پیج کی سادگی اس کی وقعت کو بڑھا رہی ہے۔

○ ○ ○

میری نظمیں

بلراج کومل۔ ناشر مکتبہ فنکار دہلی۔ صفحات ۱۴۰ (بڑے سائز پر)
قیمت دو روپے آٹھ آنے

جدید ترین شاعروں میں بلراج کومل نمایاں ہیں۔ دھیما دھیما لہجہ، مستقبل پر پکا یقین اور ماحول کی اداسی کا گہرا امتزاج، ان کی نظموں کی خصوصیت ہے۔ منجھے ہوئے شعور کے ساتھ ہیئت کی نزاکتوں کو بھی اچھی طرح سنوارتے ہیں۔

اس مجموعہ کی نظموں میں شاعر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے غموں کے سائے، زندگی کی سرد مہری، انسان کی جد وجہد، اور جد وجہد کی کامیابی پر یقین نمایاں ہے۔ نظموں کے تعارف میں شاعر نے ادب کے متعلق اپنے

نادیدہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ اس روشنی میں "جنگ" "ایک عمر گزاری ہے" اور "تخریب کے نام" وغیرہ نظموں میں شاعر کے رجحانات واضح نظر آتے ہیں۔ بلراج کومل بڑی دھیمی لے اور نرم لہجہ میں اپنی بات کہتے ہیں۔ ان کی آواز میں اداسی اور ماحول کی تلخی کا شدید احساس ہے لیکن اس کے باوجود وہ قنوطیت کے اندھیرے میں نہیں ڈوبتے۔

"ماجد صاحب" "رو میں ہے رخش عمر" "اکیلی" اور "قطرہ قطرہ" ان کے مخصوص اسٹائیل کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کی انفرادیت اور خیالات کی وضاحت عروج پر ہے۔ نئے فنکاروں کی آواز میں افسردگی اور تلخی کا احساس، فنکاروں کی غیر مطمئن زندگی کا ترجمان ہے اور ساتھ ہی اس نفرت کو تیز کرتا ہے جہاں نوجوانوں کی آوازوں سے مسرت اور شوخی غائب ہوگئی ہے۔ ان نظموں میں ہیئت پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے لیکن اکثر جگہ یہ تجربہ ناکام بھی ہوگیا ہے اور نظم شاعر کی پریشان خیالی کا عکس بن گئی ہے۔ جیسے شاعر کسی مستقل خیال کو لئے بغیر ہی نظم کو مصرعوں میں پرونے بیٹھ گیا ہے۔ "میری نظمیں" میں پانچ غزلیں بھی شامل ہیں لیکن یہ غزلیں نظموں کی طرح بلند نہیں۔ اس سے شاعر کے نظم گو ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

اچھا شعری ادب پڑھنے والوں کے لئے یہ مجموعۂ کلام بڑی کشش رکھتا ہے۔ کتاب ظاہری سنگار سے بھی آراستہ ہے۔ گرد پوش خوبصورت اور کتابت وغیرہ اعلیٰ درجہ کی ہے۔ مکتبہ فنکار نے اسے بڑی نفاست سے شائع کیا ہے۔

○○○

"جینے کے لئے" } مصنف۔ ستیہ پال آنند۔ پبلشر۔ سردار جیون سنگھ۔ لاہور بک شاپ۔ کلاک ٹاور لدھیانہ۔ قیمت۔ دو روپے آٹھ آنے۔

"جینے کے لئے" ستیہ پال آنند کی دس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ستیہ پال آنند اردو میں نووارد ہیں لیکن انداز بیان کے لحاظ سے اچھے افسانہ نگاروں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان کہانیوں کے پلاٹ اور کردار زندگی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ "کون ہوں" "من بہادر" اور "جینے کے لئے" اس مجموعے کی بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں امن کی خواہش، انسان کی برائی جیسے موضوع اپنائے گئے ہیں۔ "انسان اور حیوان" اس مجموعے میں شامل نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ ابھی انسان کی زندگی کے بے شمار مسائل فن کاروں کے منتظر ہیں۔ کتوں کے عشق کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ان ادیبوں کا کام ہے جو شہوانی اور جاسوسی کہانیاں لکھا کرتے ہیں۔ لیکن ستیہ پال آنند نے اپنے سامنے انسان کی جدوجہد کا عظیم مقصد رکھا ہے اور اس راہ پر انہیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ پلاٹ میں جدت اور ندرت کی کمی بھی کھٹکتی ہے۔ اس جانب آئندہ توجہ دینا چاہیئے۔ کتاب کا گرد پوش خوبصورت ہے اور کتابت معمولی ہے۔ امید ہے "جینے کے لئے" ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

رائیں

آپ کی محنت اور کاوش اور آپ کے خلوص و انہماک کی داد نہ دینا بیدردی نہیں تو بے حسی ضرور ہے۔ آپ نے کتنی انتھک کوششوں کے بعد بڑے بڑے اردو شاعروں اور انشا پردازوں سے ان کے رشحاتِ قلم حاصل کئے ہیں، اس کی گواہی مجھ سے بہتر کون دے سکتا ہے؟ آپ نے کتنے خطوط مجھے لکھے اور میں ایک غزل کے سوا آپ کو کچھ بھیج نہ سکا۔ شاعری چھوڑے ہوئے مجھے بہت طویل عرصہ ہو چکا۔ میں پہلے بھی اور اب بھی کبھی کبھی شعر اپنے دل و دماغ کی تھکن دور کرنے کے لئے کہہ لیتا ہوں، اور اس سے مراد صرف اپنا جی بہلانے کے لئے زندگی کے چند لمحے ضائع کر دینے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے یہ اس لئے کہا کہ اس وقت کوئی مضمون لکھنا بہت پریشان کن اسباب کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔ آپ کا رسالہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے فروغ کے لئے کوشش کرنا ہر مخلص اور صاحب ہمت ادیب کا فرض ہے۔ مگر ان دنوں میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتا تھا کہ کسی رسالے کی فرمائش کو اس کے وقت سے پورا کر سکوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جلد یا دیر "گجر" کے لئے کوئی نہ کوئی مضمون ضرور لکھوں گا۔ وقت کی پابندی مجھ پر عاید نہ کیجئے۔ آپ خود دیکھتے ہونگے کہ دو تین سال سے میں بہت کم لکھتا ہوں اور نہ جانے کتنے مضامین ادھورے پڑے ہیں، اور اس کا سبب خلاف قیاس میری گرتی ہوئی صحت ہے۔

"گجر" میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں ہے کہ اس میں کتابت اور طباعت کی اتنی غلطیاں ہیں کہ ایسے وقیع رسالے میں وہ ایک نمایاں فروگذاشت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کا سب سے ظریفانہ یا ستم ظریفانہ پہلو یہ ہے کہ میں کاتب اور پروف پڑھنے والے کا بُری طرح شکار رہا ہوں۔ میں اپنے ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں، جیسا کہ میں نے بہت پہلے لکھا تھا کہ کاتب اور بہرے کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن پروف پڑھنے والے کی اس قسم کی کوتاہیاں معاف نہیں کی جا سکتیں۔

میرے دوسرے شعر کا مصرعہ یوں ہونا چاہیئے تھا۔

"سب شورشِ وحشت کی لذت سے ہیں بیگانہ"

گجر

پچھلے شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے۔

"اہرمن و یزداں کیا یہ کفـــر یہ ایماں کیا"

اور گیارھویں شعر کا دوسرا مصرعہ یوں ہے۔

"لغزش کے قرینے ہیں اے لغزشِ مستانہ"

باقی ہر لحاظ سے پرچہ قابلِ ستائش ہے۔

مجنوں گورکھپوری ــــــــــ گورکھپور

○ ○ ○

آپ کی بھیجی ہوئی پتریکا "گجر" ملی۔ یہ اردو پتریکا ہونہار معلوم ہوتی ہے۔

فراق گورکھپوری ــــــــــ الہ آباد

○ ○ ○

"گجر" ملا۔ بہت پسند آیا۔ صورت شکل کے علاوہ نظم کا حصہ بہت اچھا ہے، صرف نثر کی کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن اس کا بھی احساس ہے کہ نثر کے مضامین اچھے دستیاب نہیں ہوتے۔ دس سال تک "کارواں" نکال کر میں اس دقت کا سامنا کر چکا ہوں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین ــــــــــ الہ آباد

○ ○ ○

"گجر" ملا۔ حیدر آباد میں جتنے اچھے اچھے نوجوان لکھنے والے ہیں، اگر وہ آپ کی مدد کریں تو ایک "گجر" کیا، دو رسالے نکل سکتے ہیں۔

احتشام حسین ــــــــــ لکھنؤ

○ ○ ○

"گجر" کا ایک شمارہ ملا تھا جو بہت خوب تھا۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہ لکھ سکی کیونکہ بڑی مصروفیت رہی۔ مسلسل کام کے بعد آج کچھ فرصت ملی تو چند خطوں کے جواب دے رہی ہوں۔ رسالے کا کیا حال ہے؟

عصمت چغتائی ــــــــــ بمبئی

○ ○ ○

ہم لوگ سب یہ جی سے چاہتے ہیں کہ آپ کا رسالہ جاری رہے اور معیاری شائع ہو۔ اور ہمیں امید قوی ہے کہ آپ کے ہاتھوں یہ ضرور ترقی کرے گا۔ ہم لوگوں سے جو بھی ممکن ہے۔ انشاء اللہ اس میں کمی نہ ہوگی

گجر

آپ کے پہلے نمبر کے متعلق آئندہ عرض کروں گا۔ کیونکہ جب سے وہ آیا ہے احباب میں گردش کر رہا ہے۔ میں ابھی ٹھیک سے دیکھنے بھی نہیں پایا۔ یہ بھی اس کے مقبول ہونے کی ایک دلیل ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ______ لکھنؤ

○○○

"گجر" بہت ہونہار ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں کہ میرے تعاون کے بغیر پرچہ نہیں چلے گا۔ میں کئی کاموں میں پھنسا ہوا ہوں، مضمون بھیجوں گا مگر کچھ عرصے بعد۔ جنوبی ہند کے ادبیات کو اردو داں طبقے سے روشناس کرائیے۔ جدید تامل، مرہٹی، کنڑی ادب میں کیا ہو رہا ہے؟ ہر اشاعت میں یہ سلسلہ چلتا رہے تو اچھا ہے۔

آلِ احمد سرور ______ لکھنؤ

○○○

آپ نے "گجر" جس سلیقہ اور اہتمام سے نکالا ہے، اس کو دیکھ کر ایمان تازہ ہو گیا اور اردو کی ترقی اور فروغ کے متعلق توقعات بڑھ گئیں۔ اس میں جو نظمیں، مقالے اور افسانے ہیں وہ سب دلچسپ ہیں اور زندگی کے وسیع تر حقائق کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔

ایک بات بڑے ادب سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اس رسالے میں مستقلاً اردو پڑھنے والوں کو ہندی، تامل، تلگو، کنڑی اور بنگالی وغیرہ ادب کے کارناموں سے روشناس کراتے رہیں تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہو اور وہ دیوارِ چین بھی ٹوٹے جس نے ہندوستانی ادب کی تعمیر و تشکیل کے کام کو ابھی آگے نہیں بڑھنے دیا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ______ دہلی

○○○

اس بحرانی دور میں جبکہ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کم سے کم تر ہو رہی ہے ___ اور بالخصوص اردو کے مطبوعات کا حال اور بھی بُرا ہے ___ ان ساتھیوں کی ہمت قابلِ داد ہے جنہوں نے "گجر" جیسا معیاری ادبی پرچہ نکالنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں جو چیزیں درج ہیں ___ مقالے، نظمیں، غزلیں اور افسانے ___ ان میں سے بیشتر اچھے معیار کی ہیں۔ مقالات کا حصہ بالخصوص ایسے عنوانات پر مشتمل ہے جن سے بحث کرنا ہمارے لئے بہت مفید ہے۔ سجاد ظہیر صاحب کے خط میں بعض اہم ادبی سوال اٹھائے گئے ہیں لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اُن کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے خطوط کو شائع کرتے وقت "ایڈیٹنگ" کی ضرورت ہے۔ خط کے صرف ان ہی حصوں کو شائع کرنا

چاہیئے جو ادبی نقطۂ نظر سے اہم ہوں، باقی حصوں کو نکال دینا چاہیئے۔

عالم خوندمیری صاحب کا مضمون "اردو ادب کے دس سال" گو کہ ایک مختصر اور سرسری جا
ہے، پھر بھی اس میں بہت سی مفید معلومات موجود ہیں۔ لیکن اس مضمون کو پڑھ کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ فیض
اور فراق گورکھپوری کی ادبی کاوشوں پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنی چاہیئے تھی کیونکہ وہ اس دور
ان بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں جن کی اہمیت ہر مکتبِ خیال کے ادیبوں کے نزدیک مسلّم ہے۔

زینت ساجدہ صاحبہ کا مضمون اس لحاظ سے ایک پسندیدہ کوشش ہے کہ اردو میں دوسر
زبانوں کے ادیبوں کے بارے میں اب تک بہت کم لکھا گیا ہے اور یہ بات اور بھی افسوسناک ہے کہ ار
میں غیر ملکی ادیبوں سے متعلق تو تھوڑا بہت مواد مل جاتا ہے لیکن ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بار
میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناقابلِ ذکر ہے۔ اگر مضمون نگار میرا بائی کو اس سیاسی اور سماجی پس منظر
پیش کرتیں جسے سامنتی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ان کے تجزیے میں اور زیادہ جان پڑ جاتی۔

نجمہ سمیع صاحبہ نے کرشن چندر پر جو مضمون لکھا ہے وہ بہت تشنہ اور یکطرفہ ہے۔

کہانیوں اور افسانوں میں رضیہ صاحبہ کی کہانی اچھی ہے لیکن اس میں ہندی کے افسانہ نگار
کردار کچھ غیر ضروری سا ہے اگر یہ نہ ہوتا، اس صورت میں بھی کہانی مکمل ہو جاتی۔

مجموعی طور پر رسالے کی اٹھان امید افزا ہے اگر اسے جاری رکھا جا سکا اور اڈیٹر اور لکھنے وا
"تنقیدِ ذات" سے کام لیتے رہے تو یہ رسالہ اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دے گا۔

ڈاکٹر سلامت اللہ ——————— دہلی

جہاں ہمیں اچھی کتابوں کی ضرورت ہے وہاں اچھے رسائل کے بنا بھی ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ اس او
کے زمانے میں "گجر" جیسے دوماہی نے بہت بڑی کمی کو پورا کرنے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ "گجر" کی کامیابی کی
دلیل یہ بھی ہے کہ اس کا پہلا ہی شمارہ ادبی و فنی معیار کے اعتبار سے بہت بڑھیا ہے۔ اس کا ہر قدم ترقی کی
ہوگا، اس کا مجھے یقین ہے۔

(دیوندر) ستیارتھی ——————— دہلی

○ ○ ○

"گجر" حسنِ ترتیب کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ لوگوں نے اپنی کوششیں جار
رکھیں تو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے "گجر" اپنے لئے ایک مقام حاصل کرے گا۔ میں ہر ممکن خدمت
لئے حاضر ہوں۔

پرویز شاہدی ——————— کلکتہ

...... اور یہ رسمی ہمت افزائی کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امر واقعہ ہے کہ آپ کا رسالہ خوب ہے اور اردو ادب کے لئے نیک فال۔ بس ڈر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بند نہ ہو جائے۔ بہرحال ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ابو الفضل صدیقی ——— کراچی

○○○

رسالہ بحیثیتِ مجموعی مجھکو بے حد پسند آیا۔

شوکت صدیقی ——— کراچی

○○○

میں نے "گجر" کے کافی مضامینِ نظم و نثر پڑھ لئے ہیں۔ نظمیں کافی ہیں اور ان میں خلافِ معمول اچھی تخلیقات نظر آئیں۔ وحید اختر اور شاذ تمکنت کی طویل نظمیں اچھی ہیں، لیکن اگر ان کے الفاظ اور اشعار میں ذرا احتیاط سے کام لیا جاتا تو یہ چیزیں اور زیادہ موثر ہوتیں۔

مضامین میں عالم خونریزی کا مضمون کارآمد ہے۔ ان دنوں اتنی محنت اور خلوص، انسانی نقطۂ نظر اور سنجیدگی سے بہت کم مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ان کو اور لکھنے کے لئے اکسایئے اور کہیئے کہ وہ اپنا یہی رجحان چاہئیں اور عملی تنقید پر زیادہ زور دیں۔ نظریاتی بحثیں اور مسلمہ اصولوں پر تو خوب خوب گہرافشانیاں ہوتی ہیں لیکن اپنی دوکان میں جو مال ہے اس کی پرکھ نہیں ہوتی، انہی گراں قدر اصولوں پہ ——— یہ ذرا مشکل کام ہے ——— اور مشکل کام کون کرے۔ جب تنقید کی سند چند مانی ہوئی اور بار بار دہرائی ہوئی باتیں کہنے سے ہی مل جاتی ہے۔

افسانہ رضیہ سجاد ظہیر کا بہت اچھا ہے۔ سہیل کا افسانہ اٹھتا ہے بڑی دلکشی کے ساتھ مگر آگے چل کر گیند کی ہوا نکل جاتی ہے۔ انجام پھسپھسا ہے۔

انور عظیم ——— دہلی

○○○

تم لوگ ہو خوب۔ جب بھی کوئی کام کرتے ہو تو ٹھکانے کا کرتے ہو۔ پرچہ خوب نکالا ہے۔

غلام ربانی تاباں ——— دہلی

○○○

آپ نے مضامین کی فراہمی میں یقیناً بڑی سعی و کاوش سے کام لیا ہے۔ تب ہی تو یہ شہ پارے آپ یکجا جمع کر پائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے تو اس کی ترتیب و تنظیم دیکھ کر بھی بہت خوشی ہوئی۔ خدا کرے آپ تا دیر زندہ رہیں اور اردو ادب کی بیش از بیش خدمت کرتے رہیں۔

سواتنی مارہ روی ——— مایہو

"گجر" کا پہلا شمارہ ملا۔ مجھے بے حد پسند آیا۔ آپ نے بڑی محنت اور کاوش سے یہ نمبر نکالا ہے۔
پرچے کو زندہ رکھنے کے لئے، مضامین کے علاوہ، اس کی اقتصادی حالت کو مضبوط کرنا ضروری ہے اور جب تک مالی حالت درست نہ ہوگی، "گجر" کا آگے بڑھنا ذرا مشکل ہو جائیگا۔ مشکلات کے باوجود آپ کی پہلی کوشش قابلِ تحسین ہے۔

جتیندر ناتھ ——— بمبئی

○ ○ ○

"گجر" کا پہلا نمبر مجھے ملا۔ اچھا خاصہ ہے۔ اگرچہ اس کو بہتر بنانے کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ جو معیار خود آپ کے سامنے ہے، اس تک پہنچنے میں ابھی زیادہ کوشش درکار ہوگی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان ——— حیدرآباد۔

○ ○ ○

"گجر" سرورق، ترتیب اور گٹ اپ کے لحاظ سے مجھ کو بہت پسند آیا۔ ہندوستان میں ایسے رسالے کے شائع ہونے کی بہت دنوں سے تمنا تھی خوشی کی بات ہے کہ آپ اور آپ کے جواں ہمت ساتھیوں نے اس راستے پر قدم رکھ دیا۔ تنقیدی مضامین کا حصہ تشنہ ہے۔

پروفیسر مسیح الزماں ——— پٹنہ

○ ○ ○

"گجر" دیکھا اور بار بار دیکھا۔ خامیاں ڈھونڈھنے کی ایمانداری سے کوشش کی لیکن خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر اس طفلِ شیرخوار کی عمر کے کچھ دَور اور گزریں، تب ٹھیک اندازہ ہو سکے۔ لیکن پوت کے پاؤں پالنے ہیں۔ موجودہ شمارے کے پیشِ نظر یہ کہوں گا کہ تمام مضامین اچھے ہیں اور پاکیزہ مذاق کے حامل ہیں۔ مقالوں اور تذکروں کا حصہ ذرا خالی خالی سا پایا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ مختلف کلچروں سے متعلق مضامین دلچسپی سے خالی نہیں ہونگے۔ غیر تہذیب اور تعصب سے بھری ہوئی فلموں پر تنقید ہو بلکہ کڑی تنقید ہو۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ——— بمبئی

○ ○ ○

آپ نے بڑی ہمت کی کہ ان حالات میں اتنا اچھا پرچہ مرتب ڈالا۔ خدا کرے پرچہ جاری رہ سکے اور حیدرآباد کی اردو پرستی قائم رہے۔

ہاجرہ مسرور ——— لاہور

○ ○ ○

میری یادداشت یہ کہتی ہے کہ حیدرآباد سے اتنا اچھا رسالہ ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں بہت سختی کی ضرورت ہے۔ اگر خود شاعر نہ ہوتا تو بہت زوردار لفظوں میں یہ کہتا کہ نظموں کا حصہ بہت [illegible] "میرا بائی" پر مضمون بہت اچھا ہے۔

سلام مچھلی شہری ——— دہلی

خوش ذائقہ کھانے
لذیذ مشروبات
آرام دہ انتظام
پر رونق مقام
اورینٹ ہوٹل
عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ فون نمبر ۵۲۲۲

اعلیٰ مشینوں سے اعلےٰ
معیار کی عینکیں تیار کرنے والے
آپ کے شہر کے واحد مینوفیکچررس
جن کی خدمات کے لئے آپ کو ایک
پائی بھی زیادہ صرف کرنی نہیں پڑتی
عینک محل
ارجنٹ آرڈر کی
تکمیل ۲۴ گھنٹے میں
OPTICAL PALACE
چوراہا عابد روڈ —— حیدرآباد دکن

سات نمبر بیڑی

پیا کیجئے

جو اپنی نفاست اور عمدہ ذائقہ کیلئے

ہر جگہ مشہور ہے
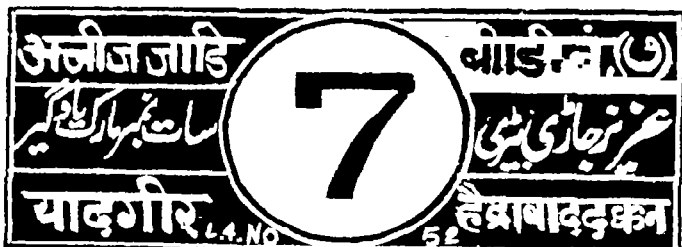
ملنے کا پتہ:-

سات نمبر بیڑی فیکٹری ——— یادگیر (سی، آر)

پروپرائٹر ا۔ یم۔ اے عزیز

گجر

Title & Photos Printed at HINDI PRESS, Nampally Hyd Dn.